# کتاب نما

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

# بغیر عنوان کے

**احمد جمال پاشا (لکھنؤ)**

نگار کے لیے پانچ خریداروں کے چندے جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔

**ذکیہ جیلانی (علیگڑھ)**

کچھ پتے لکھ رہی ہوں ان کو میرے حوالے سے ایک سال کے چندے میں نگار وی پی سے بھیج دیں۔ خود میرا چندہ یقینی ہے۔

**شفقت فاطمہ (سیتاپور)**

دو سالانہ خریداروں کے پتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کو وی پی کر دیجیے۔ میں نے پہلے گفتگو میں طے کر لیا ہے۔ اطمینان رکھیں۔

**عطا محمد شعلہ (بنارس)**

اپنا چندہ مبلغ دس روپے حاضر ہے۔ دو خریداروں کے پتے علیحدہ ایک خط کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان کے نام وی پی فرما دیں جلد سے جلد۔ آئندہ بھی کوشش جاری رکھوں گا۔

(منی آرڈر کوپن سے)

**ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)**

......میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا۔

**نقی احمد ارشاد (ڈمکا سنتھال)**

اس پہاڑی اور قبائلی علاقے میں بھی مقامی ایجنٹ اس نادر اردو رسالے کو پہنچا دیتا ہے۔ جہاں اردو لکھنے والے تو درکنار بولنے والے بھی بہت کم ہیں۔

آئندہ سے میں نگار کا مستقل خریدار بن جاؤں گا۔

**رزاق فاروقی (حیدرآباد دکن)**

حسب وعدہ آپ کے نگار کو میں خریدار دے رہا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو کالج کا چندہ بھی بھیج جائے گا۔ جن خریداروں کے پتے دیئے ہیں ان سے بھی توسیع اشاعت کے لیے کہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بھی نگار کو نئے خریدار دلائیں گے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو بہت خوب ہو

# چھیڑ غالب سے چلی جائے

مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی زندگی کی رنگارنگی اور بوقلمونی بڑا سہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں۔ ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمویا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

## چند لکھنے والے:

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حمید احمد خاں، پروفیسر آل احمد سرور، سید وقار عظیم، شوکت تھانوی، ڈاکٹر محمد اشرف، ہری چند اختر، حمیدہ سلطان، سراج احمد علوی، کنھیا لال کپور، فیاض عالم، حاجی لق لق۔ اور دوسرے

قیمت ـــــ ۵ روپے

**نگار بک ایجنسی رامپور**

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان:
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیج دیں رسالہ جاری کر دیا جائیگا
نمائندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین مئی ۱۹۶۳ء | شمارہ ۵



# ملاحظات

خدا مغفرت کرے، شوکت تھانوی چل بسے۔ خبر بڑی اچانک سی تھی۔ وہ دن قاضی جی کی حیثیت سے ان کی حاضری کا تھا کہ ریڈیو نے قاضی عبد الغفور المتخلص بہ مدفون کے مدفون ہونے کی خبر سنائی۔ دل کو ایک دھچکا لگا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ جس کا کام ہنسنا ہنسانا تھا وہ رلا دے گا۔ کم لوگوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آواز اور حرکات و سکنات پر جس بے پناہ قدرت کے وہ مالک تھے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی فنکار تھے اور ظاہر ہے کہ فنکاری کا یہ درجہ کتنا ممتاز ہے۔

دو ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی بار طفیل صاحب کے یہاں دفتر "نقوش" میں تانگے سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا اور بغیر کسی دقت کے پہچان لیا۔ جیسے وہ خود بول رہے ہوں کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔ بڑے مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے۔ طفیل صاحب سے اپنی کتابوں کی ایک ایک جلد لی۔ شاید انگلستان کسی ادبی وفد کے ساتھ جا رہے تھے اور جلدی میں تھے مگر لطیفوں سے غافل نہ تھے۔ پھر ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے اور اپنی دو کتابیں دیں۔ بار خاطر اور قاعدہ بے قاعدہ آخری کتاب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میں خود ہی بے قاعدہ ہوں کہ آپ جیسے باقاعدہ نوجوان کو قاعدہ پڑھا رہا ہوں۔ وہ صرف لفظوں کے بازی گر نہیں تھے۔ لفظوں سے اپنا الگ ماحول تخلیق کرتے تھے۔ اپنے نمایاں کردار دں کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی اتنی پر لطف نمائندگی اب کسی سے کاہے کو ہوگی۔

ان کی بہت سی تحریریں اخباروں میں چھپ کر رہ جائیں گی۔ طفیل صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں کہ اخباروں کے اوراق سے نکال کر

ان سب کو ایک اچھے انتخاب کی شکل میں شایع کر دیں۔ اُن کے ورثہ کو بھی اس سے یک گونہ مگر بروقت تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔

اگر آج ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تو شوکت تھانوی جیسے کتنے ہی ہندوستانی پاکستانی مصنفوں کے حقوق محفوظ رہتے اور ان کے اہل و عیال پر آئی ہوئی مصیبت اتنی سخت نہ رہتی جتنی موجودہ صورت میں بن جاتی ہے۔ سنا تھا کہ انجمن مصنفین پاکستان سلسلہ جنبانی کر رہی ہے مگر شاید وہ بھی سپر انداز ہوگئی۔ اور یہ اہم ترین معاملہ جو کتنی ہی بدمعاملگیوں کا سدباب ہو سکتا تھا لیت و لعل میں پڑا ہوا ہے ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس حق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اس ملک کا تو وزیر اعظم بھی مصنف ہے۔ اس سے زیادہ اس "امت" کے حقوق کو کون جانے اور سمجھے گا۔ شوکت تھانوی کی موت نے مصنفوں کے جائز حقوق کی یاد دلائی ہے تو انھیں یہ حق ملنے بھی چاہئیں۔ کیا کتابوں اور رسالوں کی تجارت سے زیادہ بے ضرر تجارت ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس تجارت سے زیادہ مبارک کوئی اور تجارت بھی ہے جس سے عقل و علم کی دنیا میں روشنی اور عمل کی دنیا میں ہما ہمی آئے۔

---

کشمیر کے مذاکرات ختم ہوگئے بغیر کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے۔ یہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھتا تو دو قریبی ملکوں کے تعلقات شستہ اور شائستہ ہو جاتے۔ لاکھوں انسان ادھر اور ادھر دونوں طرف آنے جانے کی پابندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اعزا اقارب کہاں ہیں اور خود کہاں، کتنے دوست بچھڑے کتنے اپنے دیکھتے دیکھتے اس حد بندی نے پرائے سے کر لیے۔ ایسے قریب کے پڑوسی کب تک الگ تھلگ رہیں گے یا رہ سکیں گے۔

وصل و فراق کی یہ کیفیت اور امید و بیم کا یہ طلسم دیکھیے کب ٹوٹتا ہے۔ اور دو بھائی کب گلے ملتے ہیں، ایسے کہ فرط مسرت سے ان کی آنکھیں اشک بار، گلے رندھے ہوئے اور دل کی دھڑکنوں میں انبساط فراواں کے نغمے مچلتے ہوں۔ دو بھائی —— ہند و پاک۔

---

جنوری میں نگار کے خاص نمبروں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ سب سے پہلے ذاکر حسین نمبر کی تیاری کرنا ہے یوں تو ادارہ نگار فرداً فرداً بھی تعاون کی درخواست کرے گا مگر ضروری نہیں کہ سارے متعلقہ حضرات تک پہنچ ہو سکے۔ اس میں بہت سی دشواریاں ہوتی ہیں بعض اوقات صحیح پتے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے جو نگار دوست اس نمبر کی تیاری میں کوئی بھی مدد دے سکتے ہوں وہ اس سے گریز نہ فرمائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ براہ راست انھیں لکھا ہی جائے۔ اس انداز کے کاموں میں سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہیں رہنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ دہلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حیدرآباد میں ذاکر صاحب کے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کے حلقے آباد ہیں۔ یہ حضرات توجہ کریں اور ذاکر صاحب کی شخصیت ان کے تعلیمی کارناموں پر لکھیں۔ ذاکر صاحب کے خطبات و پیغامات اور خطوط وغیرہ کو رودادوں اور رسائل و اخبارات کے صفحوں سے جمع کریں۔ ذاتی طور پر ان میں سے جو کچھ بھی جس کسی کے پاس ہو وہ اسے ملک و قوم کی امانت جانتے ہوئے ادارۂ نگار تک پہنچا دے تو یہ نمبر ایک اہم دستاویز بن جائے گا اور اس طرح ادب و انشا کے شہ پاروں کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کے ایک اہم تجرباتی دور کی تاریخ بھی سمٹ آئے گی ——

---

جذبات نادر کے ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر برادرم رشید حسن خاں نے حسب عادت بڑی محنت سے تبصرہ کیا ہے۔ ترتیب کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے دراصل اتنا آسان ہے نہیں۔ اس کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو نولکشوری عہد کی کتابوں اور موجودہ دور کی مطبوعات میں کیا فرق ہوگا۔ یہ تقاضے ایسی صورت میں اور بھی سخت ہو جاتے ہیں جبکہ کتاب پہلے سے مطبوعہ شکل میں موجود ہو اور پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ اس نے ایڈیٹنگ کے ذریعے زیادہ مکمل شکل دینے کی کوشش کی ہے —— اردو میں ایڈیٹنگ کا معیار کیوں بلند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اس کے وجوہ بہت سے ہیں جن میں مرتب اور ناشر اور ان دونوں کے ساتھ اہل علم کا تساہل بھی کچھ شامل ہے۔ آئندہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

# اردو ڈراما — حال اور مستقبل

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اردو ڈراما عہد جدید کی پیداوار ہے اور اس کے لیے ہم پرتگیز کا جس قدر احسان مانیں کم ہے۔ مغربی اقوام میں پرتگیز ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معہ من حیثیت القوم سب سے پہلے لوگ ہیں جو نامعلوم راستوں کو عبور کرتے ہوئے ساحل ہند تک پہنچے اور صرف بارہ سال کی کوشش سے نہ صرف گوا پر قابض ہو گئے۔ بلکہ اس کے ذریعے ایک وسیع علاقے کے حاکم بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بہمنی حکومت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر کے عدالتی زبان بنتی جا رہی تھی۔ سلاطین دکن نہ صرف علم و ادب کے سرپرست ہی تھے بلکہ خود بھی سخن سنجی اور سخن فہمی کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔

یہ رومتہ الکبریٰ کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ اسپین کی عظمت ایک کیتھولک ملک کی حیثیت سے مسلمہ تھی اس لیے اسقف اعظم کے اشاروں پر چلنے والی حکومتیں فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ مبلغین کے دستے بھی روانہ کرتی تھیں جو "جاہل اور بت پرستوں" کو "خداوند یسوع مسیح" کا درس دیتی اور "آسمانی روشنی" سے ان کے دلوں کو منور کرتی تھیں۔

گوا کو مرکزی حیثیت ملتے ہی مبلغین تثلیث نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ چونکہ اردو عوامی زبان بن چکی تھی اس لیے پرتگیز نے اسی کو تبلیغ تثلیث کا ذریعہ بنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھر کر نہ صرف تقریروں کے ذریعے حضرت عیسیٰ کے پیغام کو پہنچایا بلکہ ان کی زندگی کے حالات بھی اسٹیج پر پیش کیے۔ یہیں سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک اردو کے ابتدائی دور پر تحقیق کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے اور یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ پرتگالیوں نے اپنے دور میں کس قدر مدارس اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قایم کیے۔ نصاب کس قسم کا تھا۔ درسی کتابیں کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں اور آیا مابعد زمانہ میں وہ شایع ہوئیں یا نہیں پرتگیز مدارس کے مدرسین ہندوستانی تھے یا سب غیر ملکی، اردو اور فارسی کے علاوہ دکن کی اور کونسی زبانیں ان مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگر ان سوالات کا جواب ہم کو مل جائے تو نہ صرف اردو ڈراموں کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اردو ادب کے محققین اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

پرتگالیوں کی خوش قسمتی سے مغلیہ حکومت کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اکبر نے فتوحات دکن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے مبلغین تثلیث کے ہاتھ ایک نیا میدان آیا اور انھوں نے دہلی اور آگرہ میں بھی تثلیث کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی اور مسلم اراکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے ان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر سے آگے بڑھ کر تبت تک جا پہنچے۔ پرتگیز مبلغین کو اس دار و دہش سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم کو البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ تبت میں بھی اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ تبلیغی سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ بعدہٗ انقلاب زمانہ نے پرتگالیوں کو بیک بینی و دوگوش ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ۔ پھر فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے لی۔

ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی لہٰذا ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے ۱۷۵۰ء پہنچتے ہیں جب کہ انگریزی کا پہلا اسٹیج ہندوستان میں قایم ہوتا ہے۔ اس کا نام "پلے تھیٹر" تھا اور پلے گرین ۱۷۵۳ء میں تعمیر ہوا تھا یہ اسٹیج ۱۷۵۶ء تک قایم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جدوجہد کے بعد ایک دوسرا انگریزی اسٹیج ۱۷۶۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا سرکاری نام اگرچہ "پلے تھیٹر" تھا لیکن وہ "گرانٹ روڈ تھیٹر" ، "رانی کا تھیٹر" اور "شنکر سیٹھ کا تھیٹر" بھی کہلاتا تھا۔ اس میں ۱۸۵۳ء تک صرف انگریزی ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ سال مذکور میں

بمبئی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے کمیٹی کی اجازت سے اس میں مرہٹی ڈرامے دکھلائے کیوں کہ مرہٹی شنکر سیٹھ کی مادری زبان تھی لیکن مرہٹے چونکہ اوسطاً غریب تھے اس لیے مسلسل نقصانات کے پیش نظر مرہٹی کے بجائے ہندوستانی یا اردو میں ڈرامے دکھلانے شروع کیے۔ چونکہ انگریز اردو زبان سے واقف تھے جو ان کو لطور زبان خاص ایسٹ انڈیا کالج لندن اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سکھلائی گئی تھی اس لئے انھوں نے اردو ڈراموں کو خوش آمدید کہا اور پہلا ڈراما "راجہ گوپی چند اور جلندھر" جو ۲۶ر نومبر کو دکھلایا گیا تھا دیکھنے کیلئے گورنر بہ اجلاس کونسل کمانڈر انچیف اور دوسرے سول اور ملٹری عہدیداران سرکاری تشریف لائے۔

یاد رہے کہ "راجہ گوپی چند اور جلندھر" ۱۸۵۳ء میں دکھلایا گیا۔ گورنر اور کمانڈر انچیف کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔ ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو لندن کے رائل تھیٹر ڈرروری لین کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور انگریز جسے "آورنٹل ڈرروری" کہتے تھے اور جس کا مکمل ریکارڈ اب بھی حکومت مہاراشٹر کے آرکیوز میں محفوظ ہے۔ پھر بھی بعض لوگ "رہس" کو "ڈرامہ" کے جامے میں پیش کرکے اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں کوئی اسٹیج ہی نہ تھا۔ نہ پرتگیز نے تعمیر کیا تھا۔ نہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اور نہ کبھی انگریزوں نے اس کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تھا اس لئے اگر نوٹنکی۔ رام لیلا اور رہس وغیرہ کو ناٹک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اسٹیج ہی موجود نہ ہو — واجد علی شاہ جلیل القدر حکمراں نے ماڈرن اسٹیج ہی نہ دیکھا ہو اور امانت جیسے مصنف کو خواب میں بھی کبھی نظر نہ آیا ہو تو واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کا رہس کس طرح ڈرامے کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

اردو ڈرامہ کا مقدمہ کچھ طویل ہو گیا۔ آئیے اب ہم اردو ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو ڈرامہ پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ سے شروع ہو کر نربدا شنکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والے تقریباً سب پارسی تھے الا سوکر بالوجی ٹھلو کیکر کے جو ایک مرہٹہ تھا اور نربدا شنکر کے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ پارسی ڈراما نویسوں میں افضلیت کا شرف خان صاحب نسروان جی مہروان جی آرام کو حاصل ہے جنہوں نے گل باصنوبر چہ کرد۔ ہیرا۔ چندراوتی۔ حاتم طائی۔ باغ بہار۔ لیلیٰ مجنوں۔ عالمگیر۔ گوپی چند۔ جوان بخت۔ گل بکاؤلی۔ نورجہاں بہرام اور شیریں نامی ڈرامے اور ایک درجن کے قریب اوپرا یعنی منظوم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد ایدل جی بھائی۔ بندہ خدا۔ ڈاکٹر پارکھ۔ رانڈ ھیلیا۔ فرامرز۔ کابراجی کھوری اور جہانگیر پٹیل کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے خسرو شیریں۔ پاکدامن گلنار۔ بولی گل دورنگی دنیا۔ رستم و سہراب۔ جمشید۔ شاہ زادہ شیاوکس۔ خداداد قمر الزماں ظالم نہ در۔ ستمگر۔ عالمگیر۔ پاکدات پردین وغیرہ لکھے۔ اس دور کے ڈرامے عموماً گجراتی زبان میں لکھے اور اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ آرام کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ اردو فارسی سے واقف تھے اور براہ راست اردو میں لکھا کرتے تھے۔

دوسرا دور احمد حسین خاں سے شروع ہو کر بابو ہریش چند ر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے بیشتر ڈرامہ نویسوں نے اپنے ڈراموں کی زبان کے لیے اردو کا استعمال کیا ہے جہاں سے واضح طور پر اردو کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لکھنے والوں میں افسوں مراد آبادی۔ امداد علی لکھنوی۔ بابو بالشیور پرشاد۔ بزرگ لاہوری۔ حسین خاں بلبل۔ دھنپت رائے بیکس۔ فقیر محمد تیغ۔ سید سجاد حسین جوہر بنارسی۔ میاں چراغ الدین چراغ۔ لالہ چندن لال۔ محمد الف خاں حباب فتح پوری۔ درگا پرشاد۔ دینا ناتھ فتح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے ڈراموں میں خوشرو حسینا۔ نازاں۔ رزم بزم۔ طلسم عشق۔ جہد جابر۔ ساحر سبھا۔ سحر سامری عشرت سبھا۔ طلسمات سلیمانی۔ اکسیر اعظم۔ دلبر دلشیر۔ انجام الفت۔ ہما ماخذ العصمت کاڑاکو شرارہ عشق۔ حسن کوزسین۔ مار آستین وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اسی دور کے دیگر ڈراما نویسوں میں رونق بنارسی۔ سجاد دہلوی۔ کدار ناتھ صورت۔ ونائک پرشاد۔ غلام حسین ظریف۔ سید میر عباس علی۔ حافظ محمد عبداللہ۔ عبدالوحید قیس۔ پنڈت بنواری لعل عطا شمس آبادی۔ غلام قادر فصیح۔ مراد بریلوی۔ نظیر اکبر آبادی اور نظامی جبلپوری نے کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا تیسرا دور احسن لکھنوی سے شروع ہو کر یعقوب علی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دور اردو ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لیے ڈراما نویسوں اور ان کی تصانیف کی تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

احسن لکھنوی: کے دس ڈراموں میں چندراولی۔ خون ناحق۔ بزم فانی۔ الفرڈس۔ بھول بھلیاں۔ چلتا پرزہ۔ شریف بدمعاش مشہور ہوئے۔

—

آرزو لکھنوی :۔ کے دس ڈراموں میں متوالی جوگن اور حسن کی چنگاری سے شہرت پائی۔

بیتاب دہلوی :۔ کے ۱۲ ڈراموں میں کرشن اوتار، کسوٹی، میٹھا زہر، زہری سانپ، امرت، مہابھارت، رامائن، اور کرشن سداما اسٹیج پر مقبول ہوئے۔

حشر کاشمیری :۔ کے ۳۲ ڈراموں میں اسیر حرص، شہید ناز، صید ہوس، خواب ہستی، خوبصورت بلا، یہودی کی لڑکی، بلوا منگل بھگیرت گنگا، ہندوستان، ترکی حور، سیتا بن باس، دھرمی بالک، بھارتی بالک، دل کی پیاس اور رستم و سہراب نے نام پیدا کیا۔

دیوانہ امرتسری :۔ کے کئی درجن ڈراموں میں تائید یزدانی، مہاراجیہ، آفتاب، اجودھیا، سبز پرستان کافی مقبول ہوئے۔

ذائق لکھنوی :۔ کے ۱۴ ڈراموں میں نور عرب، تاج نوران، ستی ساوتری، زہری انگوٹھی، فخر عرب، دھرم یوگی، گشدہ بھرخون نے شہرت پائی۔

رحمت علی :۔ کے نصف درجن ڈراموں میں دردجگر، باوفا قاتل، جلاد عاشق مشہور ہوئے۔

عباس علی :۔ کے ۱۳ ڈراموں میں، نیرنگ ستمگر، جہاں آرا، جاں نثار، نور اسلام، پنجاب میل، شریمتی منجری، موہنی بی اے، لیڈی لاجونتی، پورن مل، سخی سندری نے عزت پائی۔

محشر انبالوی :۔ کے ۱۹ ڈراموں میں دشمن ایمان، جوش توحید، دوزخی حور، خون جگر، سنہری خنجر، شکنتلا، خود پرست کافی مشہور ہوئے۔

مراد لکھنوی اشتر لکھنوی اور مراد لکھنوی کے ڈراموں نے بھی کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا چوتھا دور آرزو بدایونی سے شروع ہو کر بیتاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آرزو بدایونی، آصف مدراسی، اعظم حیدرآبادی، افسوں شاہجہانپوری، دل لکھنوی، راحت مرادآبادی، رادھے شیام، رندھیر، شمس گیاوی، اور شمس لکھنوی نے نام پیدا کیا۔

اس کے بعد جب اردو ڈراما اپنے پانچویں دور میں داخل ہوتا ہے تو کم از کم اپنی تکنیک ختم کر چکا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف مطالعہ کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔

اگرچہ اردو ڈراما آج ختم ہو چکا ہے اور اسٹیج کم و بیش مردہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حالات بتلاتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب اردو اسٹیج دوبارہ اپنی سابقہ عظمت حاصل کرے گا۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ عوام کو ڈرامے کے صحیح فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ڈراما نویسوں اور ان کے پیش کردہ ادب کو پہچان سکیں۔ آج دنیا کا ہر ملک اپنے ڈراما نویسوں پر فخر کرتا اور نظم میں ڈرامے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ شکسپیئر، شاد، ابسن، گوئٹے، شلر اور گالسوردی کا درجہ اپنے ملک کے دوسرے ادیبوں پر بھاری ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کا مستقبل شاندار ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ اس میں دلچسپی لے کر اس کو اس کے صحیح مقام پر جلد یا بدیر پہنچا دے گا۔

---

# حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم، اے

انسانی نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا اتھاہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقت بے وقت ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے، انہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک ممتاز کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی، تجسس حسن، مرکز گریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خود کفالتی، ولولۂ مہم جوئی اور انقلاب حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے توضیح و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح سے زیادہ موسیقیت، اشاریت اور معنی و مفہوم کی تہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں۔ غرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتا ہے، جس کی تسکین کے لیے فطری طور پر خارجی ماحول میں دل بستگی و دل آویزی کی جستجو، جاذب نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیالی کا تجسس، یکدلی، یک جہتی، اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقینی سامانی کے ساتھ حسینوں کے ارتباط یا تذکرۂ حسن میں محصور ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ نفسیات پر چھا جاتی ہے، رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعر کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر نہ صرف حسن کے جلووں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہی ہوتا ہے بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے، احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، علمی صلاحیت، عہد گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشاریت انداز قابل لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے ممد و معاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کر کے مسحور کر لیتا ہے اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں، جن کے احساسات کی شعاعوں نے غم حیات کے طوفان باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوس قزح کی تشکیل کی انھیں ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں، جنھوں نے "چکی کی مشقت" کے دوران میں بھی رومانی غزل نگاری کو نظرانداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی، نشاط کی کیفیت، حواس کی آسودگی اور احساسِ جمال کی شدت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں ایک صحت مند با مذاق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار ہیں مگر چونکہ بہار باغِ کائنات "صنف نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اسی بت ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکز دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور دسیسہ بھی نہیں، پاک باز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی
اے حسن حیا پرور! شوخی بھی، شرارت بھی

حسرت اپنی بیقراریٔ دل کا اظہار کرتے ہیں مگر زبان سے نہیں، آنکھوں سے کیوں کہ محبوب کے خاطر نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؎

گراں گزرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعبِ حسن اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرتِ اظہار دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دورِ ابتدا میں عہدِ ہوس کا ایک واقعہ جو غالباً ان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

بڑی ہی سادگی سے بے جھجک جرأتِ رندانہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار اُن کی مشتاق نگاہیں، بے اختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں، وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے، اس سے کبھی وہ مل کر وفورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو وہ شرم و حیا کی ماری دانتوں میں انگلی دبا لیتی ہے، کبھی درازدستی سے پردہ گرا دیتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منھ چھپا لیتی ہے، سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوخی سے ٹھکرا کر مسکرا دیتی ہے، ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور جستہ جستہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ چوری چھپے رات غیروں کی نظریں بچا کر آ جایا کرتی تھی اور دورانِ ملاقات میں کبھی ذکرِ فراق آ جاتا تھا تو روتی بھی تھی اور رُلاتی بھی تھی، دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی، اس کی بھولوں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو ملبۂ عطار بنا دیتیں اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دستِ رنگیں کا تصور میں جنچنے والا معیار پیش کرتے تھے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے ذکر کو باتوں میں اڑا دیا کرتی تھی، مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی، انھیں برگشتگی پر سو سو نازسے منایا جاتا اور وہ جب من جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی، وہ چھیڑتے، گدگداتے، وہ بگڑ بگڑ کر منتی اور من کر بگڑ جاتی ہے

اے شوق کی بے باکی! وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

اُس ناز میں سے لڑائی بھی ہوتی ہے اور صفائی بھی، تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و رسوائی کا خوف عناں گیر۔ حسرت کی اس ابتدائی سادگی و بیہودگی کی جگہ آخر میں ربودگی و سنجیدگی لے لیتی ہے جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی رائی سے ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ بالوں سے وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے تقدیر بدلتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغاز ایک ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر صحیح نہیں ہوا کرتی، قیدی عمر ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جنابی اور گردوں رکابی پر ناز کرنے ہیں، عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے بیش بہا سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیشِ با فراغت اور بیگانہ رسمِ محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تا دمِ مرگ اُن کی حیاتِ عشق کا آسرا بنی رہی:

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

اک بار ہنسی تھی سرِ بام وہ دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنا تری تصویر ابھی تک

بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالانکہ جیسا ان کے کلام سے پتا چلتا ہے، محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ دنیا منقطع ہو چکا ہے، نہ وہ ہمنشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی، بایں ہمہ قنوطیت، جو منجملہ لوازماتِ فراق ہے، حسرت کے دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکی وہ کہیں ناامید و مایوس نظر نہیں آتے، اور انھیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بساتے اور متکیف ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ رہ رہ کر وصل کا شبہ گزرتا ہے:

اے یادِ یار! دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائیں

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد
وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دنیائے محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے، جدائی کے عالم میں وہ کبھی روئے دل آرا کے تصور سے کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہو گئی تو انھیں کشمکشِ انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پر شکوۂ بے اعتنائی ہو گا اور نہ خلشِ فرقت ہی کہ دل لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا سخت ترین مرحلہ ہے

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی
حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل پر بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین زمانے کو ایک خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھا لیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائلِ آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارماں ہو نہ کوئی حسرت، ملکۂ بے نیازیِ مدعا ہو، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اُس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے؟

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا
مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسنِ کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام "جنوں" پڑ گیا جنوں کا "خرد"
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

قادرانہ رمز کاری شعر کو سرکش بنا دیتی ہے، تشبیہیں، استعارے اور کنایے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں، ان سے موزوں اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا، شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات، استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی
کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

اسی سے پھبتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ اُن کی نظر
اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روندی ہوئی پیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں
شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت
نگہِ شوق نے، کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سادے جذبات گونگے کے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرتِ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہونچاتا ہے کہ ہر اک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات ہی کی

ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا یہی سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کمال ہے۔ ان باتوں کا دارومدار داخلی نوعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی حیثیت سے ماحول، معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت جس شدت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے۔ حسرت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت عمومی سی مخصوص ملتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دل کشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول کی ضامن ہے:

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے، مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساس کا بال، صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق کی بصیرت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت و بے باکی نمایاں ہے۔ ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات میں تندی نہیں، اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی:

تجھ پہ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں؟ — شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی — یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت مروانی فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب و تمدن کے اصولی قید و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام رومانیت ہے، گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں اُن کے خیال اور جذبے کے پرکشش نقوش کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں اُبھر آتے ہیں، لب و لہجہ نوش گوار ہو جاتا ہے، اضطراب وحشت سامانی، بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ لذتیں شاریت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک نئے سے پاسمو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آمیز رومانیت کی جلوہ گری کرتے ہیں:

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں

دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

## بقیہ سن انیس سو باسٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، کھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا، بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، سیل و نہار، قومی آواز، نیج، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر لینے نظر آتے ہیں۔

اردو کارٹون کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون "آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات" قومی آواز میں برکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار" کوہستان میں حمید کا میر صاحب "نیج کا چلتی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی" سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں دہاب حیدر کی "سنی سنائی"، ملاپ میں پران کی "آج کی بات"، شمع میں سد صبر کے ہنستے گیت، پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے چربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادب میں خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور پر بچوں کے رسائل کارٹون کے بغیر ادھورے رہتے ہیں اور اخبارات کا یہ روز بروز لازمی جز بنتے جا رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے اچھی کتابیں اچھے مضامین، اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، ہر چند کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتارِ ادب حوصلہ شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

# ذوق — ایک مطالعہ

محمد انصار اللہ نظر

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عہد آفریں صرف وہی شخصیتیں ہوتی ہیں جو ماضی کی روایات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی اور برت سکتی ہوں ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی ہونی لازم ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل کے لیے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکیں، ہر زمانے کے لیے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں البتہ کچھ ذہین اور با استعداد اشخاص ان تقاضوں کو سمجھ کر ان کے لیے مناسب ذرائع پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہوا، زبان و ادب کو بھی ایک نیا انداز اختیار کرنا تھا۔ سر سید اور حالی، شبلی اور آزاد نے زمانے کے ان تقاضوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کیے اور اس طرح زبان و ادب بہت جلد صحیح نہج پر لگ گئے اگر ہمارے یہ بزرگ اس وقت نہ ہوتے تو بھی یہ کچھ ہو کر رہتا البتہ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کچھ عرصہ اور لگ جاتا، سائنسی اصطلاح میں ان عہد آفریں شخصیتوں کی حیثیت ( CATELYTIC AGENT ) کی ہوتی ہے جو عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے۔ وہ اس عمل میں خود کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے عمل کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید طرز کے مشاعرے کی بنیاد رکھی یہ اس وقت کا تقاضا تھا۔ آزاد کے ذریعہ یہ کام ہوا، آزاد نہ ہوتے تو بھی یہ ہو کر رہتا دیر یا جلد۔ لیکن یہی کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ممکن نہ تھا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذوق کی تربیت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا لیکن آزاد کے اس کارنامے کو صرف ذوق کی تربیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد سید ممتاز علی نے لکھا ہے :

"وہ میں تھے ابتدا سے اس میں یہی دھن پائی کہ وہ نظم اردو کے دوسرے ولی بن جائیں اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے لیے کارآمد ہو سکے اور جس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۷۴ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامن تربیت میں نشوونما حاصل کیا تھا۔"
(مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ صفحہ ۳)

کچھ شک نہیں کہ ذوق کی شخصیت نہایت اہم تھی، ان کا علم و فضل، ان کی قادر الکلامی، تلامذہ کو اصلاح دینے کا انداز، مسلّم ہے اس میں شک نہیں کہ ذوق اپنے دور کے شاعرانہ ماحول کے صحیح نمائندہ تھے، ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے دور میں پسندیدہ تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے دور میں نہایت مقبول اور ہر دل عزیز رہے، تمام تذکرہ نویس ان کی خوبیٔ کلام کے قائل اور معترف ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد ان کے دامن تلمذ سے فیض اٹھانا فخر سمجھتے تھے، حالت یہاں تک پہنچی کہ :

"صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور حک و اصلاح سخن سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی۔" (گلستان سخن)

قبول عام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب انتقال ہوا تو سینکڑوں تاریخیں کہی گئی تھیں :

"مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔"
(گلستان سخن)

شیخ ذوق ایک صاحب علم ذہین شخص تھے انھوں نے اپنے زمانے کا بغور مطالعہ کیا تھا اور بدلتے ہوئے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:

ذوقؔ گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے ۔۔۔ کہ ہوا باغ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

غزل کا مقطع ہے اور یہ غزل بقول آزاد "ابتدائے شباب کی ہے اور نظر ثانی نہیں ہوئی" (دیوان ذوق صفحہ ۱۹۹) لیکن اس کو سنتے ہی ذہن میں یہ خیال

پیدا ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کسی آنے والے انقلاب کو محسوس کر لیا ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے اپنے عہد کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہا لیکن یہاں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اگر ساتھ دیا تو کس طرح؟ کیونکہ یہیں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

ذوق سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو چکے تھے (مجموعۂ نغز) شاہ نصیر استاد وقت تھے کچھ عرصہ کے لیے شاہزادہ مرزا ابوظفر کو دینے پر بھی مامور ہوئے تھے، یہ بڑے قادر الکلام، بلکہ زور آور استاد تھے "تیلیاں" کی ردیف میں مشہور معرکہ ہوا:

"شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل انیس بیس سے کم نہ ہوتی تھی طرفہ یہ کہ وہ سب غزلیں بھی اسی بکہ تازہ عرصہ سخن کی طبع زاد ہوتی تھیں" (گلستان سخن)

اور یہ مشاعرہ "کئی مہینے تک" جاری رہا۔ ایسے زور آور اور کہنہ سال اور کہنہ مشق استاد کی شاگردی کا اثر یہ ہوا کہ خود ذوق بھی سنگلاخ زمینوں میں کہنے لگے۔ اس دور کی بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ کو دیکھیے:

اب / غضب ہے کہ نہیں — آب / حساب تو دے — اب / شب آوے کہ نہ آوے — گردن / پرفن کو لگے

ذوق نے ابتداءً اپنے عہد کے انداز غزل خوانی کو اپنایا اور اس میں خوب کامیاب رہے، سرکار شاہی سے خطاب پایا، بادشاہ اور ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے، اپنے منصب کی خاطر روایات کو برابر آخر عمر تک نباہتے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر ہے:

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے (چراغ دہلی از حیرت)

آزاد نے بھی اس سلسلہ میں جا بجا استاد کے اقوال لکھے ہیں بعض یہ ہیں:

"۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا..... فرمایا ہم لمبی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں زمین ٹھنڈی ہو تو کلام بے اصول نہ ہو" (دیوان ذوق صفحہ ۱۰۵)

"۱۸۵۰ء میں .... مشاعرہ کیا..... میں نے کہا حضرت ضرور کہیے چاہیے لوگ کہیں کہیں گے انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا، استاد کا ارادہ پھر مستقل ہو گیا اور غزل تمام کی" (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

یہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ ذوق آخر عمر میں بھی مشاعرہ کی سخت سے سخت زمین میں شعر کہنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اگر ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں اور آخر عمر کی وہ غزلیں الگ کر لیں جو انھوں نے اپنے شوق سے لکھیں تو معلوم ہوگا کہ اب وہ عام بحروں، مختصر ردیفوں اور سہل قافیوں میں زمینیں کہنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ غزلوں کے ردیف و قوافی درج ہیں:

مرجھا / دکھلا گئے — رفو / وضو کرتے — خدا / جفا سمجھے

سہل زمینوں کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب یہ سمجھ چکا ہے کہ محض سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے میں کوئی افادیت نہیں، چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو خود ترک کر دیا۔

"شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے، ان دنوں کی غزلوں میں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ (دیوان ذوق)

ایک موقع پر آزاد نے ان قطعوں کو "شاگردی کا تمغہ" بھی کہا ہے۔

شاہ نصیر کے بعض مقطعوں میں "گرمی" کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

نصیر اور بھی ایسی کوئی غزل پڑھ گرم

ذوق کی ابتدائی غزلوں میں بالکل اسی مضمون کے مقطع مل سکتے ہیں:

عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

شاہ نصیر مرحوم نے انشا اور مصحفی کے ساتھ بھی بزم شعر میں شرکت کی تھی، ان کے اثر سے ذوق بھی اپنا دامن بچا نہ سکتے تھے۔ چنانچہ مصحفی اور شاہ نصیر کی مشہور بحر کی زمین میں ذوق سے بھی ایک غزل منسوب کی جاتی ہے :

مثل خورشید ہے سیب ذقن سرخ ترا معدن لعل و گہر ہے دہن سرخ ترا (نگارستان سخن)

سیدانشا نے دو غزلہ اور سہ غزلہ بہت لکھے اور ان میں درمیانی مقطع لکھنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا، شاہ نصیر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا اور ذوق کے یہاں بھی یہی انداز ملتا ہے۔ مثلاً :

بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پر غم کے ساتھ کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل (دیوان مرتبہ آزاد)

لیکن آخر دور میں ذوق کے یہاں نہ دو غزلہ سہ غزلہ کا شوق ملتا ہے نہ اس انداز کے مقطعے ہیں اور نہ غزلوں میں قطعات ہیں، اب شاعر کا رجحان معنویت کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے اشعار ایک زمین میں بہت زیادہ نہیں کہے جاتے، ذوق کی آخر عمر کی غزلیں بہ لحاظ تعداد اشعار مختصر بھی ہیں، طویل ردیفوں کی بجائے مختصر ردیفوں کا استعمال اور "گریہ" اور "گرمی" کے روایتی مضامین کا ترک، کرنا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد ہی وہ دور آئے گا جب ردیف اور قافیہ بلکہ وزن کے خلاف بھی ایک احتجاج ہوگا، رسمی مضامین کو نہ صرف واجب الترک سمجھا جائے گا بلکہ ان کو شاعری کا عیب جانیں گے۔

(۲)

مصحفی اور انشا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی دھوم تھی، آتش نے اپنے نظریہ کا اظہار ایک مقطع میں کر دیا ہے :

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے انداز میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کے باوجود "تلاش الفاظ" پر زور دینا دونوں کے یہاں مشترک ہے۔ اس موقع پر ناسخ کے ایک شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ نادر نے اپنی تصنیف تلخیص معلی میں ناسخ اور رشک کے ان اصولوں کو بھی بیان کیا ہے جو بالخصوص شعرا کے لیے اہم ہیں، یہ کتاب زبان کی صحت کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس کے موضوعات یہ ہیں :

"مقدمہ سبب تالیف کتاب میں
پہلی فصل امور واجب الترک و مستحسن الترک محاورات اردوئے قدیم و جدید میں
دوسری فصل دریافت تذکیر و تانیث اور بعض قواعد جمع بنانے کے با دیگر فوائد و زوائد میں
تیسری فصل اختلاف روزمرہ گفتگوئے ساکنان مغرب و مشرق لکھنؤ میں
چوتھی فصل بعض مصطلحات و مرکبات علم عروض و قوافی میں
خاتمہ بعض فوائد و زوائد و امور قابل ترک و اختیار و محاورات و الفاظ وغیرہ" (تلخیص معلی دیباچہ)

ناسخ کے تلامذہ میں شعر کہنے کا جو طریقہ رائج معلوم ہوتا ہے یہ ہے :

"جس طرح پر شعر کہنا منظور ہو اس کے سب قوانی پہلے لکھے ان میں سے غور کر لے کہ کتنے قوافی خاص لائق گنجائش مضامین ہیں انھیں کو سہل زمینوں میں موزوں کرے اول مصرعہ ثانی لکھے بعد اس کے مصرعہ لگا دے۔" (تلخیص معلی)

اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان سے یہی زبان، قواعد عروض کے اصولوں کی اس دور میں اہمیت معلوم ہوگی۔ لیکن معنی، مطالب اور مضمون کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو اس کو ہمیشہ ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

ذوق نے ناسخ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے ناسخ کی کئی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان کے اصول و قواعد کے سختی سے پابند ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دو مقطع پیش کرنا مناسب ہوگا۔

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق ترے زبان کا مزہ تیری شعر خوانی میں
پسے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق لیں ہیں نام طفل ہم دھا پیار سے

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق اپنے اشعار میں لطف زبان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر داد نہ ملنے کی شکایت بھی کرتے ہیں، ان کو بچوں کا ادھورا نام لینا بھی اس حد تک ناگوار تھا کہ اسے بھی بے تمیزوں کا شعار سمجھتے تھے، یہ سب صحیح ہے لیکن انسان کی ذاتی اُفتادِ طبع بھی بڑی چیز ہے، اس دور میں جب بندشِ الفاظ کی وہ اہمیت ہو جو بیان ہوئی ذوق نے ایک مقطع کہا (سترہ سال سے بھی کم عمر میں)

ٹک دیکھ اب تو چشمِ حقیقت سے اے ذوق　　ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہورِ حسن　　(مجموعہ نغز)

اس مقطع کے مضمون سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی اہم ہے کہ لفظ "طرف" جو متحرک الاوسط ہے ساکن الاوسط نظم ہوا ہے۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس کی مثالیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ میر تقی میر کے متعلق آزاد نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ لکھنؤ میں جب عمائد نے میر صاحب سے شعر کی فرمائش کی میر صاحب نے یہ مطلع پڑھا

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا "آپ کہیں گے خیال کی "ی" ظاہر کرو مگر جواب یہ ہے کہ محاورہ یہی ہے؟ (آبِ حیات) ـــــ ذوق کے بچپن میں میر صاحب زندہ تھے (اگرچہ لکھنؤ میں تھے) ان کے واقعات ذوق نے بچپن میں سنے ہوں گے، میر کے سودا اور قائم کے کلام میں بھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نظم کرنے کی مثالیں کافی ملتی ہیں، ذوق نے بھی اپنے لئے دہلوی شعرا کی روایات کو زیادہ قابلِ عمل پایا، چنانچہ وہ حسبِ ضرورت اصول و ضوابط سے انحراف بھی جائز رکھتے ہیں اس سلسلہ میں وہ ناسخ کے مقلد بالکل نہیں ہیں، چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر

اور : دوپہر میں سایہ بھی بیٹھے ہے دب کر زیرِ پا

ایک ہی لفظ "پہر" کو ایک موقع پر ساکن الاوسط اور دوسرے پر متحرک الاوسط نظم کیا۔

کوسوں کیا تنگئ زمانے کو

فراق گورکھپوری صاحب کو بھی ذوق کی یہ ترکیب کھٹکی ہے لیکن انھوں یہ کہہ کر کہ شاید ذوق کے زمانے میں ایسا ہی بولتے ہوں اسے اہمیت نہیں دی ہے، اصول کے مطابق تنگئ زمانہ بھی صحیح ہے۔ لیکن شاعر نے قافیہ کی رعایت برتی، اسے ضرورتِ شعری کہہ سکتے ہیں۔

ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

یہاں بھی "آل کی" ہونا چاہیے تھا مگر ردیف یہی تھی ـــــ اس موقع پر تلخیص معلی کا ایک اقتباس اہم ہے۔

" از انجملہ ہے کہ اکثر اشعار میں مصرعہ اول اس طرح موزوں کرتے ہیں کہ جب تک دوسرا ایک لفظ مصرعہ ثانی میں شامل کرکے نہ پڑھے جائیں تب تک مطلب واضح نہیں ہوتا اور یہ بے لطف محض ہے چاہیے کہ ہر مصرعہ کا مطلب جداگانہ ہو۔ (ذوق)

بند آنکھیں کیجے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے　　ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا "

اسی طرح ایک اور موقع پر نادر لکھتے ہیں:

" اور یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں ایک نونِ عین اور دوسرے ہائے ہوز کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکہ دے کر وزن سے خارج ہو کر شاعر کو ذلیل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے استادوں نے دھوکا کھایا ہے۔"

گر فضول ہو وے جلو ریز بہ دشت قپچاق

خود آزاد نے بھی اصولوں سے ذوق کے اس انحراف کو محسوس کیا تھا چنانچہ دیوان ذوق میں جا بجا اس کی مثالیں خود انھوں نے پیش کی ہیں (ملاحظہ ہو ص۳۴، ص۱۷۲، ص۱۴۵ وغیرہ) آزاد نے کبھی کبھی اس مسئلہ پر استاد سے گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ذوق کا مصرعہ ہے۔

صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

محاورہ ہے "گجر کا ہونا" ذوق نے اس کے خلاف نظم کیا ہے۔ آزاد نے پوچھا تو ذوق نے جواب دیا۔

" یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی ڈھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خبر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی

پیدا ہوا بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا قباحت کیا ہوئی ؟ (دیباچہ دیوان ذوق صفحہ ۳۴)
اس شعر کے متعلق ذوق کہہ سکتے تھے کہ یہ چلن کا کلام ہے حافظ شوق کے دور تلمذ کی یادگار ہے (عمدۂ منتخبہ) لیکن آزاد کے مذکورہ بیان سے صاف معلوم
ہے کہ ذوق محاورہ میں اس تصرف سے شرمندہ بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے زبان میں "وسعت کا ایک قدم" سمجھتے تھے اور اس پر وہ آخر تک قائم رہے اس زمانہ میں
ہ کہ معمولی سی لغزش پر بھی بر سر مشاعرہ لوگ ٹوک دیتے تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ بات کے لیے سند طلب کی جاتی تھی۔ ذوق کا اقدام بلاشبہ جرأت مندانہ ہے اس سلسلے میں شاہ نصیر
، دو شعر نقل کرتا ہوں جن میں ذوق پر گرفت کی گئی ہے۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے — قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا — بارکی چلمن ہو اور بائے مگس کی تیلیاں

(انتخاب کلیات شاہ نصیر مطبوعہ اعلیٰ پریس میرٹھ)

ب ہے کہ ان اشعار کو پنڈت کیفی نے لالہ گھنشیام داس عاصی کے نام سے شائع کیا ہے اور ایک شعر کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ — باندھیے گر ہو سکیں تار نفس کی تیلیاں (خمخانۂ جاوید ۵/۳۴۳)

، معرکہ آرائیوں کے باوجود ذوق نے محاورات اور روزمرہ میں بھی تصرف کیا اور اس طرح یہ بتا دیا کہ قدیم روایات کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن ہر زمانے کے کچھ
نے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ صرف قدامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو شخصیتیں عہد آفریں ہوتی ہیں وہ نئے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں، زبان و ادب
، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے چشم پوشی کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور ان سے دامن بچا کر چلنے والا اپنے دور سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ذوق
ے زمانہ میں یہی بڑی بات تھی کہ انھوں نے نئے محاوروں، نئے الفاظ کو اختیار کیا، شاعری کے نئے مزاج کو پہچانا جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے
نوں نے اگر اصول کی پابندی کو حارج ہوتے دیکھا تو اس قید کو توڑ دینے میں کوئی تکلف نہ کیا، ان کے نزدیک اصل چیز وہ خیال تھا جو نظم کیا جاتا تھا نہ کہ وہ اصول
، کے مطابق نظم ہوتا تھا، اصول کا مقصد خود یہی ہے کہ وہ مضمون کو زیادہ دلکش اور پراثر بنا دیں نہ یہ کہ اس کی تاثیر اور کشش کو نقصان پہنچائے۔ ذوق کا شاعری
، متعلق جو نظریہ تھا وہ اس مقطع سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق جفی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

(۳)

ذوق آنکہ مدام ہیچ مردان خدا — بر داشتہ بود دل از ین جائے دنی — صہبائی

ذوق ایک خدا پرست شخص تھے ان کے نزدیک تمام انسان "انسان" تھے وہ ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے کہتے ہیں:

مت بھول بندگی پر غرہ میں آ کے بندے — زاہد سے "یہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

مذہبی فرقوں کے متعلق وہ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ:

جو اس کے نزدیک رہبری ہے — وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ان کے سامنے انسانیت کا ایک وقار تھا شرافت اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ کیا تو ہر طرف ادبار
و پستی نظر آئی، اس نے ان کو بہت متاثر کیا تھا چنانچہ مختلف انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً:

رباعی

ان آنکھوں سے روتے لالہ گوں بھی دیکھا — اور ان کو بپاز اشک خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھا نہ رنگ ہم نے اے ذوق — یوں بھی دیکھا جہاں کو و یوں بھی دیکھا

اپنے زمانے کے وضعداروں کو بگڑتے دیکھا اور ان کی تباہی سے متاثر ہوئے ایک رباعی میں اس قسم کا تاثر بیان کیا ہے۔

رباعی

جب تلک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے　　سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق　　پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

ذوق مسلمان تھے اور اس دور میں خصوصاً مسلمانوں کی تباہ حالی دیکھ کر بہت کڑھتے تھے دیکھیے اس کیفیت کو کس قدر دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں:

قطعہ

حق کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال　　دیکھتا ہوں یہ اب اے ذوق میں انکا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دیتے کو بے دینوں کے　　نقل کرتا ہے مسلمان کی کافر نقال

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی بعض تحریروں کا عکس شایع کیا ہے، اس میں یہ قطعہ بھی ہے۔ اسی صفحہ پر نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ کے کئی مادے ذوق نے لکھے ہیں جو ۱۲۶۲ھ کا واقعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطعہ مذکورہ ۱۲۶۲ھ میں کہا ہوگا۔ مذکورہ رباعیات سے ذوق کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب محض ہجر و وصال کی روایتی کیفیات کے بیان کا موقع نہیں ہے بلکہ اب ضرورت ہے کہ اخلاقی اور اصلاحی حقایق بیان کیے جائیں، چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقتوں اور نصیحتوں کا مختلف تمثیلوں کے ذریعے بیان ملتا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت ہیں:

دیدۂ آبلہ پا کا ہے یہی اب رونا　　کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منھ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

جرأت اور حب الوطنی کے مضامین بھی ملتے ہیں نمونہ یہ ہے:

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب　　تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لیکر
یوں اسیرانِ قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ　　جیسے غربت میں شفیقانِ وطن کا کاغذ
فراق خلد میں گندم ہے سینہ چاک ابتک　　الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

ذوق نے غزلیں کہی ہیں اور غزلوں میں انھوں نے اس قسم کے مضامین نظم کیے ہیں، ان سے پہلے ہی غزل کا مزاج مخصوص ہو چکا تھا اس کی اپنی زبان ہے اپنی اصطلاحات ہیں اور اپنا انداز بیان ہے اس کا بہترین نمونہ ہمیں ذوق کے دوسرے استاد بھائی حکیم مومن کے یہاں ملتا ہے غزل کو غزل کے صحیح معنوں میں استعمال کرنے میں مومن سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے غزل کا مروجہ انداز بہت تنگ تھا۔ ذوق کا عقیدہ تھا کہ:

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

اور وہ کائنات کے ہر ذرہ سے فائدہ اٹھا لینا اپنا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں بھی روایتی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی بہت نظم کیے ہیں، اس کے لیے غزل کی رمزیہ زبان ناکافی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں کو چھوڑ کر صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
دین ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں　　اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

بعض اوقات تو ان مضامین کو اس قدر کھل کر نظم کر جاتے ہیں کہ وہ غزل میں کھٹکنے لگتے ہیں مثلاً:

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مضمون کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس میں وہ کیفیت ہرگز نہیں جو غزل کے شعر کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ذوق کو ان تمثیلوں کے

استعمال میں بھی تکلف نہیں جن کو اساتذہ نے مبتذل کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا مثلاً :

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں ۔۔۔ کانٹا ہے گھر میں سیہ کا یا گل کنیر کا
سگ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر دنیا ہو ۔۔۔ کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو
چھلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک ۔۔۔ اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ
نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص ۔۔۔ رہ گیا یہ تو گدھا دلدل میں بھنس کے بوجھ سے

وہ کان جو بلبل، طوطی اور قمری کا تذکرہ سننے کے عادی تھے زاغ و زغن اور سیہ کا ذکر یقیناً پسند نہیں کر سکتے، وہ طبائع جن کے سامنے ہمیشہ گل و نسترن، نرگس و یاسمن کی بہاریں رہیں کنیر کے پھول اور کتا گھاس کو یقیناً حقیر ہی سمجھیں گے۔ چنانچہ ذوق کے یہ اشعار یقیناً پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے گئے ہوں گے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کسی قدیم تذکرہ میں ایسے اشعار نقل نہیں کیے گئے، لیکن ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کی ناپسندیدگی سے متاثر ہو کر اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔ چنانچہ آخر تک وہ اپنی اسی روش پر قائم رہے۔ ذوق سے انتہائی سختی برتنے کے باوجود ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا یعنی یہ کہ ناسخ اور ان کے معتقدین کے کلام کو سن کر ذہن صنائع بدائع کی تلاش کرتا ہے اور ذوق کا شعر سن کر ہم اس کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، غزل کے مزاج میں یہ تبدیلی نہایت اہم ہے۔

شاہ نصیر اور ناسخ کا اثر یہ تھا کہ سامعین قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری کے دلدادہ ہو رہے تھے چنانچہ اس دور کے مشاعروں کی طرحیں دیکھ لیجیے ایسی ہی ملیں گی مثلاً :

کب کے مشتاق تھے زخموں کے ذہن پتھر کے
کیا غمزہ ترا برسر بیداد غضب ہے
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

اس میں شک نہیں کہ ذوق نے اخلاقی مضامین کو آسان زمینوں میں عام فہم تمثیلوں کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن اگر وہ صرف یہی کرتے تو یقیناً ناکام ہوتے، انھوں نے زمانے کا ساتھ بھی دیا اور سخت سے سخت زمین میں بھی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھیں اور اس طرح اپنی قدرت کلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا، لیکن مقصد ہمیشہ پیش نظر رہا ابتدائی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے ضرور کہتے تھے جو زندگی کے لیے مفید ہوں اور آخر عمر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ سامعین کے مزاج کو بتدریج متاثر کر کے ایک دوسرے نہج پر لے آنا بڑی بات تھی، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ وہی سامعین جو کبھی ایسی غزلوں کو پسند کرتے تھے کہ :

آفریں معنی باریک سے کیا خوب نصیر ۔۔۔ تو نے پیدا کیے ہیں سر بسر اشعار میں بال

ذوق کی آخری عمر تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اب ان شعروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے لگے تھے اور یہی ان کی پسند ہو کر رہ گئی تھی کہ :

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو ۔۔۔ آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز ۔۔۔ کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

یہ پہلا شعر گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) چمن بے نظیر (۱۲۶۴ھ) وغیرہ میں اور دوسرا گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ)، گلستان سخن شعرا (۱۲۸۱ھ) ترجمہ حدائق البلاغت (۱۲۵۰ھ) وغیرہ میں ملتا ہے اور ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ مقبولیت کا حال یہ کہ ایک مدت تک لوگوں کی تحریر و تقریر میں بیشتر ذوق ہی کے اشعار نقل کیے جاتے تھے،

(۴)

مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی تنگی کا شکوہ ایک موقع پر اس طرح کیا ہے :

"غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہوا کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لیے درکار ہوتے ان سے یہ زبان مفلس رہی کیوں کہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ و فلسفہ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن

باتوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔" (آبِ حیات ص۴۲۸)

شمالی ہند میں سودا اور ان کے بعد انشا نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا تھا مگر ان کے بعد شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ذوق نے اس بدلے ہوئے ماحول میں پھر سودا اور انشا کی یاد تازہ کی، انھوں نے قصیدوں میں علمی مسائل کو نظم کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور غزل جیسی لطیف صنعت کو بھی اس کے لیے استعمال کیا، ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ہیں اکثر ملتے ہیں جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف کسی خاص مسئلہ کو نظم کرنے کے لیے یہ شعر کہہ دیا ہے مثلاً:

نخلِ گلِ مہندی نہ ہو نصف سبو میں اے نگار — تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیرِ پا

شاعر کو نخل گل مہندی کی یہ تاثیر معلوم ہوگی کہ یہ بہار کا پھول ہے اس کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے، پورے پودے کا عرق سوزش اعضا کے لیے مفید ہے خصوصاً جب وہ آگ یا گرم پانی سے جلنے کے سبب ہو۔

عدوئے نیش زن کے گھر سے میرا حبیب نکلے — الٰہی برج عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

برج عقرب دوازدہ بروج فلکی میں سے آٹھواں ہے، اس کی شکل بچھو سے مشابہ ہے، بہ لحاظ تاثیر آبی ہے، رنگ سیاہ ہے، اس برج میں قمر کا ہونا نحوست کی طرف اشارہ کرتا ہے ــــ ان خواص کو ذہن میں رکھیے، یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر کا مقصد ان ہی کو نظم کرنا تھا اس قسم کی متعدد مثالیں دیوانِ ذوق میں ملیں گی۔

یہیں تصوف کے متعلق بھی اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ تصوف اردو شاعری کے حاوی رجحانات میں سے ایک ہے اور ذوق کے زمانے میں تو اس کا زور اور بھی زیادہ تھا خود مرزا غالب بھی "مسائل تصوف" بیان کر کے "ولی" بننا چاہتے تھے اس دور میں مسئلہ وحدت الوجود کو زیادہ اہمیت حاصل تھی خواجہ میر درد بھی اسی کے قائل تھے لیکن اقبال نے آخر اس کی تردید کی اور اس کے مضر اور مہلک اثرات کو ظاہر ثابت کیا، ذوق کے تصوف کے متعلق کوئی تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا اس لیے کوئی قطعی بات کہنا قبل از وقت ہے البتہ ایک شعر میں انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہایت عمدہ طنز کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلہ وحدت الوجود — لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

فلسفہ کی بحثوں کے متعلق بھی ذوق نے نہایت عمدہ بات کہی ہے:

کیا جانیں ہے زمانے کو حادث ہے یا قدیم — کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں خانموں میں ؟؟

مولوی نذیر احمد مرحوم نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:

"اگر تم میری صلاح مانو تو علم الکلام کی کتاب تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ایک بڑا نقصان جو طالبِ علم دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات سے متشکی ہو جاتی ہے جس ترتیب سے میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا ہے اس کا لحاظ بھی حیرت احتمالات سے بچنے کے لیے مفید ہے جب انسان اس بات کو نصب العین کرے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے بعض باتوں سے تو وہ بایں خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔" (ابن الوقت ص۱۴۵)

غرض یہ کہ ذوق نے مختلف علوم و فنون کے مسائل کو غزل میں داخل کر کے غزل کو ایک نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی مختلف اختلافات اور منفی انداز فکر سے ذہنوں کو آزاد بھی کرنا چاہا ہے لیکن یہ کام ان کے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ آزاد، حالی اور نذیر احمد وغیرہ کے دور میں زمانے نے خود ذہنوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔

## (۵)

ذوق کے ابتدائی اور آخری دور کے انداز فکر میں فرق کو سمجھنے کے لیے ہی ہم ایک غزل نقل کرتے ہیں، یہ غزل انھوں نے آغاز شباب میں کہی تھی، صرف یہی چند شعر اور اسی حالت میں عمدہ منتخبہ میں مل سکے۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا — کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

— آتش دل سینہ میں مثل مشعل — داغ ہے انبار رہے انگاروں کا
آرزو ہے کہ جو خورشید قیامت — سایہ اس کشتۂ ابرو پہ ہو تلواروں کا
ہائے وہ عاشق جانباز کہ — تک ہدف تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا
کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہوے تو وہ دل میں پیکانوں کا اور سینہ میں سوفاروں کا
ذوق بے چیدہ کہاں زلف ہے اس کافر کی ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی سنہ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ (دیوان ذوق صفحہ ۹۴)
چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوان ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوان ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا دیکھیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اتنا تو سوز فغاں ہو کہ چمن میں بلبل خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہوا انگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
ہوں رگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار گر تماشا تجھے منظور ہو فواروں کا
ہیں کماندار ترے تیر مژہ تشنۂ خوں منھ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار کہ زلف جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا
دیں گے جاں بوسۂ لعل نمکیں پہ ہم بھی جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا
(دیوان ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک والہانہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے منتخبہ، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلستان سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال ک جا سکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلمزد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ سنہ ۱۲۶۰ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا گیا جام دیدیجیے تو وہ یاروں کا یار ہوگا، مضمون اس دور کی رسم رشوت خوری اور خیانت منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا بلکہ ما تر ہوگا، ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شایع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الٰہی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں، دہلی میں اس وقت جو انتشار عام تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا تھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے تھے میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمن گل کو بھی پھونک ڈالے (ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہمارے سامنے ہیں) غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں ہے اس میں ایک حد تک اصلیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر رعایتی اور اشعار کی تعداد ہوتی ڈھلتے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہ ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی مفید اور قابل قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

# سن اُنیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب

## احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو۔ دراصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہٰذا میرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قران السعدین کو ساعت منحوس میں تبدیل ہونے سے بچا لوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور حریص احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفرنامے، خطوط، باقیات الصالحات، فکاہیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا ہے کاروان طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاع عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہوگیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار بخشا اور مجید لاہوری نے اسے مقبول عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میر کارواں مولانا عبدالماجد دریا بادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبدالمجیب سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسایل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر بین الاقوامی مسایل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کر کے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبدالماجد دریا بادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کر لیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر اخبار اور رسالے بڑے فخر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کر دیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

پندرہ روزہ نمکدان کراچی میں "گر تو برا نہ مانے" سے "بت شکنی" کے کان پر رکھ کر قلم نکلے، پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ نمکدان کے تیر اندازوں میں اودھ پنچ کے نوکدار تیروں کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے، ان کی دوربین نظروں سے کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے طفیل احمد جمالی کی بت شکنی، صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اور مقبول عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس میں شوکت تھانوی کا "بہاڑ تلے" ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ" رئیس امروہوی کا "مزاحیہ کردار" نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ اور

آتش دل سینہ میں مثل منقل — داغ ہے انبار ہے انگاروں کا
آرزو ہے کہ جو خورشید قیامت — سایہ اس کشتۂ ابرو پہ ہو تلواروں کا
ہائے وہ عاشق جانباز کہ تک — ہدف تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا
کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہوے تو وہ — دل میں پیکانوں کا اور سینہ میں سوفاروں کا
ذوق بے چیدہ کہاں زلف ہے اس کافر کی — ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ (دیوان ذوق ص۲۴) چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوان ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوان ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا — دیکھیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اتنا تو سوز فغاں ہو کہ چمن میں بلبل — خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ — ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
ہوں، نگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار — گر تماشا تجھے منظور ہو فوّاروں کا
ہیں کماندار ترے تیر مژہ تشنۂ خوں — منھ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار کہ زلف — جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا
دیں گے جاں بوسۂ لعل نمکیں پہ ہم بھی — جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق — روسیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا (دیوان ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک والہانہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلستان سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلم زد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ ۱۲۶۰ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب میخواروں کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا کہ اسے ایک جام دیجیے تو وہ یاروں کا یار ہوگا۔ مضمون اس دور کی رسم رشوت خوری اور خیانت منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا مشاہدہ بلکہ تاثر ہوگا، ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شائع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الٰہی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں، دلی میں اس وقت جو انتشار عام تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ فغاں میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمن گل کو بھی پھونک ڈالے (ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات ہمارے سامنے ہیں) غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس میں ایک حد تک اصلیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر روایتی اور اشعار کی تعداد بڑھانے والے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہاں ہمیں ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی مفید اور قابل قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

# سن اُنّیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب

## احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو، دراصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہٰذا میرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قرآن السعدین کو ساعتِ منحوس میں تبدیل ہونے سے بچالوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور عریض احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ، مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفرنامے، خطوط، باقیات الصالحات، فکاہیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا ہے کاروانِ طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاعِ عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہوگیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد المجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار بخشا اور مجید لاہوری نے اسے مقبولِ عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میر کارواں مولانا عبد الماجد دریا بادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبد المجیب سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور، بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسایل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر بین الاقوامی مسایل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کر کے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبد الماجد دریا بادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کرلیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشمار اخبار اور رسالے بڑے فخر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کردیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

پندرہ روزہ نمکدان کراچی میں "گر تو برا نہ مانے" اور "بت شکنی" کالم پر رکھ کر قلم نکلے، پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ نمکدان کے تیر اندازوں میں اودھ پنچ کے نوکِ نشتر کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے، ان کی دوربین نظروں سے کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے۔ طفیل احمد جمالی کی "بت شکنی" صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اور مقبولِ عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس میں شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے" ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ" رئیس امروہوی کا مزاحیہ کردار "نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ اور

ں کا گروہ پیش شایع ہوتا ہے۔ جنگ کا مزاحیہ کالم بیت سے اخبار اور رسالے بغیر کسی حوالے یا حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق آرائے ان تراشوں کی مدد سے مزاحیہ افسانچوں کے مجموعے تیار کرکے شایع کرتے ہیں
ے شوکت تھانوی کا مارشل لا ـــ نمک مرچ، کارٹون اور جوکر وغیرہ، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، رئیس امروہوی اور شفیع عقیل کے کالم عوام اور خواص میں بے حد
معروف ہیں خاص طور پر رئیس امروہوی کا "قطعہ" جو ہمیشہ دودھاری تلوار ہونے کے علاوہ اپنے اندر ایک عجب کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

روزنامہ امروز لاہور میں عنقا کے نام سے احمد ندیم قاسمی روزانہ "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے ہیں۔ عنقا کے بیشتر موضوعات سماجی کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہوتے
ب کی یہ چاشنی ان کو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مقبول بنائے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے "حرف و حکایت" کا یہ باغ و بہار کالم اردو کے صحافتی مزاح میں ایک
ی اہمیت کا حامل ہے۔

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ گزشتہ ۱۸ سال سے اپنے پڑھنے والوں کو "گلوریاں" پیش کر رہا ہے۔ اس کے میزبان حیات اللہ انصاری اور عبد المجیب سہالوی کا
مخصوص لہجہ، انداز، تہذیب، رکھ رکھاؤ اور معیار بہت رچا بسا گہرا سیاسی و سماجی شعور اور سوجھ بوجھ ہے ان کی ظرافت میں مقصدیت اور توازن کا خوشگوار
بہت عام ہے۔

روزنامہ ملاپ دہلی میں فکر تونسوی "پیاز کے چھلکے" لکھتے ہیں۔ فکر تونسوی صحیح معنوں میں صحافتی اور عوامی مزاح نگار ہیں ان کے پیاز کے چھلکے عوام میں بے حد مقبول
دبی مسئلہ کوئی گتھی غرض کوئی بات بھی ہو فکر تونسوی دم بھر میں اس کے چھلکے اتار کر رکھ دیتے ہیں ان کا سیاسی شعور ان کی ادبیت اور ان کی صحافت ان کی ظرافت پر حاوی ہے۔

خوشتر گرامی برسوں سے نہایت خاموشی کے ساتھ بیسویں صدی دہلی میں "تیر و نشتر" لکھ رہے ہیں ان کے ہر فقرے میں ایک مخصوص ادبی نشتریت پنہاں ہوتی ہے۔
ے یہ فقرے اور حاشیے ہماری سیاست، ادب، اور زندگی کی مختلف بے اعتدالیوں پر بڑا تیکھا طنز کرتے ہیں ان کے طنز میں مزاح کی نرمی اور گرمی کے ساتھ ساتھ
ٹ اور اعتدال بھی ملتا ہے جو فی زمانہ نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔

ہفتہ وار بھوپال پنچ میں "اور مزید ابھی رہی" علامہ ڈھبر کے نام سے تخلص بھوپالی لکھتے ہیں۔ تخلص کے قلم میں بھالے کی دھمک ضرور ہے مگر یہ زخموں پر
ے رکھنے کے فن سے ناواقف ہے۔ زخموں کو کریدنا کوئی ان سے سیکھے ان کی شوخی نے بڑھ کر بے باکی اور بے حجابی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

صدق جدید لکھنؤ، جنگ کراچی، نگران کراچی، امروز لاہور، قومی آواز لکھنؤ، ملاپ دہلی، بیسویں صدی دہلی، اور بھوپال پنچ بھوپال، کے علاوہ اس میدان میں
نامہ نوائے وقت لاہور کا ... سر رہا ہے، روزنامہ سیاست حیدر آباد دکن میں کوہکن کا شیشہ و تیشہ، روزنامہ پاسبان ڈھاکہ میں پروفیسر ارشد کاکوی کا شیشہ و تیشہ
نامہ انجام کراچی میں رمضانی کا "سبیل تذکرہ"، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی میں علامہ ہرن کا قطعہ اور پیر مغاں نے کہا، روزنامہ آبشار کلکتہ میں فرہاد کا سنگ و خشت
ہفتہ وار آگ لکھنؤ میں علامہ نابینائی کا تندور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری محفل سے ریاض خیرآبادی اور شاہد صدیقی اٹھ گئے۔ ریاض خیرآبادی اودھ پنچ کے آخری دور کے پرانے لکھنے والوں میں سے تھے انھوں نے
سجاد حسین کی آنکھیں بھی دیکھی تھیں یہ ہمارے لیے اپنا قلمی دیوان "تفریحات ریاض" چھوڑ گئے ہیں۔ ریاض خیرآبادی کا نام اور ذاکر اور مرثیہ اسپ ہمیشہ ان کا
زندہ رکھے گا۔ شاہد صدیقی کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدر آباد دکن میں شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ شاہد کے قلم کے
ہکتے، ان کے رنگ میں بڑی شوخی اور پرکاری تھی۔ ان کو شباب ہی میں موت نے آ لیا۔ دنیائے طنز و ظرافت کے لیے یہ دونوں حادثے ناقابل تلافی ہیں ـــ
کے علاوہ اودھ پنچ لکھنؤ اور بھوپال پنچ بھوپال اس درمیان بند ہو گئے، پاک پنچ اور پھلجھڑی بھی اسی دوران نظر نہیں آتے ان رسائل کے بند ہونے پر
رے طنزیہ و مزاحیہ شعرا نے مرثیے نہیں کہے مگر پھر بھی ان حالات کا ماتم ضروری ہے جو اس کا ذمہ دار ہے۔

صحافت کے بعد ادب کا وسیع و عریض میدان شروع ہوتا ہے اردو کے مزاحیہ ادب میں مضمون نگاری کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں غزل کا سال بھر
جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے پرانے مزاح نگار رفتہ رفتہ میدان چھوڑ رہے ہیں۔ پرانی نسل میں گرمی، لگن اور فن پر ریاض کے
بلے میں اطمینان، سہل پسندی اور خاموشی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ نئی نسل زیادہ دم خم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ غزلوں کی طرح مضامین بھی بے
شہ لکھے جا رہے ہیں۔ مگر قابل ذکر مضامین بہ آسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اچھے مضامین کی یہ افسوس ناک کمی خاصی تشویشناک ہے۔ مضمون نگاری (مزاح
اری) دراصل ایک ایسی ریل گاڑی ہے جس میں صرف فرسٹ کلاس ہوتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے مسافروں کا اس میں گذر و سفر ممکن نہیں۔

اس سناٹے کو چراغ تلے اور اندیشۂ شہر نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شوکت تھانوی کی "ہم زلف" اور فرقت کاکوروی کی "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" سال رواں کے مزاحیہ ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضامین رشید عرصہ سے نایاب تھی مگر اس سال اس کا بھی نیا ایڈیشن آگیا ہے۔

افسانے اس سال نہ لکھے جانے کے برابر لکھے گئے۔ شوکت تھانوی، شفیق الرحمان اور فکر تونسوی ہمارے قابل ذکر افسانہ نگار رہے۔ شوکت تھانوی نے کچھ قابل توجہ افسانے اس درمیان لکھے ہیں مگر شفیق الرحمن بالکل خاموش ہیں اور فکر تونسوی کالم نویسی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔

ناولوں میں کرشن چندر کے گدھے کی واپسی، فکر تونسوی کا "پروفیسر بدھو" سید ضمیر جعفری کی تین لڑکیاں، تین بابا" محمد خالد اختر کی شیخ قربان علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل جالبی نے منشی سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" کو ایڈٹ کیا ہے مگر انھوں نے اس کام کو محنت اور توجہ سے انجام نہیں دیا۔ حاجی بغلول، کا سنہ تصنیف اور منشی صاحب کے حالات اس میں تقریباً نادارد ہیں۔ آخر میں انھوں نے کتاب کی جو فرہنگ تیار کی ہے وہ افسوسناک اغلاط سے عبارت ہے۔ مگر پھر بھی یہ اچھی کوشش ہے۔ منشی سجاد حسین کے دوسرے ناولوں "میٹھی چھری، طرحدار لونڈی، اور پیاری دنیا" کے نئے ایڈیشن بھی امسال میں سامنے آئے ہیں۔ سرشار کا "جام سرشار" اور ڈپٹی نذیر احمد کا ابن الوقت بھی شایع کیے گئے ہیں۔ ان سب کا تعلق ہماری کلاسکی ظرافت سے ہے۔

مرزا ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، خوجی، چچا چھکن، خانم، مرزاجی، منشی جی اور قاضی جی کے علاوہ اس سال ہمارے مزاحیہ ادب میں دو نئے کرداروں کا خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا "مرزا ودود بیگ" اور عطیہ پروین کی "چچی" مشتاق احمد یوسفی نئے مزاح نگاروں میں سب سے ممتاز اور محترم ہیں "چراغ تلے" کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشید احمد صدیقی اور لیطرس سے کہیں زیادہ خون خرابے کریں گے۔ ان کا مرزا ودود بیگ ہر وقت ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مرزا کا کردار بہت جاندار اور جیتا جاگتا ہے۔ خوجی کی طرح اس کے کوئی جسمانی کوڑ نہیں ہے۔ نہ یہ خوجی اور بغلول کی طرح منہ زور ہے عظمت کا احساس بھی ایک خاص انداز اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مرزا کے یہاں ملتا ہے غرض اردو کے ابتک کے تمام مزاحیہ کرداروں میں ظاہر دار بیگ، چچا چھکن اور شیطان کے بعد اتنا متوازن کردار ہمارے ادب میں یوسفی ہی نے پیش کیا ہے۔ عطیہ پروین کا چچی کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ چچی کی توکھلاہٹ اور سڑیلا پن اپنے اندر ایک عظمت کا احساس لیے ہوئے ہے ان کا یہ مستقل کردار اپنے اندر بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ تخلص بھوپالی کی "پاندان والی خالہ" اور فکر تونسوی کے پروفیسر بدھو میں بھی مزاحیہ کردار کی ایک جھلک ملتی ہے۔ مگر ان میں ابھی وہ وسعت اور لچک نہیں پیدا ہو سکی ہے جو مزاحیہ کردار کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

ریڈیو اور اسٹیج کے لیے اس دوران برابر ڈرامے اور فیچر لکھے اور خاکے اڑائے گئے مگر اس درمیان ہمارے سامنے آنے والی چیزوں میں سلطان الارشد کا "سوسال بعد" ٹیڈی گرل کے لیے ضرورت رشتہ اور ڈاکٹر محمد حسن کا فٹ پاتھ کے شہزادے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کی صنف پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی "ہمنفسان رفتہ"، شاہد احمد دہلوی کی "گنجینۂ گوہر"، سید ضمیر جعفری کے "اڑتے ہوئے خاکے" اور تخلص بھوپالی کا "پوسٹ مارٹم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہ منیر خاں صرف خاکے ہی لکھتے ہیں لیکن اگر وہ متفرق کرداروں کے خاکے اڑاتے رہنے کے کسی ایک کردار کے تخلیق کرنے پر اپنی ساری توجہ صرف کر دیں تو اس بہانے اردو ادب میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو جائے ویسے ان کے میر صاحب کے کردار میں بڑی صلاحیت ہے۔

پیروڈی کے میدان میں کنہیا لال کپور، شفیق الرحمان، غلام عباس، محمد خالد اختر، م۔ نسیم، ضیاء الحسن موسوی، نسیم درانی، تخلص بھوپالی اور اے آر ممتاز پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سال رواں کا اہم ترین کارنامہ کنہیا لال کپور کی پیروڈی "انار کلی" ہے

اردو ادب میں جدید انشائیہ کی تحریک کے قاید ڈاکٹر وزیر آغا ہیں "خیال پارے" ہمارے جدید انشائیہ ادب میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اس کی اشاعت سے اب تک ہمارے بیشتر انشائیہ نگاروں کے نئے انشائیے خیال پارے کی بازگشت اور انشائیہ پر مقالہ خیال پارے کے مقدمے کا ناقص چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میدان میں وزیر آغا اور مشکور حسین یاد کے علاوہ کم و بیش سب ہی "انشائیہ نگار" اس وقت انشائیہ نگاری کے نام پر مضمون نگاری اور مزاح نگاری میں مصروف ہیں۔ نظیر صدیقی کے مجموعے "شہرت کی خاطر" کو کسی طرح سے بھی انشائیوں کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سیدھے سادے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں۔ نظیر صدیقی دراصل ہمارے اچھے طنز و مزاح نگار ہیں نہ کہ انشائیہ نگار — اس د

انشائیہ کے نام سے جو مختلف انتخابات شایع ہوئے ہیں ان مجموعوں میں بھی ہم کو سوائے انشائیہ نگاری کے سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ در اصل یہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے شگفتہ انتخابات ہیں جن کو مضمون تو بآسانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر انشائیہ ہرگز نہیں۔

اس سال تراجم کی رفتار بہت اطمینان بخش رہی۔ اسٹیفن لی کاک، مارک ٹوئن، وڈ ہاؤس، ہیزلٹ، اسوئفٹ اور ولیم سرویان وغیرہ کے مضامین کے تراجم خاصی تعداد میں پیش کیے گئے۔ ترجمے کے باب میں ل احمد، شاہد احمد دہلوی، عثمان غنی، ابن انشا، ابراہیم رضوی، ضیاالحسن موسوی، ممتاز من فضل صدیقی، لطیف صدیقی، سرینڈر رکمار اور اسرار عارفی کی کوششیں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈائری، رپورتاژ اور خطوط در اصل پیروڈی کی صورت میں زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاصے نمایاں رہے۔

نثر کے مقابلے میں در اصل شعر و شاعری کے میدان میں زیادہ گرمی، جوش اور چہل رہی۔ جوش، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، کوکن، شاد عارفی دلاور فگار، ابوالمجاہد زاہد، قاضی غلام محمد، اے ڈی اظہر، نذیر احمد شیخ، ماچس لکھنوی، مسٹر دہلوی، ش ق کبھرائچی، ظریف جبلپوری، شہباز امروہوی، رئیس امروہوی، مرزا محمود سرحدی، اور علامہ پاکٹ مار وغیرہ برابر اچھی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ راجا مہدی علی خاں اور قاضی غلام محمد کے نئے مجموعۂ کلام کے علاوہ دلاور فگار کی ستم ظریفیاں، اے ڈی اظہر کی لذت آوارگی، ظریف جبلپوری کا فرمان ظرافت، ابوالمجاہد زاہد کا رنگ و تازہ، ناشاد کا کلام بے لگام، کلام لق لق (حاجی لق لق کے کلام کا نیا ایڈیشن) اس سال شایع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سعدا، غالب اکبر اور شاد عارفی وغیرہ کے شعری مجموعے پاکٹ بکس کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ پاکٹ بک والوں نے طنزیہ غزلیں اور نظمیں اور مزاحیہ غزلیں اور نظمیں کے عنوان سے دو انتخابی مجموعے بھی پیش کیے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں میں ایک تو سنجیدہ نگارشات اور مروت کا دخل ہے دوسرے تاریخ اور معیار کا احساس ناپید ہے۔

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق کا خاصا کام ہوا ہے ڈاکٹر وحید قریشی (اکبر اور نئی علامات) ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ نگاری، پطرس اور حاجی بغلول) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح) — لبیب احمد انصاری (ہمنفسان رفتہ) مظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز، ممتاز حسین ایک نیا مزاح نگار) طفیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت، احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار۔ ایک نیا طنز نگار) ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت، اردو کے مزاحیہ کردار، ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے) کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبد السلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان سب کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوس ناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے ان میں نئے لطائف کی پھلجھڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بھی برابر دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجھڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصر الدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم از تبسم، قہقہے اور نرم گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بہ کثرت ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی ناہمواری کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حمید، پران، انجم، شنکر، سابیر، عزیز، احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون کاروں نے اپنے نرم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست، ادب، فلم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، لیڈر ساربان، ٹیڈی ازم، سیاست، لیڈری، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی صوبائی اور مقامی ارباب حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، فیشن کے مارے، بوہیمی، قومی یکجہتی، امن عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانیوالے، غذا میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکس پر ٹیکس لگانے والوں کی

(باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

## مخمور سعیدی

اجنبیت بہم اس درجہ کہاں تھی پہلے
تھی وہاں بھی وہی صورت جو یہاں تھی پہلے

اب اک آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
چشمِ تر تھی کہ جواہر کی دکاں تھی پہلے

وہ فسونِ نگہِ ناز، ارے کیا کہنا
ٹھہری ٹھہری یہی عمرِ گریزاں تھی پہلے

بن گئی کلفتِ دل تلخیٔ جاں کیا کہیے
جو نظر راحتِ دل عشرتِ جاں تھی پہلے

کر دیا آبلہ پایانِ جنوں نے سیراب
خاکِ ہر دشت و چمن، تشنہ دہاں تھی پہلے

یہ نتیجہ ہے ترے غم سے سبکدوشی کا
زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

اب بھنور بن کے ڈبونے کو جو بیتاب ہوئیں
کشتیٔ دل انھیں موجوں پہ رواں تھی پہلے

زندگی بھر کے لیے روگ بنی جاتی ہے
اک خلش سی جو قریبِ رگِ جاں تھی پہلے

کتنی محجوب سی دنیا کی طرف اٹھتی ہے
وہ نظر جو تری جانب نگراں تھی پہلے

ہم اک امید پہ بڑھ آئے ہیں آگے مخمور
ورنہ دنیا وہیں اب تک ہے جہاں تھی پہلے

---

## مولوی محمد افضلی

بیزار مجھ سے گرچہ رہا کیجیے گا آپ
میرا ہی ذکر سب سے سوا کیجیے گا آپ

مانا کہ دور دور رہا کیجیے گا آپ
لیکن نہ ضبط ہوگا تو کیا کیجیے گا آپ

آئینے میں نہ جانیے کیا دیکھ دیکھ کر
احساسِ غم کو ٹول دیا کیجیے گا آپ

ہوگا نہ اضطراب بظاہر مرے لیے
دل میں تو بے قرار رہا کیجیے گا آپ

بستر پہ بار بار بدلیے گا کروٹیں
راتوں کو چپکے چپکے دعا کیجیے گا آپ

کیجیے گا بار بار بھلانے کی کوششیں
ہم کو ہمیشہ یاد کیا کیجیے گا آپ

کوشش سے لائیے گا لبوں پر ہنسی مگر
دل ہی جو رو پڑے گا تو کیا کیجیے گا آپ

جب چارہ گر بتا نہ سکے گا مآلِ غم
بچنے کی میرے دل سے دعا کیجیے گا آپ

مجبور ہو کے صبر کی تسکین کے لیے
خود مجھ پہ اعتراض کیا کیجیے گا آپ

تنہائیوں میں میرے تصور کے سامنے
رو رو کے پھر سے عہدِ وفا کیجیے گا آپ

لیجیے مرا سلام وہ دن بھی قریب ہے
جب میری بے رخی کا گلہ کیجیے گا آپ

یہ بد دعا نہیں ہے مگر افضلی کے بعد
بے وجہ سوگوار رہا کیجیے گا آپ

# باب الانتقاد

## جذباتِ نادر (ترقیِ اُردو بورڈ ایڈیشن) پر ایک نظر

رشید حسن خاں

نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی اکتوبر ۱۹۱۲ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر، اور نظم نگاری کی تحریکِ جدید کے قابلِ ذکر نمائندے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، اور اُس طرز کی طبع زاد نظمیں بھی کہیں۔ ان کا ایک ترجمہ "گزرے ہوئے زمانے کی یاد" آج بھی تاثیر و دلکشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ خیال کو زیادہ سے زیادہ سادگی کے ساتھ پیش کرنا، بھاری بھرکم الفاظ اور پرشور اندازِ بیان سے دامن بچانا، اور لفظوں کے انتخاب میں، مرصّع سازی کے بجائے محض ادائے خیال کی ضرورت کا خیال رکھنا، اُن کا خاص انداز تھا۔ اُن کی نظموں میں ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر کے پیشِ نظر طرزِ ادا میں پیچ و خم پیدا کرنے، چونکا دینے والا اندازِ بیان اختیار کرنے، اور مرصّع شعر گوئی کے بجائے، کسی خیال کو پُر فصاحت انداز سے نظم کر دینے کا اصول رہتا تھا۔ اُن کی کچھ نظمیں یقیناً ایسی ہیں، جن کو پڑھ کر آج کے بہت سے نوجوان نظم نگار (جو ابہام و ژولیدہ بیانی کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کے صبر و ضبط کا بھی جا و بے جا امتحان لیتے رہتے ہیں) بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حالی و آزاد کے بعد، جن لوگوں نے نظمِ جدید کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور اُردو نظم کو مغربی خیالات و اندازِ بیان سے آشنا کیا، اور اِس طرح اُس میں وسعت و تنوّع کے مستقل عناصر کا اضافہ کیا اُن میں نادر کا نام بھی ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر اور اُن کے کلام کو پیشِ نظر رکھے بغیر، اردو نظم کا تاریخی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

نادر کی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں الگ الگ چھپا تھا۔ دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا، اس میں ان کی مثنوی "لالہ رُخ" بھی شامل تھی۔ یہ مجموعے مدت سے کمیاب تھے۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے، ترقیِ اردو بورڈ کراچی کی اعانت سے، ۶۱ء میں اِن دونوں مجموعوں کو، ایک جلد میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ نہایت خوب صورت ٹائپ میں چھپا ہے، مضبوط جلد، خوب صورت گرد پوش، عمدہ کاغذ، غرض آرائشِ بیرونِ در کے سارے لوازم سے آراستہ ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اِس کی ترتیب میں ساری ضروری باتوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

بہت سی اچھی کتابیں عموماً بار بار نہیں چھپتی ہیں، خصوصاً کسی پرانے شاعر کا مجموعۂ کلام۔ اب بظاہر دس، پندرہ برس تک اس مجموعے کا دوبارہ شائع ہونا مشکل ہے۔ اِس لیے یہ بہت ضروری تھا کہ اس اشاعت میں حسنِ طباعت کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جاتی کہ نادر کا جو کلام مختلف رسالوں میں منتشر ہے، اُس کو بھی شاملِ مجموعہ کر لیا جائے۔ کلامِ نادر کا دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ نادر کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ دو ڈھائی برس کی اِس مدت میں، انھوں نے جو نظمیں کہیں، وہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ پرانے رسالوں کے فائل روز بروز کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بات کا شدید احتمال ہے کہ نادر کی یہ نظمیں کچھ دنوں کے بعد فراموش ہو جائیں گی۔

کتابیں اس سے پہلے بھی چھپتی تھیں، آج بھی چھپتی ہیں۔ لیکن آج کل کسی کتاب کا نیا اڈیشن شائع کرنے کے کچھ اصول ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ نادر کا یہ مجموعہ ترقیِ اردو بورڈ جیسے معیاری ادارے کی اعانت سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے اِس میں تو ترتیب کے اُن اصولوں کو بہر طور ملحوظ رہنا چاہیے تھا۔ پرانی کتاب کو اُسی طرح چھاپ دینا ایسا معمولی کام ہے، جس کو ہر معمولی سے معمولی پبلشر کر سکتا ہے، برابر اِس کے نمونے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اگر معقول ادارے بھی یہی کرنے لگے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح امتیاز کیا جا سکے گا؟

اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نقل مطابقِ اصل کا اصول، جس کا دعوا کئی جگہ کیا گیا ہے، پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ خاص طور پر صحتِ متن میں۔ متن جگہ جگہ غلط ہے، جس کے سبب سے یہ ضروری ہو گیا ہے، کہ جو لوگ صحیح متن کے طلب گار ہوں، وہ پہلے پرانا اڈیشن ڈھونڈ

سے نئے اڈیشن کی تصحیح کریں، اور پھر پڑھیں۔ پرانا اڈیشن بقولِ مرتب، نایاب کی حد تک کم یاب ہے، اس لیے نتیجہ معلوم !!
اسی طرح جو لوگ یہ چاہتے ہیں، کہ ناندؔ کا مکمل کلام پڑھیں، وہ اس مجموعے کو خریدنے کے بعد مختلف لائبریریوں میں جاکر پرانے رسائل کی ورق گردانی کریں ان نظموں کو نقل کریں، جو اس مجموعے میں نہیں ہیں۔ یہ کوئی میرؔ و سوداؔ کا کلیات تو تھا نہیں، جن کو ہر شخص مرتب نہیں کرسکتا۔ معمولی تلاش اور ضروری اہتمام کیا جاتا، تو مکمل مجموعہ بہ آسانی مرتب ہوسکتا تھا۔ اگر اتنی مشکل پسندی بھی بارِ خاطر ہو، تو اس پھیر میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے !! معمولی پبلشر یہ کارِ نمایاں کرتے ہیں کہ کسی کتاب کو ردی میں سے ڈھونڈ نکالا، یا کسی لائبریری سے لے آئے، اور اس کو حوالۂ کاتب کردیا، نیا اڈیشن بہ آسانی تیار ہوگیا۔
ذیل میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ جو کتابیں شائع ہوں وہ اس آلودگی سے پاک رہیں: تاکہ ایسے اداروں کے معیار و اعتبار پر حرف نہ آئے۔

---

"جذباتِ نادر" حصّہ دوم کے قدیم اڈیشن میں، حصّہ منظومات کے بعد اور مثنوی سے پہلے، ایک صفحے کا "صحت نامہ" ہے، جس میں بارہ غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ نئے اڈیشن میں وہ غائب ہے، اور غلطیوں کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اصولاً، اس اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہیے تھی۔ اگر نقل مطابقِ اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے، ان غلطیوں کو بھی بعینہٖ رکھنا ضروری تھا، تو صحت نامے کو بھی نقل کرنا ضروری تھا۔ ذیل میں قدیم اڈیشن سے اس صحت نامے کو نقل کیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے، صحت نامے میں بائیں طرف نئے اڈیشن کے صفحات اور سطروں کو بھی درج کردیا گیا ہے۔ نیز شروع میں نمبر شمار کا بھی اضافہ کیا گیا ہے:

| شمار | صحت نامۂ جذباتِ نادر | | | | جدید اڈیشن میں | |
|---|---|---|---|---|---|---|
| | صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر |
| | ۷۱ | ۳ | سکا تھا | چکا تھا | ۱۲۶ | ۴ |
| | ۲۴ | ۴ | کوہ طور | فرطور | ۱۳۴ | ۴ |
| | ۳۱ | ۱۳ | محنت | مشقت | | |
| | ۳۵ | ۱۵ | مند | ہند | | |
| | ۳۷ | ۱ | اپنے مال | اپنے بال | ۱۶۱ | ۶ |
| | ۵۰ | آخری | انتظار | انتظام | ۱۸۵ | ۸ |
| | ۵۱ | " | یہ بڑی | ہے تری | ۱۸۷ | ۹ |
| | ۵۴ | " | نام کی | قوم کی | ۱۹۱ | ۱۳ |
| | ۷۹ | نوٹ سطر ۲ | خرف | خزف | ۲۳۲ | ۰ |
| | ۹۱ | ۱۵ | کس جال | کس حال | ۲۴۰ | ۳ |
| | ۹۲ | ۹ | یاد ہو | یاد ہیں | ۲۶۲ | ۳ |
| | ۹۳ | ۱۳ | بہادر | بہادر مرحوم | ۲۶۴ | ۲ |

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کردی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز اڈیشن کے، اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ شمار کے ہے، صحت نامے کے مطابق ہیں۔
، جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

(۲) قدیم اڈیشن میں "کوہ نور" ہے۔ یہی جدید اڈیشن میں ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔ "صحت نامہ" میں اس کو غلط لکھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "کوہ طور" ہے اور یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) یہ تصحیح بھی "صحت نامہ" میں غلط کی گئی ہے۔ قدیم و جدید میں یہاں "محنت" ہے اور ٹھیک ہے۔

(۴) "صحت نامہ" میں یہ تصحیح بھی بے محل ہے۔ شعر میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

(۵) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۶) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔ مرتب نے جگہ جگہ اس کا التزام کیا ہے کہ اگر کوئی لفظ غلط نظم کیا گیا ہے یا قافیہ کہیں غلط ہے، تو حاشیے میں نوٹ دے دیا ہے۔ لیکن یہاں قافیے میں "انتظام" کے بجائے، "انتظار" لکھا ہوا ہے (قدیم اڈیشن کے مطابق) اور اس کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۷) "صحت نامہ" کے لحاظ سے، قدیم اڈیشن میں، "یہ تری" ہونا چاہیے۔ لیکن متن میں "یہ تری آب و ہوا میں گو نہ تاثیر نشاط" درج ہے۔ یہی جدید میں ہے۔ اس لحاظ سے "غلط" کے خانے میں "یہ تری" صحیح نہیں ہے۔ البتہ تصحیح ٹھیک کی گئی ہے۔ یعنی "ہے تری آب و ہوا میں" ہونا چاہیے۔ جدید میں۔ نقل مطابق اصل سے کام لیا گیا ہے۔

(۸) یہ غلطی جدید اڈیشن میں بعینہٖ موجود ہے۔ تعجب ہے کہ مرتب صاحب کو اس مصرع میں کوئی عیب نظر نہیں آیا ع نام کی خدمت سے اپنے کو بچا جاتا تھا میں۔

(۹) یہاں جدید میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۰) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۱۱) صحت نامے میں، "یاد ہو" کے بجائے، "یاد ہیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جدید اڈیشن میں، اس کی صحت نامے کے مطابق تو تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ تصحیح مزید سے کام لے کر، یہاں، "یاد ہوں" لکھا گیا ہے۔

(۱۲) جدید میں تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

---

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے، کہ جدید اڈیشن میں جگہ جگہ متن غلط ہے۔ اور اس سلسلے میں بے حد بے احتیاطی یا بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے کچھ مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

| جدید اڈیشن میں | قدیم اڈیشن میں |
|---|---|
| یہ جس میں ہو آب دار (ص ۲۴۰) | جس میں ہے |
| میں آپ کی لگتے ہوں (ص ۲۵۰) | میں آپ ہی |
| اب خبط یا وہ گوئی دور و دراز (ص ۲۵۰) | یا وہ گردی دور و دراز |
| شب غم نیند بھی اول تو (ص ۲۵۵) | نیند ہی اول تو |
| آہ بھی تیر ہے گر آہ ہو تاثیر کے ساتھ (ص ۲۵۷) | گر آہ ہے |
| گویا ندیا بہتی جاتی ہے (ص ۱۸۲) | گویا دنیا (یہ نظم رسالۂ زمانہ مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دنیا کے بجائے کشتی ہے) |
| سارنگی کی تال وہ سریلی (ص ۲۹۱) | تان وہ سریلی |
| بگولوں میں ہوا کے اڑتی ہیں اور پھڑ پھڑاتی ہیں (۲۰۹) | پھر پھراتی ہیں۔ |
| بھی اک کھیپ آئی ہے ابھی اک آنے والی ہے (ص ۱۷۶) | ابھی اک کھیپ آئی اور ابھی اک آنے والی ہے |
| اور اک کھنڈر لا نہ کہ تھا وہ گنبد افراسیاب (ص ۱۴۱) | اور اک کھنڈر کہ تھا وہ |

اتنا کہ اس میں سوز ہے (اور) اس میں ساز ہے (ص ۲۵)

قدیم میں لفظ اور موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو قوسین میں کیوں لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا قدیم میں اور نہیں تھا مرتب نے اضافہ کیا ہے۔

اچھا ہے بہت ہندو مسلماں کا نفاق

قدیم میں۔ لفظ بہت نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اس کو قوسین میں لکھنا چاہیے تھا۔

ص ۲۳۹ پر حاشیے میں یہ عبارت بھی موجود ہے:" ۲ حاشیہ از نادر، رشی و الملیک"۔ یہ عبارت قدیم اڈیشن میں نہیں ہے۔ البتہ ۲ کے تحت جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ قدیم میں موجود ہے (یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ نظم جولائی سنہ کے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلا حاشیہ بھی نہیں ہے۔)

---

مرتب نے یہ اہتمام کیا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ غلط نظم ہوا ہے، یا اور کوئی فروگذاشت ہوگئی ہے، اُس کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں یہ التزام قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس سے عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ گویا مرتب کی رائے میں ان مقامات پر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے! ایسے چند مقامات درج ذیل ہیں۔

ص ۲۴۳ پر رباعی کا ایک مصرع ہے۔ "ٹوٹی ہوئی شیشہ کی رہی ہے جھنکار"۔ قدیم میں بھی" ٹوٹی ہوئی" لکھا ہے۔ نقل مطابقِ اصل، کی دھن میں یہ نہیں دیکھا گیا، کہ یہاں " ٹوٹے ہوئے" کا محل ہے۔ اگر قدیم کتابت میں تصرف شایانِ شان نہ تھا، تو کذا ہی لکھ دیا جاتا۔

ص ۷۷، پر ایک شعر ہے ؎ خم و مینا میں تلچھٹ کیا کہ اک آخور باقی ہے ٭ مگر مستوں کے دل میں شوق ابھی بے طور باقی ہے۔ اس شعر میں لفظ بے طور پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے۔

" آخور میں واو مجہول ہے۔ دوسرے طور، میں معروف ۔ مرتب ۔ م"

مجھ کو اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے کہ میں یہاں "بے طور" میں طور کو بہ فتح اول سمجھتا تھا، اب معلوم ہوا کہ یہ بہ ضم اول ہے اور بہ واو معروف، سبحان اللہ!! اس سے قطع نظر کر کے یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حاشیے کی عبارت مفہوم سے بے نیاز ہے۔

ص ۷۵، پر یہ مصرع ع یہ رفتگانِ خاک جن کی تمام عمر ـــ صریحاً ساقط الوزن ہے۔ اور اس پر کوئی نوٹ نہیں ہے۔

ص ۷۷، پر مندرجہ ذیل بند بھی ہے۔

کیا ہے بشر ایک خوشنما طائر ہے مجبور کبھی کبھی بہ زور آور ہے
نالاں ہے کبھی بار زمیں کے نیچے اور زمزمہ ساز یہ بھی اس پر ہے

مرتب نے کئی جگہ حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ یہاں قافیہ صحیح نہیں ہے۔ حرکات بدل گئی ہیں، لیکن طائر، اور زور آور میں اُن کو کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی۔

ص ۳۰۲ پر، ایک مصرع ہے، ع افسوس اک بات دو کئی جزبات ۔ مرتب نے لفظ جز سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے "کذا"۔ گویا یہ لفظ جز ان کی رائے میں صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں " جزبات " جزوی بات کے مفہوم میں ہے اور صحیح ہے۔

اسی صفحے پر ایک مصرعہ ہے ع ایک شکوہ ایک بے اصل بات ـــــ اس پر مرتب نے نوٹ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نادر نے یہاں قافیے میں لفظ اصل کو تلفظِ عام کے مطابق نظم کیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ابتدائے مصرعہ میں لفظ ایک نے مصرع کو ساقط الوزن بنا دیا ہے یہ تنبیہ کا محل ہے۔

---

صحت املا اور یکسانیت املا کا حال سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں میں، اس کا بھی اہتمام نہیں کیا جا سکتا! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

املا میں یکسانیت کی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ایک لفظ جا بجا ایک طرح ہے، دس جگہ دوسری طرح، مثلاً۔

مجکو ص ۔ ۱۰۱، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۵ مجھکو ص ۔ ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۳ مجھ کو ص ۱۳۴، ۱۵۵

مجکو ص ۱۳۵ تجکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، تجھ کو ص ۹۱، ۱۴۵
اسکو ص ۲۲۰ اس کو ص ۲۳۳
ڈھونڈھتا ص ۱۲۶، ۱۲۸، ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املا کی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن کے آخر میں ایک ھ زائد ہے۔

آنکھہ ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھہ ص ۹۰، ۱۳۰ — سانجھہ ص ۱۲۷ — نتجھہ ص ۱۲۸، ۱۳۲
مجھہ ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھہ ص ۱۲۹ — کچھہ ص ۱۳۳ — تجھھی ص ۱۴۰ — ھاتھہ ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی ہی بہتات ہے جتنی امانت کے یہاں ضلع جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف ھ کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں ھ ہونا چاہیئے، اور غائب ہے مثلاً ڈیوڑھی ڈیوڑی بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف ھ کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی شائع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

---

منشی فخرالدین سفیر کاکوروی، نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا — اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے بطور تعارف لکھا ہے:

" نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت "

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر کاکوروی[1] اور صفیر بلگرامی[2] میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے "صفیر از کاکوری" مقدمے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے: "اس مجموعے میں صفیر کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، البتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

---

مرتب نے کئی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابقِ اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو تین مثالیں، محض اثباتِ مدعا کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۲۷۱ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سرورق) گویا اس صفحے پہ قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ (۱) شروع میں لکھا ہوا ہے: "مثنوی لائٹ آف دی حرم"۔ جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں "مثنوی لالہ رخ" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف "لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۷۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بجز شمار صفحات) اگر نقل مطابق اصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدیم فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان "اسباب ملال" اور "نورمحل کی خوش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[1] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[2] صفیر بلگرامی کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ھ میں ہوا ہے (۱۸۸۹ء) تاریخ لطیف (قلمی۔ کتاب خانہ رام پور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے۔ جس کا آخری شعر یہ ہے:

کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال ٭ لو ہوئے جا کے اب صفیر، روح الامیں کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافہ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطرِ اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "خمخانہ میں میرے جشنِ احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحے پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۶، ۷ پر فہرست مضامین حصۂ دوم ہے۔ ص ۷ کے آخر میں، توسین میں لکھا ہوا ہے، (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول) اس کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔

شمارۂ ۴۳ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں، اس کے بجائے یہ عبارت ہے "تاریخِ دیوان ملک الشعرا امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

---

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصریحات یا اُن سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں، جن کو مقدمے یا حواشی میں اگر پیش کیا جاتا، تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔ ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم و جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلامِ نادر کا حصۂ دوم اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے:۔

(" انسان بطنِ قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلایشاتِ دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گناہگار اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔"

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانونِ قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں۔ اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ نادر)

۱۹۲۵ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیا نرائن نگم نے "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں۔ متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے:۔

"جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستانِ ربیع" "نادر منہ" "دعوتِ گل" "شعاعِ امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محبِ وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ برس کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء[1] میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اور وہ شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرزِ جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبولِ عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلۂ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر اپنے زورِ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادرِ خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا۔ جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔"

---

[1] زمانہ میں یہاں ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا، جس کا پہلا جملہ یہ ہے "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا"

رسالۂ الناظر (لکھنؤ) کے شمارۂ فروری ۱۹۱۳ء میں تین "قطعات تاریخ وفات نادر" شائع ہوئے تھے جن کے تاریخی مصرعے درج ذیل ہیں:

شاعرِ بے مثل و دمساز جہاں　　(موسیٰ حسین اختر جلال آبادی)

اب سدھارے سوئے جنت نادرِ کاکوروی [۱۳۳۰ھ]　　(الٰہی بخش ناشر)

رو رو کے لکھ رہے ہیں۔ تاریخ موت نادر [۱۳۳۱ھ]　　(محمد صدیق خاں رعد جونپوری)

ص ۲۰۱ پر ایک نظم ہے بہ عنوان "آہ یہ ہوگا" [۱۹۱۲ء]۔ یہ نظم مخزن کے شمارۂ اگست ۱۹۰۷ء میں "فنا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

---

نادر کے کلام کا دوسرا حصہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا، اُن کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے۔ ان ڈھائی سال کی مدت میں اُنھوں نے جو نظمیں کہیں وہ مختلف رسالوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اس جدید اڈیشن میں اُن کو شامل کر لیا جاتا۔ کیونکہ قدیم رسالوں کے فائل اب ہر جگہ بہ آسانی نہیں ملتے ہیں۔ اور کچھ دنوں کے بعد، یہ بہ مشکل بھی نہیں ملیں گے۔ ذیل میں ایسی نظموں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، جو میری نظر سے مختلف رسائل میں گزری ہیں۔ میں یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ان نظموں کے علاوہ ان کی کوئی نظم اور نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بالاستیعاب رسائل کا جائزہ لے، تو ایک دو نظموں سے زیادہ کا اضافہ شاید نہیں ہو سکے گا۔ میری نظر میں بہرحال اِن نظموں کے علاوہ اُن کی کوئی نظم نہیں ہے۔

(۱) صحیفۂ فطرت　　زمانہ، فروری ۱۳ء
(۲) سوزِ عشق　　زمانہ، شمارۂ ستمبر و اکتوبر ۱۴ء
(۳) سیرِ دریا　　ادیب، جنوری ۱۱ء
(۴) سہ مصرعی　　مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء
(۵) امامباڑۂ لکھنؤ　　زمانہ، جولائی ۱۲ء
(۶) پروانۂ جاں سوز　　زمانہ، جون ۱۵ء
(۷) سوزِ پروانہ　　زمانہ، جولائی ۱۵ء
(۸) جلوۂ امید　　زمانہ، اگست ۱۴ء
(۹) نپولین اور کمسن جہازی　　زمانہ، جنوری ۱۱ء
(۱۰) غزل　　زمانہ، اکتوبر ۱۳ء
(۱۱) سالِ گذشتہ　　زمانہ، جنوری ۱۲ء
(۱۲) غزل　　الناظر، مئی ۱۱ء
(۱۳) سہرا　　زمانہ، فروری ۱۲ء
(۱۴) یاد دہانی بہ طرزِ احسن　　زمانہ، اپریل ۱۳ء
(۱۵) تحفۂ تہنیت　　زمانہ، فروری ۱۲ء
(۱۶) قصیدۂ تہنیت در بارشاہی　　زمانہ، دسمبر ۱۱ء
(۱۷) دلی دربار　　ادیب، دسمبر ۱۱ء

اس خیال سے کہ یہ نظمیں یک جا ہو کر محفوظ ہو جائیں اور اگر کوئی شخص نادر کے مکمل کلام کو دیکھنا چاہے، تو اس کو دقت نہ ہو۔ یہ نظمیں نقل کی جاتی ہیں۔ اُن کے دورِ آخر کی اِن نظموں میں، بعض نظمیں چستیِ بندش اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں مثلاً صحیفۂ فطرت کے یہ شعر دیکھیے

یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری　　چپے چپے پہ یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجریانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے
اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی — جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

---

## صحیفۂ فطرت

"برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے — کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے
یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری — چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے
شاعری ہے وہ متاعِ کلیاتِ کائنات — جس پہ اہلِ الرائے کے اقرار ہیں لکھے ہوئے
دفترِ عالم کی نظم آرائیوں پہ کر نظر — صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے
دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کاہ کاہ — برگِ گل مثلِ خطِ گلزار ہیں لکھے ہوئے
خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجریانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے — کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر، دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
یہ گھٹائیں اودی کالی کیا ہیں سائن بورڈ ہیں — جو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بہ جا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

---

## سوزِ عشق

آ او اے عشق، اے محبت کے شرارِ بے قرار — آتشِ پنہاں کے اُف اے شعلۂ سیماب وار
اے خدنگِ عشق اور اے نشترِ سینہ فگار — تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خوننا بہ بار

کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیِ فانی مری، میرا وجودِ دردمند — تھے اسی قابل کہ ہوں میرے جداسب بند بند
شکر ہے یہ التجائے معنوی آئی پسند — باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے ہاتھوں سے گزند

---

؎ قطعاتِ تاریخِ وفات (نادر)

آہ اے بزمِ جہاں کے شمعِ شب افروزِ عشق
اے شرارِ برق تاب اے شعلۂ جاں سوزِ عشق

اک مرقع ہے عدم کا جلوۂ ہستی مرا
مٹ گیا جب، اپنی اصلیت سے جاکر مل گیا
یعنی جب تکمیل کو پہنچا تو میں کچھ بھی نہ تھا
میری ہستی اک دھواں ہے شعلۂ جوّالہ کا

نغمہ زا ہے اب صدا میرے شکستِ رنگ کی
وسعتِ ہستی ہے وسعت میرے قلبِ تنگ کی

(زمانہ، شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء)

# سیرِ دریا

سیرِ دریا، لطفِ کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی
بڑھ چلی حد سے، جوانی جوش پر آئی ہوئی
دستہ ہائے گل سے، کشتی کو بناکر مہدِ گل
لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا
بوندیاں پڑتی ہیں یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا
بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم
پنکھیاں پھولوں کے گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم
لیتی ہے نظارۂ ہر برگ میں لذت نگاہ
چاٹتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ
جس طرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں
کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دستِ نازنیں
کشتیِ چشمِ طراوت آشنا سے کود کر
تیرتی ہے سبزۂ موّاجِ ساحل پر نظر

دور، کوسوں دور، جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں، گرتی ہیں مرغابیاں
اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اک جواں
خوب اک مہ پارۂ لذّت خیز بھی پہلو میں ہے
آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے
ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ
وہ گلابی آنکھ، وہ نشّے میں متوالی نگاہ
بے خودی میں زانوئے عاشق دبائے پیار سے
اور وہ سینے پر اُس کے سر جھکائے پیار سے

عالمِ خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطفِ سیر و لطفِ وصل و لطفِ نا و نوش ہے

اے ہوس آلودہ، اے لذت کشِ آغوشِ یار
چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار
چین ہے کیا! درحقیقت چین اسی کا نام ہے!!
کیا شباب چند روزہ کا یہی اک کام ہے!!
عیش کہتا ہے اِسے!! سمجھا نہ تو مفہومِ عیش
تیرتی ہے بحرِ غم پر کشتیِ موہومِ عیش
تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز
کشتیِ عمرِ رواں، اِس سے کہیں جاتی ہے تیز
بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک
ٹھہر کشتی پھیر، ہتے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک

زورِ طوفاں ہے، کہیں گرداب میں تو آنہ جائے    دیکھ، ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حبابِ بحر کے مانند انجامِ حیات    ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جامِ حیات
اے حبابِ بحر اے پروردۂ آغوشِ موج    تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بردوشِ موج
لذتِ گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ ابھرا ڈوب کر اس بحر میں
دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر    اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہٹ، پھیر رُخ کشتی کا، ناداں لوٹ آ    جان دینے کو نہ جا، اے دشمنِ جاں لوٹ آ
دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں    آ، تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی، خیر، جاتا ہے تو جا    اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا
جا، پر اس آغازِ الفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو، ساحل پہ تجھ کو شام ہو    (ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء)

## سہ مصرعی[1]

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا    جہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا
یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا    یہ فرشِ معطر ہے سب چار دن کا
تو خاک۔ لحد کا بچھونا ہی اچھا
بھری تلخیوں سے ہے یہ جانِ شیریں    سم آلودہ ہے پارۂ نانِ شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا
تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے    زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم، ہمارا نہ ہونا ہی اچھا
کہے جا اسی طرح اشعار نادرؔ    نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادرؔ
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء)

---

[1] سب ایڈیٹر مخزنؔ (لاہور) غلام محمد طورؔ نے، نادرؔ کی موت پر، ایک مضمون مخزنؔ شمارہ نومبر ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا، اس کے آخر میں یہ سطریں بھی ہیں:۔

"دنیا کے مصائب اور زمانے کے حوادث سے، جو پے در پے آپ کو پیش آئے، آپ کی طبیعت زندگی سے اچاٹ ہو گئی تھی چنانچہ حالتِ بیماری میں ذیل کی سہ مصرعی سے، جو ستمبر کے پرچہ میں "کلامِ نادر" کے عنوان کے نیچے درج ہو چکی ہے، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔" اس کے بعد مندرجہ بالا سہ مصرعی نقل کی گئی ہے۔

# بڑا امامباڑہ لکھنؤ

اے عنادیرِ اودھ، اے یادگارِ لکھنؤ          اے گلِ پژمردۂ رفتہ بہارِ لکھنؤ
تیرے گنبد کا کلس ہے طرۂ تاجِ اودھ          اور ترا گنبد ہے چترِ زرنگارِ لکھنؤ

ہر عمارت کو اودھ تجھ سے لڑا کر توڑ دے          ہر محل کو تیری اک ہلکی سی ٹھوکر توڑ دے
فاتحِ اقلیمِ تعمیرات ہے لاریب تو          ایک آئینہ ترا سدِّ سکندر توڑ دے

رومی دروازے کی رفعت پر، یہ ہے چکر میں عقل          سر اُٹھا کر جس نے دیکھا، اس کو چکر آگیا
اس طرح ہے سر اٹھائے تیری مسجد کا کلس          آسماں کا چتر ہے گویا تجھی پر گھومتا

آہ یہ طوطے نہیں، روحیں ہیں بہرِ بازدید          آئی ہیں جنت سے پہنے حلہ ہائے سبز فام
اور طے کر کے مسافت عالمِ ارواح کی          تیرے میناروں پہ دم لینے کو کرتی ہیں قیام

آ کے گرتے ہیں ترے گنبد پہ جب غولِ طیور          اور جب وہ چہچہاتے ہیں ترے مینار پر
آہ! کس حسرت سے گھنٹوں دیکھتا ہوں میں انھیں          اور مجھے اس محویت میں تب یہ آتا ہے نظر

صحنِ مے خانہ میں کی آراستہ ساقی نے میز          چُن کے کچھ کنٹر سنہرے اور کچھ جامِ بلور
ناگہاں پریاں فضائے نیلگوں سے آ گریں          اور ہو کر مست، نغمہ زن ہوئیں مثلِ طیور

پھر شفق نے پھوٹ کر برسا دیا جب سرخ رنگ          لے کے بیٹھا گود میں پھولوں کی کشتی آسماں
چاندنی میں پھول مہکے اور تارے کھل گئے          پھُر پھُرا کر آ گریں لاکھوں سنہری تتلیاں

صبح دم کی شاہِ جاپاں نے جو روشن ماہتاب          اور دنیا جگمگا کر بن گئی ارژنگِ چیں!
میں نے دیکھی پھوٹتے گردوں سے فواروں کی طرح          ہر کلس سے تیرے برجوں کے شعاعِ آتشیں

دن کو کچھ ہے لطف تیرا، شام کو کچھ، شب کو کچھ          تیرے ہر انداز میں آہ اک ادائے تازہ ہے
کیا تری آرائش، اپنے آپ مشاطہ ہے تو          صبح گلگونہ ہے تیرا، شام تیرا غازہ ہے

اے اودھ کی جان، اے روحِ روانِ لکھنؤ          یادگارِ آصفِ خلد آشیانِ لکھنؤ
سو بناؤ کا مرقع کش ہے اک ترا بگاڑ          ہے تری اک بے نشانی سو نشانِ لکھنؤ

آہ کب تک حسرتِ نظارۂ چشمِ طیور　　کاش اک شب ایسی ہم کو بھی دکھائے آسماں
میری آنکھوں کی سپیدی پھیل جائے اور تجھے　　لے بغل میں، مثلِ آغوشِ فضائے آسماں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۲ء)

# پروانۂ جاں سوز

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ　　اور ہے اس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ　　جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

بجھ گیا دل میرا شمعِ دل فروزِ عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کا سوزِ عشق سے

خلق کہتی ہے مجھے، یہ ہوش سے بیگانہ ہے　　عقل سے خارج ہے یہ، بے ہودہ ہے، دیوانہ ہے
جانتا ہے مجھ کو لیکن خوب جو فرزانہ ہے　　میری ہستی آہ عکسِ جلوۂ جانانہ ہے

رنگ چہرے سے اڑا جب نکہتِ گل ہو گیا
دم جو نکلا، نالۂ منقارِ بلبل ہو گیا

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی　　یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے افتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی　　ہے خوشی سنت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے روحِ بلبل کا قرار

جس طرح اک قطرہ، گرد اس کے محیطِ شش جہات　　جس طرح ساغر میں جھلکے قطرۂ آبِ حیات
گرد میرے حلقہ زن ہے کائنات (کذا)　　عشق کیا ہے اک متاعِ کلیاتِ بے ثبات

قطرۂ پر جوشِ طوفاں خیز، می ریزد ز عشق
شعلۂ خاموشِ عالم سوز، می خیزد ز عشق

میرے سر میں کیا ہے، بس اک شعلۂ عشقِ جنوں　　میرے دل میں کیا ہے، جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
میری ہستی کیا ہے، اک ریزۂ خسِ آتش دروں　　میں اناالحق گو ہوں میں منصور ہوں، میں نور ہوں

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن میرے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن میرے لیے

جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ　　جس طرح کوسوں تلک اڑتی پھرے خوشبوئے باغ
تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ　　ڈھونڈھتی ہے میری مضطر روح پروازِ فراغ

سبزہ و گل بن کے کاش اس خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پہ پھیل جاؤں

(زمانہ، جون ۱۹۱۵ء)

# سوزِ پروانہ [۱]

سر میں پروانے کے ہے اک شعلۂ جوشِ جنوں     اُس کے دل میں کیا ہے؟ جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
اُس کی ہستی ہے متاعِ صد طلسمات و فسوں     پھونک دے خرمن، یہ وہ خس ریزہ ہے آتش دردل

اُس کے بال و پر ہیں مثلِ شمع جلنے کے لیے
اور کلیجہ اُس کا شعلوں پر پگھلنے کے لیے

شعلہ زن ہے اُس کے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ     اور ہے اُس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلھن کا سہاگ     جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

عشق جل بجھتا ہے خود، سارا زمانہ پھونک کر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونک کر

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی     یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ، موت ہے فرہاد کی     ہے خوشی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے، روحِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ، پروانہ اِس سے سادہ ہے     موت کا عاشق ہے، ہر دم مرگ کا دل دادہ ہے
مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے استادہ ہے     المدد اے آرزوئے مرگ! وہ آمادہ ہے

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اس کے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اس کے لیے

نادر آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں     بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں
سوزِ حسرت سے، مرے دل سے نکلتا ہے دھواں     ہر نفس میرا صدا دے صاف دیتا ہے کہ ہاں! ہاں!

پھونک دے اے عشق تو اِس ہستیِ خاشاک کو
اور اُڑا دے ہاتھ اٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈھتی ہے روحِ مضطر میری پروازِ فراغ     تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ     جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ

سبزۂ و گل بن کے، کاش اس خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء)

---

[۱] اس نظم کے تین بند، دوسرا، تیسرا، اور آخری، "پروانۂ جاں سوز" میں بھی موجود ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ، کہ دوسرے بند کے آخری دو مصرع، بدلے ہوئے ہیں، اور آخری بند میں مصرعوں کی ترتیب مختلف ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا، کہ نادر کی نظم، "شرابِ لعالمین" کا پہلا بند، "مثنوی لالہ رخ" کے "نغمۂ تمہید" میں پہلے بند کی جگہ موجود ہے۔ "نغمۂ تمہید" رسالۂ زمانہ بابتہ فروری سنہ ۱۹۱۰ء میں "سوزِ عشق" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس اختلاف کے ساتھ کہ "نغمۂ تمہید" کا چھٹا بند، اس میں نہیں تھا۔

# جلوۂ امید

ہو چکا ہے آہ جس مظلوم پر فتوائے قتل — گاتی ہے کانوں میں امید اُس کے گا بانگِ نوید
اور جب صدموں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل — جوڑتی ہے اپنے دامن میں انھیں رکھ کر امید

منزلِ ہستی میں امید ایک ایسی شمع ہے — راستہ چلتے ہیں جس کو دیکھ کر سب رفتنی
پھیلتی جاتی تشبِ غم کی ہے جتنی تیرگی — تیز ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اُس کی روشنی

(زمانہ، اگست ۱۹۱۴ء)

# نپولین اور کم سن جہازی

بولن پہ جب چڑھ آیا جرار فوج لے کر — شاہِ نپولین سا جرار حملہ آور
اور ہو گئی مسلح اک بار سب رعایا — کٹ مرنے کو ہر آزاد انگریز مستعد تھا
کتنوں نے جان دے دی مردانہ وار لڑ کر — کتنوں کو لے گیا وہ زندہ پکڑ دھکڑ کر
من جملہ اُن اسیروں کے ایک نوجواں تھا — ظاہر میں بھولا بھالا اور نیک نوجواں تھا
لیکن بھرا تھا سودائے حبِ وطن کا سر میں — سوزِ غمِ غریبی تھی شعلہ زن جگر میں (کذا)

کیا جانیے سمندر پار اور گھر پہنچ کر — اور اپنے ملک میں با فتح و ظفر پہنچ کر
جب حلقۂ غلامی سب کے گلے میں ڈالا — اس ایک نوجواں کو آزاد کیسے چھوڑا
شاہِ نپولین نے دانستہ درگذر کی — یا یہ کہ کم سنی پہ مظلوم کی نظر کی
کوئی سبب ہو، لیکن وہ مطلق العناں تھا — بے روک گھومتا تھا، بے قید و بے نشاں تھا
گھنٹوں سکوت میں وہ ساحل پہ بیٹھ جاتا — سر اپنا پکڑے پہروں منزل پہ بیٹھ جاتا
مرغابیاں جو اُڑ کر سوئے غروب جاتیں — اور نیلگوں فضا میں وہ جا کے ڈوب جاتیں
اُڑنے کا اُن کے پہروں انداز دیکھتا وہ — حسرت سے اُن کی گھنٹوں پرواز دیکھتا وہ
کہتا تھا وہ کہ طوفاں میں نصف شب کا پہرا — آزادیٔ غریبی سے لاکھ درجہ اچھا
ممکن ہے کوئی تختہ طوفان میں بہہ آتا — اور صبح ہوتے مجھ کو میرا وطن دکھاتا

بے چین اس تفکر میں ایک شب رہا وہ — اور صبح ہوتے تھک کر غافل سا سو گیا وہ
کیفِ غنودگی میں اُس نے یہ خواب دیکھا — سوئے دیار اپنے گویا در رکاب دیکھا (کذا)
گویا کہ ایک تختہ ساحل پہ آ لگا ہے — اور شاد شاد اپنے گھر کو وہ جا رہا ہے
چونکا تو واقعی اک تختہ رُکا ہوا تھا — اور اُس کے خواب کی وہ تعبیر دے رہا تھا
جلدی سے گھس کے پانی میں تختے کو اٹھایا — اور کھینچ کر بہ عجلت اک کھوہ میں چھپایا

ہر روز پا کے موقع، اُس غار میں وہ جاتا
اور شام کو نکلتا، کیا جانے کیا بناتا

اس مشغلے میں اُس کو گذرے کئی مہینے
لیکن نہ بھید اُس کا پایا کبھی کسی نے

آخر کو ہو گیا فاش اک صبح راز اُس کا
جب بن بنا کے نکلا باہر جہاز اُس کا

تیری پناہ یارب، جانوں کی خیر کرنا
دانستہ ڈوب مرنا تھا جس پہ سیر کرنا

کیسا جہاز جس کا اسلوب تھا نہ کینڈا
پتوار تھی نہ جس میں، کمپاس تھا نہ پیندا

جس میں نہ بادباں کا مستول کا پتا تھا
مردہ بہانے کی تھی ٹکٹی، جہاز کیا تھا

قسمت میں کیا لکھا ہے یہ کون جانتا تھا
واں اس ذلیل بیڑے کا ناخدا، خدا تھا

---

اِس شان سے بہادر آمادۂ سفر تھا
اک بانو تھا زمیں پر اور اک جہاز پر تھا

آ نکلا پہرے والا ناگہ کوئی اُدھر سے
اور دیکھتے ہی کھینچا اس کو جہاز پر سے

رسّی سے باندھ کر اور اچھی طرح جکڑ کر
آگے نپولین کے لایا اسے پکڑ کر

اور ہاتھ جوڑ کر کی عرض، اے حضورِ عالم
جبروت تیرا شاہنشا ہوں کے دل پہ قائم

رکھا تھا اِس کو تو نے آزاد از غلامی
اِس کے عوض میں اس نے کی یہ نمک حرامی

بے انتظارِ حکم شہ اور اذنِ شاہی
یہ بے تمیز اپنے گھر کو ہوا تھا راہی

گر میں پہنچ نہ جاتا، تو یہ نکل چکا تھا
اِس کا جہاز بولن کی سمت چل چکا تھا

سُن کر نپولین نے حیرت میں آ کے پوچھا
"اِس کا جہاز میرے ساحل پہ کیسے آیا

میں پوچھتا ہوں پہرے والے کدھر گئے تھے
کیا اک سرے سے سب کے سب آج مر گئے تھے

ہر چند کام کرتے اِس وقت تھک گیا ہوں
لیکن چلو بتاؤ، میں چل کے دیکھتا ہوں"

بولا سپاہی جی ہاں اس کو ضرور دیکھیں
وہ دیکھنے کے قابل بھی ہے، ضرور دیکھیں

یہ واقعہ حقیقت میں اک عجیب ہی تھا
خود پا پیادہ آیا، ساحل قریب ہی تھا

نزدیک آ کے پوچھا لنگر کہاں ہے اُس کا
وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا، وہ بادباں ہے اس کا

چھیچھڑا سا اک ہوا کے جھونکوں میں ہل رہا تھا
اور نیلگوں فضا میں تارا سا کھل رہا تھا

اچھی طرح سے دیکھا اس کو قریب جا کر
اور نوجوان مجرم سے بولا مسکرا کر

"بے وجہ کی نہیں ہے اس درجہ بے قراری
بولن میں کوئی بے شک معشوقہ ہے تمہاری

آمادہ خودکشی پر تم کو کیا نہ گھر نے
تم چاہ میں اُسی کی جاتے تھے ڈوب مرنے"

بولا وہ لڑکا شرما کر اور سر جھکا کر
میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری بندہ پرور

معشوقہ ہے نہ میری کوئی نہ یار میرا
مجھ کو نہ کر رہا ہے مضطر دیارِ میرا

جو اک عزیز اور اک پیارا مرا وہاں ہے
وہ میری ایک بوڑھی بے کس ضعیف ماں ہے

میں اس کے دیکھنے کو بے چین ہو رہا ہوں
مردہ بدست زندہ، اِس ملک میں پڑا ہوں

سُن کر نپولین کا دل رحم سے بھر آیا
اور اُس کی راست بازی کا اُس کو باور آیا

دل میں کہا کہ کتنا ہے یہ بھی نیک لڑکا
ہو ہر شریف ماں کے ایسا ہی ایک لڑکا

خوب اس کی پیٹھ ٹھونکی، خوب اس کو شاباشی دی — گھر جانے کی اجازت اس کو بعد خوشی دی
کچھ نقد اس کو دے کر، اور اک نشان دے کر — پہنچا دیا خود اپنی ہی کشتی پر اسے گھر
کہتے ہیں اکثر اس کو فاقے ہوئے، پر اس نے — بیچے نہ مرتے دم تک سکے نپولین کے

---

اس واقعے کو گو اک مدت گزر چکی ہے — یورپ میں اس کی اب تک ویسی ہی تازگی ہے
اس یاد سے ہے لندن کا دل گداز اب تک — پیرس کے میوزیم میں ہے وہ جہاز اب تک

(زمانہ، جنوری ۱۹۱۱ء)

---

# غزل

شکایت کرکے غمہا دوران کا تیسر کرتا ہے — ابھی تو گفتگو مصلحت آمیز کرنا ہے
ترے اعمال نامے پر کہاں ہیں دستخط تیرے — وہاں ثابت تجھے جعلی یہ دستاویز کرنا ہے
یہ دنیا جائے آسایش نہیں ہے، آزمایش ہے — یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
غزل خوانی کو تو آیا نہیں اس بزم میں نادر — تجھے یاں وعظ کہنا، پند سود آمیز کرنا ہے

---

بیٹھتا ہوں سر کر میں دنیا میں رسوا کیوں ہوا — میں نے ایسا کیوں کیا، افسوس ایسا کیوں ہوا

---

میں سمجھا تھا ہمارے حق میں دعائے خیر کرتے ہو — مجھے تم کوستے ہو، ہمدمو! اندھیر کرتے ہو

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۲ء)

---

# سالِ گذشتہ

آہ بوڑھے، سن رسیدہ اور قریب المرگ سال — اب تو ہوتا جاتا ہے ابتر ترا ہر روز حال
اور اب نزدیک تر ہے تیرا وقت واپسیں — آہ تجھ کو ہم سے اب کچھ کہنا سننا بھی نہیں
مختصر سی کچھ وصیت، کچھ نصیحت ہی سہی — اور اگر دل میں ترے شکوے ہوں تو وہ بھی سہی
کچھ تو کہہ حال اپنا او بیمار، لب اپنے تو کھول — مرنے والے تیرے دل میں کیا ہے کچھ منھ سے تو بول
آہ کیا اس عالمِ ظلمات اور انوار میں — اس جہانِ پُر طلسمات اور پُر اسرار میں
اپنی پُر غم زشتیِ تقدیر کا اک حرف بھی — ہم سے کہنا ہی نہیں منظور تجھ کو داغنی
کیا تری غم گیں صدا یہ کان سن سکتے نہیں — کیا یہ مژگاں اشکِ حسرت ترے چن سکتے نہیں

مرنے والے سال! وہ بھی کتنا نازک وقت تھا — جبکہ لیلائے ازل تھی دردِ زہ میں مبتلا
قسمت و تقدیر سے محروم تھی کل کائنات — اور ہر اک چیز بے اندازہ، بے پیمانہ تھی، اور بے ثبات
جب نہ چہ خانے میں پیدائش زمانہ کی ہوئی — کیا وہ حالت بھی تری او سال ہے دیکھی ہوئی

کیا ترے کانوں میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ
یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو نہ سمجھا ہستیوں کی ابتدا تکلیف ہے
اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

---

سال، بوڑھے سال، اے مرحوم ہونے والے سال
بلکہ دو اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیداکنارِ دہر میں
ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے
پھر دہانِ قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیر کفِ موجِ فنا
لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

---

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا
آخری سورج ترا، کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق و الفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو
رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں، تھا وہ تو بے مہری سے آگے کو رواں
دل لوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیوں پر ضوفشاں
اور نہ دیکھا اُس نے مڑ کر بھی تجھے دم توڑتے
ایک آنسو بھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

---

اے ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال
کوس رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام
اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بےکفن
وقت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار
نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

---

آہ او سالِ گذشتہ، او رادمرحوم سال
او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہجہ تھا
جس قدر اب چُپ نظر آتا ہے، ایسا تو نہ تھا
تیری چمکیلی امیدیں کب چمک جاتی نہ تھیں
دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب، او سال! وہ سب گئیں
اور نئی امیدیں میرے دل میں آ کر بجھ گئیں

(زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء)

---

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر
رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آجائے گا ان کو شکل میری دیکھ کر
میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب
دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
مفت بھی خواہاں نہیں وہ دل کے، کیونکر آدمی
بے ضرورت چیز لے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق
پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
دشتِ غربت سے چلا ناحق میں بستی کی طرف
کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر
دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا
بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر

عشق کا نادرؔ کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر

(الناظر، مئی ۱۹۱۱ء)

---

## سہرا[۱]

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا
ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ بلور سہرا

فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے
افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا

نسیمِ جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ بانی
بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اُسی ہنسی کا ظہور سہرا

ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلا دیے ہیں شہپر
ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا

فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ پرویں
اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا

پری نے چھپ کے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل
جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا

عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیے ہیں
اسی کے یہ پنجۂ نگاریں سے بن گیا منہ کا نور سہرا

فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے
ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا

بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا
کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے چھپ کے یہ ہے مبارک ضرور سہرا

سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور زنانے میں پھول مطرب
ہے مطربِ جشنِ عیش نوشہ ہے سازِ بزمِ سرور سہرا

گلِ مضامینِ فکرِ نادرؔ سے، ورق[۲] کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلکِ سطور سہرا

(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

---

## یاد دہانی بطرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کر کے ممکن ہے پلٹ جانا
پلٹ جانا کسی طنّاز کا ممکن ہے پیماں سے

یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن
نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے

بہار آئے، چمن پھولے پھلے، لیکن یہ ممکن ہے
کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے

یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں
کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے

یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت
نکل کر پھر پلٹ آتا ہے ممکن تیر پیکاں سے (کذا)

یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کرنا اور مکر جانا
نہیں ممکن ہے ہرگز راجہ شعباں علی خاں سے

دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ پکے ہیں
میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں وہ راجہ کے بیٹے ہیں

(زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[۱] اس سہرے کے آغاز میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے: "ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم۔ بی۔ ایس۔ سی، کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا۔"

[۲] بہ سکونِ حرفِ ثانی، نادرؔ کا تصرف ہے۔

# تحفۂ تہنیت

(راجہ سید شعبان علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار سلیم پور کو خطاب کے سی، آئی، ای، عطا ہونے پر لکھا گیا)

بڑھا دے دے رہا ہوں اپنی طبعِ گرم جولاں کو ۔۔۔ مبارک باد دینے جائے گی شعبان علی خاں کو
کر تجھ سے سادگی ہائے جہاں کو حسنِ آرایش ۔۔۔ تری رامشگری سے دلفریبی بزمِ امکاں کو
گھٹا کی طرح اٹھ اور چل نسیمِ صبحدم بن کر ۔۔۔ چل اور لہکا دے باغوں کھیتوں کو اور بستاں کو
ہلا دے شاخِ گل کو اور اڑا دے تو عنادل کو ۔۔۔ ہنسا دے غم زدوں کو چھیڑ دے زلفِ پریشاں کو
یہی موقع ہے شوخی کا یہی موقع مسرت کا ۔۔۔ لٹا دے تکملا دے ہر سخنور، ہر سخنداں کو
چلی جا شوخیوں سے اور پہنچ جا آستانے پر ۔۔۔ ادب سے دے مبارکباد اس ممدوحِ ذی شاں کو
مگر میری زباں بھی کیوں نہ اپنے ساتھ لیتی جا ۔۔۔ ادا کیا کر سکے گی تو مرے جذباتِ پنہاں کو
مرا دل بھی لیے جا تو، یہ وہ شے ہے کہ کہتا ہوں ۔۔۔ خدا دل دے تو دے میرا ہی ایسا ہر مسلماں کو
مگر اس دل میں کیا ہے صرف سچی بے ریا الفت ۔۔۔ رفیقِ سرخ جو شیریں کرے تلخیِ دوراں کو
لیے جا ہاں وہ بے پایاں خوشی بھی میری خاطر سے ۔۔۔ جو اس تقریب پر حاصل ہوئی اس تہنیت خواں کو
جب اس سامان سے اس تحفۂ عرضِ ستائش ہو ۔۔۔ تو کیوں مقبولیت حاصل نہ ہو فکرِ سخنداں کو
کسی کی ذات میں جب اس قدر ہوں خوبیاں یکجا ۔۔۔ کہ ہو مدِ نظر اعزاز اس کا شاہِ شاہاں کو
کسی ذرے میں جب یہ کیفیت کسبِ ضیا کی ہو ۔۔۔ کہ وہ اپنی طرف کھینچے شعاعِ مہرِ تاباں کو
تو یہ کہنا برا کیا ہے کہ شاہنشاہ لندن سے ۔۔۔ خطاب آئے تمغے دینے کے لیے شعبان علیخاں کو
حقیقت میں یہ عزت باعثِ صد فخر و نازش ہے ۔۔۔ یہ عزت مایۂ صد ناز ہے امثال و اقراں کو
تمامی خوبیاں یکجا ہوں جس انساں میں خالق نے ۔۔۔ دکھایا اپنی قدرت کو، بنا کر ایسے انساں کو
الٰہی اُن کو عمرِ خضر دے، جاہِ سکندر دے ۔۔۔ کہ پہنچے مدتوں تک فیضِ خدام و عزیزاں کو
اٹھائیں فائدہ جس سے ہزاروں بے سروساماں ۔۔۔ خدا وسعت دے ایسی زندگیِ عیش ساماں کو

خطابِ کے، سی، آئی، ای، ملا دربارِ دلی سے
مبارک ہو یہ عزت راجۂ شعبان علی خاں کو

(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

---

# قصیدۂ تہنیتِ دربارِ شاہنشاہی

پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور ۔۔۔ ظلمتِ شامِ غم ہوئی کافور
پھر چلا لے کے جامِ آتش رنگ ۔۔۔ ساقیِ سرخ فام نشے میں چور
بن گیا پھر سوادِ ہندستاں ۔۔۔ اک محیطِ دفضائے عالمِ نور
وندھیاچل کی اونچی چوٹیاں پھر ۔۔۔ ہوئیں چشمک زنِ تجلیِ طور
یعنی بھارت کی راجدھانی میں ۔۔۔ پھر یہ قیصر کے جشن کا ہے ظہور

یعنی شاہنشہِ معظمِ ہند　　جارج پنجم و میریؔ عیوّر
تاجِ ہندوستان و انگلستان　　رشکِ خاقان و قیصر و فغفور
آنکھیں جن کے جمال سے روشن　　دل ہے جن کے خیال سے مسرور
عہد میں جن کے ہے رعیت شاد　　دور میں جن کے ملک ہے معمور
جلوہ آرا ہیں خود بہ نفسِ نفیس　　زیبِ دربار ہیں نظام حضور
لشکرِ آئینِ صف شکن بہ جلو　　راجگان، شاہزادگاں بہ حضور
یعنی سب والیانِ ہندوستاں　　جموں، کشمیر، اور ادے پور
شاہِ آسام و لامۂ تبت　　راجگانِ بڑودہ و میسور
والیِ مسقط اور خانِ قلات　　راجۂ گوالیار اور اندور　　۱
سب سورج بنسی اور چندر بنسی　　راجۂ جودھپور اودے پور
جس کے دربار میں ہیں یوں روشن　　جیسے سورج سے ذرّے ہوں پرنور
یادگارانِ پرتھی و جے چند　　جانشینانِ تغلق و تیمور
وارثانِ سپاہِ درّانی　　سربرآوردگانِ غزنی و غور
سورمایانِ راجپوت و سکھ　　غازیانِ قبائلِ مشہور
غولِ دلیرانِ راون و اندر　　فوجِ بھیلانِ والیِ چتّور
تیغ باندھے کمر میں خوں آشام　　تیر کھینچے لگائے زخموں میں چور
جملہ شیرانِ بیشۂ پیکار!　　سب نہنگانِ بحرِ خوں مغرور
جس کے آگے ادب سے حاضر ہیں　　جس کی تعمیلِ حکم پہ مجبور
عہد کی جس کے برکتیں بے حد　　عقلِ اوّل شمار سے مجبور
جس کے الطاف لاتعدّ و شمار　　اور جس کے فیوض لامحصور
ہند میں اس طرح کا جشنِ عظیم　　ایسا دربار، دیدۂ بد کور
کسی تاریخ سے نہیں ثابت　　اور کسی عہد میں نہیں مشہور
خاکِ دلّی ترے نصیب کہ تو　　بادشاہوں سے پھر ہوئی معمور
کامرانی کی ہر طرف ہے بہار　　شادمانی کا ہر جگہ ہے وفور
کیا نصیبہ ہے ہند کا چمکا　　کہ عیش سے ہیں سب مخمور
اے شہنشاہِ آسماں اورنگ　　اے جہاندار معدلت دستور
تیرے خادم خدیو اور خاقان　　تیرے محکوم قیصر و فغفور
سلطنت تیری غرب سے تا شرق　　ملک آباد شاد اور معمور
ہوئے اجزائے مذہب و ملت　　تیرے آئین اور ترے دستور
بادشاہوں پہ واجب التعمیل　　تیرے احکام اور ترے منشور
تیری افواج، بے حساب و شمار　　تیرا اقبال فاتح و منصور

تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس اک صدی بنے بھرپور

اور رہے دورِ پیہم تسلسل کا
یوں ہی کرتا رہے زمانہ مرور

میرا منہ تیری مدح خوانی کا
بس دعا گوئی تھی مجھے منظور

اس سے زائد تری ستائش میں
نطق بے کار نا طقہ معذور

(زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

---

# دلّی دربار

فاتحِ اعظم سکندر رومی کے بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ ممالکِ یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر، سرزمینِ ہند پر قدم رکھا ہے۔ یعنی حضور پرنور ملکِ معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکۂ میری، ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدوم میمنت لزوم سے خاکِ ہندوستان کو شرفِ افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفا شعار رعایائے ہند کو جس قدر خوشی و مسرت ہو، کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اس کی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پروری سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر، مسٹر جے، این، مکرجی نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کرکے، جس حسن سے اظہارِ مسرت کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ، ۳۱ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ نذرِ ناظرین ہے۔

اے پرانی دلّی، اے آثارِ دیرینہ شکوہ
اے جوانوں بادشاہ ............

تو کبھی گہوارہ تھا، مذہب کا اور تہذیب کا
اب شباب اور ............

---

پانڈوں نے تجھ کو جب دیکھا نگاہِ شوق سے
پڑ گئی آنکھوں میں اُن کی، بس چکا جو ندھا ایک بار

خوب گایا ہے مہا بھارت نے ہریالہ ترا
باندھ کر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا ہار

---

تیرے چپے چپے پر انبار ہیں اورنگ و تاج
حوصلوں کے، ولولوں کے، جوش کے، جذبات کے

لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا
چال سے، تدبیر سے، تلوار سے، اور توپ سے

---

تو عماراتِ نفیسہ کا ہے دار السلطنت
سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا اشمار

آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جن کو دیکھ کر
وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایک بار

---

ے مبارک! بعدِ مدت ہنستی ہے قسمت تری
آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا

کالے کوسوں دور سے، ساتوں سمندر پار سے
چھوڑ کر پیچھے جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمتِ دیرینہ کے سنگِ نشاں
ڈال دے گا اپنے ہاتھوں سے تراب بھر یار

ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر
یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

---

لہ پیشِ نظر رسالے میں، یہاں پر کا کاغذ غائب ہے۔ مجھے فی الوقت یہ شمارہ دوسری جگہ نہیں ملا ہے۔

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبحِ تجلی کی نمود — اٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت واقبال کا
فرش سے تا عرش آرایش ہے، آتا ہے نظر — پھر زمانہ راجۂ اشوک کے اجلال کا

---

آج تک مطلع ترا ہر چند تھا تاریک و تار — لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے شفاف تر
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے — اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

---

مجھ سے سن، تو درحقیقت فخرِ ہندوستان ہے — منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں — تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پہ گواہ

---

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپیدا کنار — خطۂ کشمیر سے، وسعت میں بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں — برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

---

اِس سے پہلے ہند کو تھی اس قدر وسعت کہاں — یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
تلّۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت — گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

---

امن و آسایش مسرت کا سبب ہے، گو، مگر — ہونا توپوں اور تفنگوں کی گرج ہیں فتح مند
واقعی ہے تیری قدرت اور شوکت کی دلیل — آتش افشاں کوہ کے دامن ہیں رہنا بے گزند

---

سرزمینِ پانی پت کے آج خاک و خون پر — ہیں جلیل القدر مہماں کے نصب شاہی خیام
ہوں مبارک تجھ کو دلی تاجپوشی کے رسوم — تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اور ایک نام

---

یعنی جھرمٹ میں رعایا کے، نظر آئیں گے اب — شاہ و شاہنشاہ بیگم با لباسِ زرنگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں — آنکھیں روشن، کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

---

ہم بھی اس موقع پہ، اک پرجوش طوفاں کی طرح — نیب فلک سر پہ اٹھا شور مبارک باد سے
اور لے کر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو — ہم نوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

(ادیب، دسمبر ۱۹۱۱ء)

---






ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار لطیف گنج رامپور یوپی سے شائع کیا

Safia Subоohi

C/O Mr.Shabbir Nadvi

١٩٦٣

Safia Suhooli

January to February

to Dec...

اينير . البرعلى

عالبه . عائلة

عاملة _ عاملة

1

للعب . لعب . لَعِبَ . حَضَرَ جَلَسَ

سَمِعَ . سَمِعَ . لَعِبَا حضرا جلسا

سَمِعَا لَعِبُوا حضروا جلسوا

سمعْنَ لعِبَتْ حَضَرَتْ جَلَسَتْ

سَمِعْتُ لعبتا حضرتا جَلَسَتَا

سمع لعبن حَضَرْنَ جَلَسْنَ

لعبْتَ حضرتَ جلستَ

لعبت حضرتما جلستما

لعبْتُما حضرتم جلستم

لعبْتُم حضرتِ جلستِ

لعبْتِ حضرتما جلستما

لعبْتُما حضرتن جلستُ

لعبتُنَّ حضرتُ جَلَسْنَا

لعبْتُ حضرنا

GD. NO. A—466 42ND YEAR OF PUBLICATION
IGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. OCTOBER 1963
GISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

# نگار

# ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دو رابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار بھی کوشش کرے گا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

**• پیغامات • خطوط • تقاریر، اور • خطبات میں سے**

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ مو...

# نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

**ضروری اعلان**

پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۱۶/۲۱۱ این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) — فہرست مضامین جون ۱۹۶۳ء — شمارہ (۶)




# ملاحظات

ابھی تک ہمیں تحقیقی کاموں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی سختی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقادوں میں کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس طرف آئے ہیں کہ تحقیق بڑا سہل اور آسان ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیات میر کے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں مرتب نے حوالے بہت کچھ دیئے ہیں اور ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصود یہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ ہمارے اہل قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ پھر بھی علم ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہوا میں ہوتی ہے۔

اردو والوں کے یہاں کا کلاسیکل ادب ہنوز بے معنی رہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس تک پہنچ ہی کس کی ہوئی ہے۔ دو چار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آگئے ہیں۔ مگر اس پر بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑیے صرف یہ سوچیے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کس مپرسی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو فنی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی۔ اور ہم بیکار رہ گئے۔ اب تو جو کچھ بھی کچی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

ں سے نہیں کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی غلطی کا امکان گویا نہ رہے۔ جیسی ایک مشہور نقاد نے میر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

در بنا کر بہت کچھ بے بنیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مفروضوں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے برتنے کا سلیقہ نہ آ جائے گا۔

آپ کسی ادارے سے بات کیجیے صاحب! میں نے قائم کا دیوان ایڈٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کر سکوں۔ آپ کا سے چھاپ سکے گا؟ تو پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اہلِ تحقیق کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس معاوضہ کیا ملے گا۔ ۸ فیصد۔ دس فیصد اور اگر فی صفحہ کی بات ہو تو دو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا کر کرم خوردہ پرانے نسخوں ہت جھیل کر پڑھا تھا اور ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدرشناسی اور کاموں کی اہمیت کا احساس بنیادی کام ہیں، ان کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے تاریخ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب ۔ آٹھ لٹے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض کمتر بیبر ترجمہ امین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۸ روپے فی صفحہ کے حساب سے ترجیحی اور کم نظری ہے۔ ایک عرصہ تک ترجموں کے معاملوں میں برتی رہی اب ہم تحقیق کے ساتھ برت رہے ہیں ادبی دنیا میں اب کام کرنے والوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بے بصری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ بڑے کام اپنے ں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ ے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کچھ داد کا فنکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا اگر داد ستائش اور حوصلے سے بے پروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق یا جاتا ہے۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر حسن نے معراج العاشقین کو ایڈٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لا نقل اور بے معنی جملوں کے لئے ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر تنبیہ ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں باعثِ خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کر کے نہایت اہم تشریحی حاشیے لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابلِ فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت دے پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار اصحاب کی تحسین و تعریف ادا کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان ارباب تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا غالب اور مومن میر حسن ور کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کر کے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہدِ معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکے۔

جدید ایران اور جدید عرب دنیا نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے بد یہ تہہ ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آ جائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسنِ صورت دے کر۔

قاری کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

---

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی ے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر آزما وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے۔ مگر ایسا بھی ہ کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور رہتی ہیں اور خریداروں کا قحط چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

# نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

**ضروری اعلان**
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۶۱/۷ این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) — فہرست مضامین جون ۱۹۶۳ء — شمارہ (۶)




## ملاحظات

ابھی تک ہمیں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی سختی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقادوں میں کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس طرف آئے ہیں کہ تحقیق بڑا سہل اور آسان ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیات میر کے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس میں مرتب نے حوالے بہت کچھ دیئے ہیں اور ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصود یہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ ہمارے اہل قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ پھر بھی علم ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہوا میں ہوتی ہے۔

اردو والوں کے یہاں کا کلاسیکل ادب ہنوز تشنہ رہا۔ بیشتر اس لیے کہ اس تک پہنچ ہی کس کی ہوئی ہے۔ دو چار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آگئے ہیں۔ مگر اس پر بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑیئے صرف یہ سوچیے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کس مپرسی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو فنی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی۔ اور ہم بیکار گئے۔ اب تو جو کچھ بھی پکی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

غلط شخص سے نہیں کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی غلطی کا امکان گویا دوہرا ہے۔ جیسے ایک مشہور نقاد نے میر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن  مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کو بنیاد بنا کر بہت کچھ بے بنیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مفروضوں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے ورثے کو برتنے کا سلیقہ نہ آ جائے گا۔

آپ کسی ادارے سے بات کیجیے صاحب! میں نے قائم کا دیوان ایڈیٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کر سکوں۔ آپ کا ادارہ اسے چھاپ سکے گا؟ تو پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اہلِ تحقیق کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس محنت کا صلہ کیا ملے گا۔ ۸ فیصد، دس فیصد یا اگر فی صفحہ کی بات ہو تو دو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا کر کرم خوردہ پرانے نسخوں کو معیبت جھیل کر پڑھا تھا اور ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدرشناسی کی اور کاموں کی اہمیت کا احساس ہے۔ جو بنیادی کام ہیں، اور جن کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے ادب کی تاریخ بننے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب، الٹے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض کثیر جمیر حجم کے مضامین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۵ روپے فی صفحہ کے حساب سے ترجمے اور کم نظری ہم نے ایک مدت تک ترجموں کے معاملوں میں برتی وہی اب ہم محققین کے ساتھ برت رہے ہیں۔ شاید ادبی دنیا میں اب کام کرنے والوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بےفکری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے ـــ بڑے کام اپنے کرنے والوں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کم بیداد کا شکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا اگر دب ستائش اور حوصلے سے بےپروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق بھی نہیں جانا جاتا۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے معراج العاشقین کو اڈیٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لا نفادے معنی جملوں کے ساتھ رائج ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کرے تو کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر منتج ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں بات خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کر کے نہایت اہم تشریحی حاشی لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابلِ فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت کو سمجھے اور پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار اصحاب کی تحسین و تصویب ہی پر گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان اربابِ تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا غالب اور مومن و میرا ان اور سرور کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کر کے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہد معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکے۔

جدید ایران اور جدید یورپ دونوں نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے جو آج جدید ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آ جائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسن صورت دے کر۔

قاری کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

---

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی پرچوں کے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر آزما وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور رہتی ہیں اور خریداروں کا قحط چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

کی باتی رہ جاتی ہے، اردو کے ادبی پرچوں کو اشتہار صرف اردو سے تعلق کی وجہ سے مل سکتے ہیں۔ اور ایسے کتنے مشتہرین ہیں جو اردو سے لگاؤ رکھتے ہوں بمشکل گنتی کے!
ان میں سرِفہرست ہمدرد دواخانہ ہے پھر سیلا ممبئی اور شیروانی الہ آباد آتے ہیں۔ ان تینوں کے مالکان اردو دوست بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔
یوں تو ان کے اشتہارات اردو پرچوں میں جاتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اردو کی کس مپرسی میں یہ سنجیدہ ادب کی ترویج و ترقی کی طرف زیادہ سے زیادہ دلچسپی
لیں۔ اور اردو کے ان چند گنتی کے رسائل پر خصوصی توجہ دیں جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہیں لیکن پھر بھی سستے اور گھٹیا ادب کی اشاعت سے
دامن بچائے رہتے ہیں۔ ایسے رسالے ۲۰ - ۲۵ سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے۔ لاکھوں روپے کے بجٹ میں سے ایک حقیر رقم ان رسالوں میں نئی روح پھونک سکتی ہے
جناب عبدالحمید خواجہ۔ جناب حکیم عبدالحمید دہلوی اور جناب احمد رشید شیروانی سے یہ ہماری توقع ہے کہ وہ اس معاملے پر غور فرمائیں گے اور اپنے ایڈورٹائزنگ
ایجنسیوں کو خصوصی ہدایات دیں گے۔ تاکہ اردو کے خادم اطمینان سے مصروف عمل رہیں۔

---

اس شمارے سے نگار میں ایک اہم کتاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ مفید اور ضروری ہے ـــ ہر شخص جانتا
ہے اسلامی تاریخ کا سرورق یعنی سیرۃ رسول اللہؐ اس حیثیت سے ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ اس کے واقعات تاریخ و ایام کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور
کبھی کبھی تو ان میں ایسا شدید تضاد پایا جاتا ہے کہ پوری سیرۃ کے راوی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ قدیم سیرۃ کی کتابوں میں لگ بھگ سو سوا سو واقعات کی
تاریخیں اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اسلامی مورخوں کا حیرت خیز کارنامہ ہے۔ لیکن موجودہ دور کے صاحب قلم اس شجر ممنوعہ تک
جاتے ہوئے ڈرتے ہیں اور موجودہ کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تاریخ سے ایام مطابقت نہیں کرتے
کبھی روایات سے موسم غیر مطابق ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کی علم
ہیئت تکذیب کرتا ہے غرض یہ وادی پرخار ایسی ہے جس سے دامن بچا کر گزر جاتے ہی میں عافیت ہے۔
یہ موضوع خالص انسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی ایک نمائندہ امت کی تاریخ کو صحیح صحیح سمجھنا خود اپنی جگہ ایک
ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس زنجیر سے ایک کڑی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نیلسن ( Nielsen ) ونکلر ( Winkler )
پرسیول ( Persival ) میور ( Muir ) جیسے مستشرقین اور حمید اللہ جیسے صاحب نظر نے ایسے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش
تو مگر کامیاب نہ ہو سکے۔
اس موضوع کے لیے جس وسعت مطالعہ محنت اور خلوص کی ضرورت تھی مسرت کا مقام ہے کہ اس کا پورا پورا حق صاحب تصنیف نے ادا کیا ہے
اور ایک وسیع کینوس پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ علمی دنیا پر ایک احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
یوں تو نگار کی محفل میں اسحاق النبی خاں صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ مگر ایک طرح ان کا رشتہ اس رسالے سے بہت پرانا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی
بات ہے مولانا نیاز فتحپوری نے ڈاکٹر سٹڈل کے ان اعتراضات کا ترجمہ شایع کیا تھا۔ جو قرآن مجید پر کیے گئے تھے۔ صاحب تصنیف ہی وہ پہلے فرد
تھے جنھوں نے عالمانہ انداز میں اس کے کچھ حصوں کا جواب لکھا تھا اور جو "برہان دہلی میں" ہارون اور گوسالۂ طلائی" کے عنوان سے شایع بھی ہوا تھا۔ اسلام
سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے اس کا خیر مقدم پورے جوش و خروش سے کیا تھا اور اب بھی بہت سے حضرات کو یہ افسوس ہے کہ وہ کام پایۂ تکمیل تک
نہیں پہنچ سکا۔
موجودہ کتاب میں بظاہر ایک خشک موضوع کو جیسی تر زبانی صاحب تحریر نے عطا کی ہے وہ اس کے بہت سے بوجھل حصوں کو بھی گوارا بنا دیتی ہے
نگار کو یہ فخر ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی ضرورت کا احساس تو سب کو تھا مگر لب اظہار اور جرأت
گفتار کی کمی نے اُسے احاطۂ تحریر میں نہیں آنے دیا۔

# حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

اسحاق النبی خاں

## مقالۂ اوّل

### فصل اوّل

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب و غریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی جسکے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کی عمومی اور آفاقی مقبولیت نے ثابت کردیا کہ یہ وقت کی آواز تھی جو کہیں سے کبھی اٹھتی ضرور ہی جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرق وسطیٰ پر چھا گئی جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے، کہ جزیرہ نما سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت خیز کام انجام دیئے اور آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعث کشش اور جاذب توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ یا با الفاظ دیگر آپ کے ان احکام و افعال سے ہوتی ہے، جو اس تحریک کو منظم کرنے پھیلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا یہ ابتدائی حصہ حد درجہ اہم ہے، اور اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصّے کا بغائر نظر مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیمات اور زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جد و جہد کی اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط، اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی دریافت ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ پرانے اصول ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی :

۱۔ عہد ماقبل نبوت

۲۔ مکی عہد

۳۔ مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطہ سے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور پرامن تھی، شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپکی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپکی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی، اور سیاسی ترقیاں نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرے اور سیاسی طاقت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ انقلابی قابلیت، اور پھر رہنمائی کا جوہر کا بیک وقت قدرت میں سب سے زیادہ

بالوقوع عجوبہ ہے، اس نظریے سے دیکھیے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسول عربی کی ذات میں قدرت نے یکجا کیے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی، اور اخلاقی نظریات وتصورات پیش کر کے دنیا سے منوالیے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور مائل بہ ترقی سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل وتاسیس بھی کی جس نے اگلے دس سال کے اندر ہی براعظم ایشیا و افریقہ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر ڈالا۔[1]

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اٹھی ہوا ریتی آندھی نہ تھی جو فوراً اتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادی سندھ سے لیکر ارال ( ARAL ) تک اور ارال سے لے کر اٹلانٹک ( ATLANTIC ) تک ایک ہی پرچم کو سربلند کر دیا جو بڑی مدت تک اسی شان و شوکت سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصہ پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں، اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں غزوات وسرایا کہا جاتا ہے، اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخ سیاست کا پہلا باب انہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات وسرایا کے جو طویل حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقام جنگ، اس کا مدینہ یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکا کی پوری تعداد، مع اسماء مشاہیر بالصراحت مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے، کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء، اور دوستوں کی نشاندہی، موافقین ومخالفین کے سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام نیز یہ کہ کون شخص کس کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس طرح ہوا؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفین کی جنگی طاقت، سرداران جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا دن تاریخ اور مہینہ تک متعین کیا گیا ہے۔ اور کسی وجہ سے تاریخ ویوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا!

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو فوراً ہی قلمبند نہ کر لیا جائے، بالخصوص تاریخ اور دن کی نشاندہی بلا لکھے ممکن نہیں! اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں، اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں بلکہ تاریخی ہے، تو ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے "رواۃ" کے سامنے براہ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں، جن کا تعلق عہد رسالت بلکہ غزوات سے تھا!

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایات سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے، اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتب سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اٹھتی ہیں؛ کیونکہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔

اس سلسلے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبط تحریر میں نہیں آ سکی تھیں۔ چنانچہ اکثر علمائے تاریخ کا خیال یہ

---

[1] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:-

" In any case, whatever view we may take of the claims of Mohammad no one can deny that he was a great man. a man who can put an end in less than 10 years to two formidable kingdoms, the kingdom of the old Achemenides represented by the classic Sassanides and that of Roman Ceasers of Eastern countries by means of some camel drivers of Arabia, must be at any rate taken into consideration. A controller of conscience and soul to so many millions and in the plainllight of civilization, is indeed greater than Alexander and Bonapart known only to day in historical books."

(A.Mingana leaves P XXIV )

خطبات احمدیہ/ ۳۱۵

ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی سنہ ۱۵۱ھ) اسلام کے پہلے مورخ ہیں، جنہوں نے آنحضرت کی سیرۃ کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر لسانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں متداول تھیں۔ گویا اسلام کی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہور اسلام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے؛

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا ابتدائی حصہ محض مشکوک اور منتشر لسانی روایات کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے، جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت رہتی ہے نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گذر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اور اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضایع نہ ہو جائے، جس کے خلا کو پر کرنے کے لیے رائج الوقت روایات، عقائد اور تصورات ان میں شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا، اور عباسی عہد کے عقائد مزعومات اور عصبیت اتنی کم روایتوں میں محسوس ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس سے پہلے ضبط تحریر میں آچکا تھا؛

اس صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے "رواۃ" کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی تھیں، جن کا تعلق عہد رسالت یا عہد صحابہ سے تھا، تو اس مفروضے کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ابتدائی عہد میں ایسے امکانات موجود بھی تھے کہ اس طرح کی یادداشتیں یا دستاویزیں ضبط تحریر میں آسکتیں ؟

اس سوال کا جواب ہر طرف سے نفی میں دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مستشرقین بلکہ علمائے اسلام کی اکثریت اس بات کی مدعی ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرہ فی الجملہ جاہل اور ان پڑھ تھا، اور ان میں علمی صلاحیتیں یا تو بالکل مفقود تھیں یا اتنی کم تھیں کہ قرآن مجید میں اس دور کے لوگوں کو "امی" یعنی ناخواندہ کہا گیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے، ورنہ عام طور پر پورے ملک میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر یہ قیاس ممکن نہیں کہ اس ابتدائی دور میں یہ یادداشتیں ضبط تحریر میں آسکیں۔ ہر شئے ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لکھے پڑھے لوگ ہی نہ تھے تو پھر کوئی لکھتا بھی تو کیوں؟ اور کس کے لیے؟۔

ڈاکٹر نیکلسن نے تاریخ ادبیات عرب (Literary History of the Arabs) میں جاہلی عربوں کو گویا ناخواندہ اور جاہل مطلق کہا ہے۔[۲]

مسلمانوں میں سر سید سے زیادہ آزاد قلم کس کا ہوگا مگر ان کی مہر بھی اس فتویٰ پر ثبت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آنحضرت کے زمانہ سے پیشتر، اور نیز آنحضرت کے زمانہ میں کوئی معین باقاعدہ "طریقۂ تعلیم" کا جاری نہیں تھا، عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب، ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی، وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے، اسی وجہ سے اس زمانے میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی، پہلے یعنی وہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ پچھلوں کے مقابلے میں "امی" کہلاتے تھے، اگرچہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں بہت کم فرق تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے، اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی حیثیت سے آنحضرت کا لقب "امی" تھا۔"[۳]

حقیقتاً اس تصور جہالت کو مستشرقین نے اتنی ہوا نہیں دی ہے، جتنی خود مسلمانوں نے۔ جس کی بنیادی[۴] وجہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام ناخواندہ تھے، جیسا کہ سر سید تک کا خیال ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت کے لیے صاف طور پر لفظ "امی" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عام طور پر ناخواندہ لیے جاتے ہیں، اور چونکہ یہی لفظ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر پوری عرب قوم کے لیے بھی آیا ہے[۵] اس بنا پر مسلمانوں کا عمومی تصور یا عقیدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آنحضرت اور آنحضرت کے ساتھ اس پوری "امت امیہ" کو "خواندہ" یا پڑھا لکھا تسلیم کر سکیں جس میں آپ پیدا ہوئے یا پرورش پائی اور بالآخر مبعوث ہوئے۔ کیونکہ اصولاً یہ بات ممکن نہیں کہ ایک مقام پر اس لفظ کے معنی ناخواندہ لیے جائیں اور دوسری جگہ کچھ اور مفہوم لیا جائے۔

میں یہاں حضرت "نبی امی" کے خواندہ یا ناخواندہ ہونے کی بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں، نہ اس عام عقیدے کی صحت اور عدم صحت پر کچھ کہنا ہے

[illegible]

ہاں اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال شاید ہی اولہ مفہوم میں نہیں ہوا ہے اور غالباً ہر جگہ "غیر بنی اسرائیلی" (GENTILE) یا غیر کتابی لوگوں کے استعمال ہوا ہے، بلکہ بعض تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شاید اس کا مروجہ مفہوم "موجود" ہی نہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس نے ( ) کی تشریح کرتے ہوئے لفظ "امیون" کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں، "قوم لم یصدقوا رسولاً ارسلہ اللہ ولا کتاباً انزلہ"[1] (یعنی وہ قوم جس نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول اور کسی نازل کردہ کتاب کی تصدیق نہیں کی) بلکہ اس ذیل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان لوگوں کے پاس خود نوشتہ صحیفے ہوتے ہیں جن کو یہ اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔[2]

عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص عکرمہ کے نزدیک بھی ہر غیر کتابی "امی" تھا؛ چنانچہ انھوں نے رومیوں کے مقابلے میں مجوسیوں کو محض اس بنا پر امی قرار دیا ہے کہ وہ غیر کتابی تھے۔[3] دوسری صدی کے نصف اول میں ابن اسحٰق نے بھی "امی" کے معنی "ان پڑھ" یا "ناخواندہ" نہیں لیے بلکہ اس کا تقریباً وہی مفہوم سمجھا جو ابن عباس نے بیان کیا تھا، یعنی غیر بنی اسرائیلی ( Gentile ) یا غیر کتابی چنانچہ "قل للذین اوتوا الکتب والامیین" کی تشریح کرتے ہوئے "امیین" کے معنی "الذین لا کتاب لھم" بیان کیے ہیں،[4] یعنی وہ قوم جس میں کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ خود قرآن مجید کے سیاق سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ تقریباً ہر جگہ یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔[5] حتیٰ کہ آنحضرت کے لیے بھی جب اس کا استعمال ہوا تو اس صراحت کے ساتھ کہ آپ کی یہ صفت توریت اور انجیل میں موجود ہے۔[6] حیرت ہے کہ علمائے اسلام اس آیت کی موجودگی میں لفظ امی کے معنی "ان پڑھ" کس طرح کر لیتے ہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل کی تمام پیشگوئیاں ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس میں کسی "ناخواندہ" نبی کی آمد کی خبر دی گئی ہو؟

علاوہ ازیں مضبوط ترین ناقابل اور تاریخی شہادتیں بھی اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ کہ ظہور اسلام کے وقت پورا عربی سماج ناخواندہ یا ان پڑھ تھا؛ یہ سچ ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے تعلیمی نقشے میں وہ رنگ نظر نہیں آتے، جو آج موجود ہیں، اس لیے کہ اس عہد میں انسانی معاش بیشتر قلم کی وابستگی سے آزاد تھی، لیکن پھر بھی چند در چند دینی، سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لیے اکثر لوگ تحصیل علم پر مجبور تھے۔ جن کی تعداد اگرچہ ہر ملک میں محدود ہوتی، لیکن ہوتی ضرور تھی۔ اور اسی نسبت سے عربوں میں بھی تعلیم کی افراط خارج از قیاس ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ظہور اسلام کے وقت باشندگان عرب اپنے پڑوسی ملکوں یا قوموں کے مقابلے میں ان پڑھ تھے تاریخی واقعات کے ساتھ ناانصافی ہو گی، کیوں کہ اوراق تاریخ میں اس کے خلاف مبہم شہادتیں ملتی ہیں جن کو میں فصل دوم میں پیش کروں گا۔

## فصل دوم

ظہور اسلام کے وقت عربوں کی تعلیمی حالت کا پورے طور پر جائزہ ( Survey ) لینا نہ تو اس کتاب کا موضوع ہے اور نہ اس چھوٹی سی فصل میں ممکن ہے، اس لیے میں یہاں صرف چند ایسی تاریخی شہادتیں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ عہد رسالت میں جاہلی معاشرے کو قلم سے کیا لگاؤ تھا، اور اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی شہادت جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس زمانے کی مروجہ عربی زبان کی ہے جو میری رائے میں سب سے اہم ہے۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کسی زبان کی تعمیر اور وسعت میں اس کے بولنے والوں کی ضروریات اور ارتقائے ذہنی کو دخل ہوتا ہے اور ان ضروریات کی طرف اس زبان کے الفاظ اور ان کی قلت و کثرت رہنمائی کر سکتی ہے، تو خود عربی زبان اس بات کی شاہد ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں تعلیمی فقدان نہ تھا؛ اور یہ "امت امیہ" اپنے پڑوسی ملکوں سے میدان تعلیم میں پیچھے نہ تھی۔ صرف "عربی مبین" یعنی حجازی زبان میں (جس میں قرآن نازل ہوا) نوشت و خواند اور اس کے متعلقات کے لیے اس کثرت سے الفاظ ملتے ہیں جن سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی ضروریات میں تعلیم کو کافی دخل حاصل ہو چکا تھا۔ میں یہاں صرف قرآن مجید سے کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو مختلف دارج کی کتابوں اور مکتوبات کے لیے استعمال ہوتے تھے، مثلاً:

"کتاب[7] - اساطیر (اسطورہ)[8] - زبر (زبور)[9] - اسفار (سفر)[10] کتاب مرقوم[11] - نسخہ[12] - صحف (صحیفہ)[13] - سجل[14] - قط[15]"

گویا نو الفاظ! ان میں سے تین آخر الذکر لفظ (یعنی صحف، سجل، قط) کے علاوہ جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں، باقی تمام الفاظ عربی ہیں، اور ان سب کے الفاظ اور مصادر عربی میں رائج تھے، یعنی:

---

[1] الدر منثور / [2] در منثور / نیز دیکھیے طبری تفسیر ۳/۳۴۳؛ [3] طبری تاریخ ۲/۱۴۲؛ [4] ابن ہشام ۲/۲۲۷ [5] دیکھیے قرآن ۳/۲۰: ۳/۷۵ ... وغیرہ [6] قرآن ۷/۱۵۷ [7] قرآن ۲: ۷۹ ... ۱۳: ۴۳ وغیرہ

کتب[1]، سطر[2]، زبر[3]، سفر[4]، رق[5]، نسخ[6]، ان پر دو لفظوں کا اور اضافہ کیجئے یعنی "خط[7]" اور "املا[8]" کا جو قرآن مجید میں جداگانہ استعمال ہوئے ہیں، گویا ظہورِ اسلام کے وقت صرف "لکھنے" یا "کتابت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں کم سے کم ۱۳ لفظ موجود تھے جن کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے؛ یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم تر زبانیں اس کا مقابلہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ الفاظ اس وقت تک "حصہ زبان" نہیں بن سکتے جب تک بولنے والوں کو ان کی شدید ضرورت نہ ہو اور پیہم استعمال نہ ہوتے رہیں؛ میں نے یہ الفاظ صرف قرآن مجید سے انتخاب کیے ہیں تاکہ عہد رسالت میں ان کا استعمال اور رواج شکوک و شبہات سے بالا رہے، ورنہ اسی عہد کے چند اور الفاظ بھی پیش کیے جا سکتے تھے؛

کیا یہ تصور واقعی حیرت خیز نہیں کہ جس زبان میں نوشت و خواند کے لیے اتنے زیادہ الفاظ مروج ہوں، اسی زبان کے بولنے والے فن کتابت سے بے بہرہ فرض کر لیے جائیں، اور بایں معنی "امی" سمجھے جائیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیتوں سے محروم تھے؟

قطع نظر اس کے کہ خود قرآن مجید کے انداز بیان اور خاص طور پر طرز استدلال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظہور اسلام کے وقت عربی سماج "ان پڑھ" تھا، یا قرآن کے سامعین اولین اور مخاطب وقت جاہل تھے، اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ متداول کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں، عبارتیں نظر آتی ہیں جن کے خلاصے بطور سند پیش کیے گئے ہیں، پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ پست نہیں بلکہ بلند ہیں، جن سے سامعین کے طویل ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، سماجی اور اخلاقی نکات کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ آج کی دنیا شعوری اور غیر شعوری طور پر انہیں آہستہ آہستہ قبول کرتی جا رہی ہے، مگر بہت سے پسماندہ سماجوں کے لیے ہنوز ناقابل فہم و عمل ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی عبارت جو نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" سے ہوتی ہے اور انتہا "علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم[3]" پر۔ نزول قرآن کے بعد جب اس کتاب پر اعتراضات کی بوچھاڑیں ہونے لگیں، جرح و تنقید شروع ہو گئی۔ مطعون کیا جانے لگا، اور طرح طرح کے بہتان لگائے گئے تو ان میں سب سے زیادہ عام اعتراض یہ تھا کہ یہ پچھلی کتابوں یعنی "اساطیر الاولین[4]" سے ماخوذ ہے، گویا سرقہ مضامین کا طعنہ جو اکثر ادیبوں اور نقادوں پر کرتے ہیں جن کی نظریں پچھلی کتابوں پر ہوتی ہیں، یہ الزام بھی کسی جاہل معاشرے کی طرف سے ممکن نہیں، چنانچہ قرآن نے جب اس کی تردید کی تو ان الفاظ میں: "فاتوا بکتاب من عند الله هو اهدیٰ[5]" — "فاتوا بسورة من مثله[6]" — "فاتوا بعشر سور مثله[7]"، گویا تمام مصنفین عرب کو چیلنج کیا گیا کہ اگر قرآن آسمانی کتاب نہیں، تو اس کی مثل کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جس کو "دعوت تصنیف" دی جا سکتی تھی ورنہ ظاہر ہے، کہ ایک ان پڑھ سماج کے لیے یہ زعم تر مطالبات بے معنی ہیں، کم سے کم میرے لیے یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ قرآن کی یہ "دعوت تصنیف" ایک ایسے جاہل اور ان پڑھ معاشرے کے لیے تھی، جو اس کے جواب میں چند سطریں لکھنے سے بھی معذور تھا، قرآن میں یہ چیلنج ایک دو جگہ نہیں بلکہ چھ مقامات پر نظر آتا ہے[8]۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ اتفاقی نہ تھا بلکہ مخالفین بار بار کوشش کرتے اور بار بار ناکام ہوتے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے، کہ رسول اللہؐ نے ان چیلنجوں میں یا تو قرآن جیسی "کتاب" کا مطالبہ کیا ہے یا "جزو کتاب[9]" یعنی سورۃ کا، ظاہر ہے کہ "سورۃ" کسی کاوش لسانی کا نام نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں جبکہ قرآن کوثر و تسنیم سے ریگستان عرب کی آبیاری کرنا چاہتا تھا، ایک مکی عالم نضر بن حارث نے "یہاں" اہرمن و یزداں کی مقدس آگ سلگانا چاہی تھی، اور مجوسیت قبول کر کے[10] اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی، چنانچہ اس کی مشہور کتاب کا تذکرہ جس کو قرآن نے "لهو الحدیث" کا خطاب دیا تھا، اوراق تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، اس کتاب میں "نضر" نے رستم و اسفندیار کے دلچسپ قصے بیان کیے تھے، اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن سے کسی طرح کم نہیں[11]، نضر صرف فارسی زبان ہی سے واقف نہ تھا، بلکہ شاید یونانی بھی جانتا تھا[12]۔

---

[1] ۲۹:۴۷ [2] [3] قرآن ۹۶:۴
[4] ۶:۲۵، ۸:۳۱، ۲۳:۸۳، ۲۷:۶۸، ۲۵:۵، ۴۶:۱۷، ۶۸:۱۵
[5] ۲۸:۴۹، نیز دیکھیے ۱۰:۳۸ [6] ۱۰:۳۸ [7] ۱۱:۱۳ [8]
Arthur Jeffery-Foreign Vocabulry of the Quran p.p.182 [8]
[9] نضر بن حارث نے زندقہ یعنی مجوسی مذہب اختیار کر لیا تھا دیکھیے ابن حبیب محبر/۱۶۱ [10] قرآن ۳۱:۶
[11] ابن اسحاق کا بیان ہے: "فحدثهم عن رستم السندید وعن اسفندیار و ملوك فارس، ثم یقول، والله ما محمد باحسن حدیثا منی وما حدیثه الا اساطیر الاولین اکتتبها کما اکتتبتها" — ابن ہشام [12] 268

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اور اہل قلم تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، جن کی کتابیں، بالخصوص ہاتھ قلم کی فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف کتابوں کی خر قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج عام تھا[2]۔

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمہ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] بڑا مشہور واقعہ ہے! اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری توریت یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا[4]، یہ ترجمہ غالباً حضرت عمر کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلہ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرت نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرت کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمر کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو بیشتر ادبی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفہ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6] اگر یہ روایت صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضرورتیں رہتیں، چنانچہ خود حضرت نبی امی نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے تھوڑے دنوں میں بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]۔

زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]۔

بلند پایہ کتابوں کو مطلا، اور مذہب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10] یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت علی نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]۔

ظہور اسلام کے وقت عرب دیہات میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں؛ بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد دیہاتی

---

[1] ۲: ۷۹، خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیهم" اور "لیشتروا به ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاوس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/۳۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب )

[4] مسند ۳/۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/۸۶ طبری ۲/۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرت کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان هذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ...... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول الله ان أتعلم له کلمات من کتاب یهود، ...... فلما تعلمته کان اذا کتب الی یهود کتبت الیهم، واذا کتبوا الیه قرأت له کتابهم ..... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول الله ان اتعلم السریانیة (ترمذی، باب فی تعلیم السریانی) [8] حمید اللہ [9] ابن سعد ۲/

[10] حمید اللہ

[11] ...... جیء ابن مسعود بمصحف قد زین بالذهب فقال ان احسن ما زین به المصحف تلاوته (منتخب کنز العمال ۱/۲۰۳)

[12]، منتخب کنز العمال ۱/۴۰۰

تھے، مدارس موجود تھے، چنانچہ اس قبیلے کی ایک ضرب المثل فاحشہ "ظلمہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی تھی۔[1] اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج عام تھا۔ یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے چنانچہ عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابو حارثہ تھا۔[2]

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزوں کا مرتبہ ایک دفتری معنی سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی۔

ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔[3]

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے، کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطی ناواقف تھا۔ مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو پیپائرس از Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی جھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا۔[4] عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عام طور سے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے[5] غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی حریر سے ہے، حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے۔ جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو ۹ھ میں لکھا تھا۔[6] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف رؤسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیاء کتابت بہ افراط نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقع، عسب وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا لوحیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "تختہ"، "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ خفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چھوکر کاٹ لیا جاتا۔ یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں، جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیا کتابت کی اس گوناگونی سے مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں پر سرمایہ اور مذہب کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر، غریب، غلام، آقا، مرد، عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں، جو غریب، کم مایہ اور غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ یہ مقررہ فدیہ بطور تاوان جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے، اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں کے لیے یہ تاوان مقرر کیا گیا تھا، کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔[7] غلاموں میں، اگرچہ متعدد لکھے پڑھے نظر آتے ہیں مگر یہاں عامر بن فہیرہ کی مثال کافی ہوگی جو حضرت ابوبکر کے غلام تھے، اور ہجرت میں آنحضرت کے ہمرکاب تھے۔ دوران ہجرت میں سراقہ کو جو تحریر دی گئی وہ انھیں کے قلم کی تھی۔[8] خواتین میں بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں، خاص طور پر حضرت عمر کی بہن، فاطمہ بنت خطاب کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جو حضرت عمر کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت عمر ان کے گھر پہنچے تو فاطمہ سورۂ طٰہٰ کی

---

[1] ...... قالوا كانت ظلمة التي يضرب بها المثل في قيادة صبية في الكتاب فكانت تضرب دوى الصبيان واقلامهم
عيون الاخبار ابن قتيبة الدينوري ۲/۱۰۳، ۱۰۲ [2] ابن اسحٰق نے بڑی تفصیل سے ابو حارثہ کے علم و فضل کو سراہا ہے، اور آخر میں یہ الفاظ لکھے ہیں

بھیجتی ہیں، اور معلم سے درس قرآن جاری تھا۔ حضرت حفصہ کو شفا بنت عبداللہ نے جو بڑی فاضلہ تھیں، لکھنے پڑھنے کی تعلیم دی تھی۔[۱] اس واقعہ سے استانیوں کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ استانیاں

جاہلیت میں ابتدائی تعلیم کی عمر اگرچہ بچپن کا زمانہ تھا،[۲] اور بالعموم چھوٹی عمر کے بچے مدارس و مکاتب میں اساتذہ کے حوالے کیے جاتے، لیکن حیرت ہے کہ اسی زمانے میں تعلیم بالغان (Adult Education) اور مدارس شبینہ (Night School) کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصحاب صفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دن بھر کام کرتے اور رات کو جب واپس آتے تو معلموں سے لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم حاصل کرتے۔[۳] مکتب کی تعلیم، تعلیم بالغان، مدارس شبینہ

مدینے میں دستور تھا کہ ضروری تعلیم کے ساتھ فنون سپہ گری بھی سکھائے جاتے۔ چنانچہ ان کے یہاں صرف اس شخص کو "کامل" کہا جاتا تھا، جو لکھنے پڑھنے کے ساتھ تیر اندازی اور تیراکی بھی جانتا ہو، ظہور اسلام کے وقت یہ "سند کاملیت" کئی لوگوں کے پاس موجود تھی، مثلاً سعد بن عبادہ رضؓ، اسید بن حضیر رضؓ، عبداللہ بن ابی، اوس بن خولی، سعید بن صامت وغیرہ۔[۴] سند کاملیت

اوراق تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد رسالت میں لین دین کے تمسکات اور بیع و شریٰ کی دستاویزیں بھی لکھی جاتیں، چنانچہ حضرت ابو طالب کا ایک تمسک عرصہ تک محفوظ رہا۔ ابن ندیم نے بھی دیکھا تھا۔[۵] خود قرآن مجید میں بھی اس قسم کے تمسکات کو لکھ لینے کا حکم موجود ہے، جس پر دو گواہیاں ضروری ہیں۔[۶] اس حکم سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ عہد رسالت میں ان کی کتابت میں کوئی خاص دشواری نہ تھی۔ بلکہ لکھے پڑھے لوگ ہر جگہ مل جاتے۔ کاروبار میں ہنڈیوں اور چیکوں کا رواج تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ حساب کی تعلیم کا رواج بھی عام معلوم ہوتا ہے قرآن مجید میں مسلمانوں کو جو قانون وراثت دیا گیا، وہ از اول تا آخر کسری حسابات پر مشتمل ہے، یہ حسابات آسان نہیں، اور بعض مناسخہ کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو آج بھی ایک اعلیٰ حساب داں حل کر سکتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت اعلیٰ حسابی قابلیت رکھنے والے لوگ موجود تھے، ورنہ یہ قانون اس زمانہ میں ناقابل عمل ثابت ہوتا۔ حساب کی تعلیم

ان واقعاتی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ظاہر ہے کہ عہد رسالت کے سماج کو جاہل یا ان پڑھ تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایک اچھا خاصا تعلیم یافتہ معاشرہ معلوم ہوتا ہے جس کی تمام تر ضروریات میں تعلیم کو پورا پورا دخل حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے ایسے امور جو ایک ناخواندہ سماج میں محض زبانی طور پر تکمیل کو پہنچ سکتے تھے تحریری صورت میں نظر آتے ہیں: مثلاً:- تعلیم یافتہ معاشرہ

(۱) قریش نے جب بنی ہاشم کا سوشل بائیکاٹ (SOCIAL BYCOUTT) کیا تو ایک ناخواندہ بستی میں اس کو زبانی طے کر نا کافی تھا، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک صحیفہ لکھا گیا اور اعلان عام کے لیے دیوار کعبہ پر لٹکا دیا گیا۔[۹] قریش کا

(۲) ہجرت کے بعد جب قریش اور اہل مدینہ میں ان بن ہوگئی تو نہ صرف اظہار ناپسندیدگی کے طور پر مسلمانوں کو مدینے سے نکال دینے کے لیے ایک تحریری الٹی میٹم (ULTIMATUM) بھیجا گیا،[۱۰] حالانکہ یہ کام بھی ایک معمولی سفارت کے ذریعے زبانی ممکن تھا؛ الٹی میٹم

(۳) آنحضرت جب مدینے تشریف لے گئے اور مدینے کے سربرآوردہ قبائل نے اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیا، تو نئی حکومت کی طرف سے ایک دستور نافذ کیا گیا جو تحریری صورت میں تھا،[۱۱] عام حالتوں میں اس تحریری منشور کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی، اور صرف زبانی اعلان کافی تھا، خاص طور پر اس لیے کہ یہ تحریری دستور اس عہد کی پہلی مثال معلوم ہوتی ہے؛ تحریری دستور

(۴) قریش سے آویزش کے بعد اہل مدینہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایام حج میں اپنی زرعی پیداوار کو مکے لاکر فروخت کریں، اور یہاں حسب دستور صنعتی ضروریات حاصل کر سکیں، اس بنا پر رابغ اور ینبوع کی بندرگاہوں سے تعلقات استوار کرنا ناگزیر تھا۔ جن کے راستے میں ضمر، جہینہ، اسلم، غفار وغیرہ کی بستیاں پڑتی تھیں، اس بنا پر ان قبائل سے معاہدے ضروری تھے، یہ معاہدے سب کے سب تحریری تھے حالانکہ ان قبائل کے اکابر سے جملہ معاملات زبانی طے ہو سکتے تھے۔ تحریری معاہدات

(۵) آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے شاید کسی بھی ایک کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ اس کے جملہ ممبروں کے نام باقاعدہ درج رجسٹر کیے جائیں، مگر تاریخ ہم

---

[۱] Muir-lip p [۲] ابو داؤد کتاب الطب باب الرمی نیز دیکھیے فتوح البلدان / ۴۷۳ [۳] جامع بیان العلم / ۴۰
[۴] مسند ۳ / ۱۳۷، اسد الغابہ لابن اثیر ۳ / ۱۷۵، استعاب ۲ / ۳۹۳ [۵] ابن ہشام / [۶] ابن ندیم فہرست / ۸
[۷] ... [۸] ... [۹] ابن ہشام ۱ / ۳۷۵ فی الصفحہ۔ طبری ۲ / ۲۲۵ [۱۰] ابن حبیب محبر / ۲۷۱ [۱۱] اس دستور میں کل ۴۷ دفعات ہیں

بتاتی ہے کہ عہدِ رسالت میں ایسے رجسٹر موجود تھے، اور ایک بار جب یہ مردم شماری ہوئی تو پندرہ سو مردوں کے نام درج کیے گئے۔ [1]

(۶) معمولی جنگی ہدایات اور احکام کے لیے تحریرات کی کوئی ضرورت نہیں، معلوم ہوتی، مگر نخلہ کو روانگی کے وقت عبداللہ بن جحش کو جو ہدایت نامہ دیا گیا تھا وہ تحریری تھا۔ [2]

(۷) محاذِ جنگ پر جانیوالے سپاہیوں کی فہرست سازی اور تحریری نامزدگی ایک جاہل معاشرہ میں بالکل ناممکن ہے، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فوج جب کہیں روانہ ہوتی، تو اس کے افراد کو پہلے سے نامزد کر دیا جاتا، اور ان کے نام باقاعدہ لکھ لیے جاتے، ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت کے پاس ایک سپاہی آیا اور اس نے عرض کیا کہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھ لیا گیا ہے، مگر میری بیوی حج کو جانا چاہتی ہے، تو آپ نے اس کی درخواست منظور کرلی، اور حج کی اجازت دیدی۔ [3]

(۸) فوجی کارروائیوں کے سلسلہ میں خفیہ اطلاعات زبانی بھی ممکن تھیں لیکن جنگ بدر کے لیے جب قریش نکلے تو حضرت عباس نے اس کی اطلاع تحریری بھیجی تھی، اسی طرح جب مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے، تو ایک مسلمان ہی نے اس کی خفیہ اطلاع قریش کو کرنا چاہی لیکن یہ تحریر پکڑ لی گئی۔ [5]

(۹) تقسیمِ غنائم و عطیات کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو ایک ان پڑھ سماج میں تحریری صورت میں لایا جاسکتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مالِ غنیمت کی جب تقسیم ہوتی تو باقاعدہ تحریر ہوتی۔ چنانچہ خیبر کے اموال کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جس کی تحریر مرتب ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ [6]

(۱۰) اس سلسلے میں آخری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر واقعی عہدِ رسالت کا معاشرہ ان پڑھ ہوتا، تو خود قرآن مجید کی کتابت اتنے شروع زمانے سے بالکل ناممکن تھی۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مثالیں کتب سیرۃ و احادیث میں موجود ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت، پورا ماحول مائل بہ تعلیم ہو چکا تھا، جس کو اسلام نے اور فروغ دیا، نئے نئے مدارس و مکاتب کھولے، اساتذہ اور معلمین میں قابل ترین لوگوں کا انتخاب کیا گیا، تعلیم بالغان کو فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدارس شبینہ کا اہتمام کیا گیا جس کے نصاب میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ دینی تعلیم کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا، اس بنا پر یہ بات خارج از امکان نہیں کہ غزوات و سرایا کی ان تفصیلات کا اصل ماخذ کچھ ایسی دستاویزیں ہوں جو عہد غزوات میں مرتب ہوئی تھیں، اور ان کو ابتدائی سیرۃ نگاروں یا ان کے رواۃ نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ان مثالوں سے صرف یہی نتائج نہیں نکلتے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد، جیسے اسلامی ریاست کی تشکیل ہوئی، اور مسلمان سیاسیات میں داخل ہوئے، تو ان کی تنظیم، اور ریاستی نظم و انصرام کیلئے ایک دفتری نظام بھی وجود میں آیا۔ اس نظام کو خواہ کتنا ہی ابتدائی نوعیت کا تصور کیا جائے لیکن بہرصورت اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے، کہ تاسیس ریاست کے بعد جو دستور مدینے میں رائج کیا گیا تھا (دیکھیے مثال ۳) یا ان معاہدات کی اصل کا بیان جن کی ابتدا رسول اللہ ہی سے ہوگئی تھی (دیکھیے مثال ۴) محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح یہ امر بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ چھوٹے بڑے رجسٹر جو غزوات و سرایا کے ذیل میں یا اسلامی تنظیم کی غرض سے مرتب ہوتے رہے تھے (دیکھیے مثال ۸، ۷) فوراً ہی ضائع کر دیئے جاتے ہوں۔ مثال نمبر ۵ میں جس رجسٹر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافی ضخیم معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ڈیڑھ ہزار افراد کی اسم نویسی کے لیے سیکڑوں صفحے درکار ہیں۔ اس رجسٹر کی ابتدائی غرض، اندازہ قوت، تحصیل زکوٰۃ، اور انتخاب عساکر کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں غزوہٗ سرایا کے ذیل میں جو نامزدگیاں ہوتی تھیں (دیکھیے مثال ۷) تو فوجیوں کے نام (باقی صفحہ ۲۵ پر)

---

[1] دیکھیے بخاری باب عن حذیفۃ قال قال النبیؐ اکتبوا لی من یلفظ بالاسلام من الناس فکتبنا له الفا وخمسمائة [2] تدرجل بخاری / ۴۳۰ — [2] طبری ۲/۲۶۴ — [3] دیکھیے بخاری / ۴۳۰ عن ابن عباس قال رجل الی النبی یا رسول اللہ انی کتبت فی غزوة کذا و کذا و امرأتی حاجۃ قال ارجع فحج مع امرأتک [4] بھی

[5] ابن ہشام ۴/۴۱ طبری ۳/۱۱۳ [6]

# فنِّ داستان نگاری اور باغ و بہار

سید ابو الخیر کشفی

"غزل" اور "داستان" یہی دو اصناف ادب ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں ٹھنگنا اور پستہ قد محسوس نہیں کر سکتے۔

داستان گوئی اور داستان سرائی ہمارے بزرگوں کے لیے محض ادبی صنف نہیں تھی بلکہ اُن کے اندازِ زیست کا ایک جز تھی۔ داستانوں کی مختلف تہیں ہماری صدیوں کی زندگی اور کلچر کی مختلف سطحوں کی امین رہی ہیں۔ داستانوں میں قصہ گوئی کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی تھا جو جنم جنم سے انسان کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ اور داستانوں میں حقیقتوں کو سمجھنے اور بہ اندازِ دگر ان کے اظہار کا سامان بھی تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر داستانیں ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا وسیلہ تھیں۔ ذوق بخشی کے بغیر تہذیبِ انسانی کا تصور محال ہے اور نشاط انگیزی توفیقِ آدم ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

"ہر چند خردمند بیدار مغز تو تاریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے۔ لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے۔"

یہ ذوق بخشی و نشاط انگیزی افیون نہ تھی بلکہ خردمندی اور بیدار مغزی کی دلیل تھی۔ وہ خردمندی اور بیدار مغزی جس میں انسان کے کتنے ہی خواب اور ان کی تعبیروں کی تلاش مضمر تھی۔

داستانوں کے مطلع سے ہمارے تخیل اور تصور کا سورج ہی طلوع نہ ہوا۔ بلکہ ہماری داستانیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان داستان نگاروں میں خواب دیکھنے کی کیسی غیر معمولی سکت تھی۔ وہ سکت جس کے فقدان نے ہمارے جدید ادب کے بہت بڑے حصہ کو قانونی دستاویزوں کی طرح بے رنگ بنا رکھا ہے اور داستان نگاروں کے خواب کو عہد حاضر کی تسخیری قوت نے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے سینے سے فلک خراش عمارتیں ابھر آتی ہیں طلسمی قالینوں نے جیٹ ہوائی جہازوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور چاند کی بڑھیا ابنِ آدم کے انتظار میں ہے۔

داستانوں میں ہمیں مشرق اور برصغیر کی خارجی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کا ذہن اور اس کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں۔ داستانوں کی علامتوں میں زندگی کی حقیقتیں بڑی کلبلاتی ہیں۔ ان داستانوں نے عالمِ مخلوقات سے ہمارا رشتہ استوار کیا ہے۔ ان داستانوں سے زندگی کی محرومیوں کی تلافی کی صورت نکلتی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ داستانیں نیند لانے کا نسخہ بھی تھیں اور عرفانِ کائنات کا وسیلہ بھی۔

میری ناچیز رائے میں داستانیں ہمارے معاشرے اور سوسائٹی سے ادب کے رشتے کی سب سے مضبوط کڑی کا درجہ رکھتی تھیں۔ داستان نگاری بعد میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے داستان سرائی کے سہارے انجمن آرائی ہوتی تھی۔ اور شاید ہمارے ادب میں ڈرامے کے فقدان کا ایک سبب داستان کی مقبولیت بھی تھی۔ داستان سرا کی ذات اپنی جگہ خود ایک اسٹیج۔ پردوں اور اداکاروں کے مجموعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کبھی وہ اپنی چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی حرکات سے ہمیں میدانِ رزم میں پہنچا دیتا۔ اور کبھی پریوں کے دیس میں۔ اب اس کی جگہ سینما اور (ترقی یافتہ ممالک میں اسٹیج) نے لے لی ہے۔ لیکن ہمارا تصور آج بھی کسی داستان سرا کو تلاش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ داستان سرائی دلی میں میر باقر علی داستان گو کے ساتھ مر گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن آج بھی اُن علاقوں میں زندہ ہے جہاں خاندان اب بھی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں آج بھی نانی اماں کے پوپلے منہ سے ہر رات کہانی شروع ہوتی ہے۔ "ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ"...... اور یہ کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ اور سننے والے جوان ہو کر کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں۔ کالجوں میں پڑھانے لگتے ہیں۔ سیاہ لباس پہن کر کچہریوں میں "مائی لارڈ" کو مخاطب کرنے لگتے ہیں۔

میں نے اپنے لڑکپن میں داستان سرائی کی محفلیں دیکھی ہیں۔ نظیر آباد لکھنؤ میں ایک چائے خانہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ چائے والا چائے میں پوستہ

افیون ملا دیتا ہے۔ خدا جانے یہ بات سچ تھی یا جھوٹ۔ مگر یہ بات ضرور سچ تھی کہ جو ایک بار وہاں چائے پی لیتا۔ اس کے قدم بار بار اس چائے خانے کی طرف اٹھتے تھے۔ اور اسی چائے خانے میں چند آدمیوں کے درمیان۔ ایک آدمی دو تین موٹی موٹی کتابیں لیے بیٹھا رہتا۔ اور داستان سناتا رہتا۔ میں نے اسے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ کتاب کا مقصد شاید توجہ کو مرکوز رکھنا تھا۔ اور اس محفل کا یہ عالم ہوتا تھا۔ جیسے ہوش و گمان دونوں اس دنیا سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہاں حقیقتوں کے پیمانے بدل جاتے۔ جب امیر حمزہ صاحبقراں کسی طلسمی قید میں پھنستے تو تمام حاضرینِ محفل ہاتھ اٹھا کر ان کی رہائی کے لیے خلوص دل سے دعا مانگتے اور جب اسمِ اعظم کی تاثیر سے امیر حمزہ طلسم کو درہم برہم کر دیتے تو نگاہوں میں چمک آجاتی۔ سننے والوں میں سے کوئی اٹھتا قریب کی دکان سے مٹھائی لاتا اور سب میں تقسیم کی جاتی۔ یہ جلیبیاں کبھی کبھی ہمارے حصے میں بھی آجاتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جلیبیوں کی مٹھاس نے میرے لیے ادب میں نشاط انگیزی پیدا کر دی۔ اسے فیضان کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کروں؟

پتہ نہیں میں اپنے لڑکپن کی باتیں آپ سے کیوں کرنے لگا۔ شاید یہ بھی داستانوں کا اثر ہے جہاں "افسانہ از افسانہ می خیزد" ـــــ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آج جن داستانوں کے متعلق ہمارے بہت سے نقاد یہ کہتے ہیں کہ ان کا ماحول غیر فطری ہے ان کے کردار عجیب ہیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہیں یہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں ......... آج سے کچھ پہلے انہیں داستانوں میں سننے اور پڑھنے والوں کے لیے حکمت بھی تھی اور بصیرت بھی، ذوق جستجو بھی اور نشاط انگیزی بھی۔ ماہ و سال کی کروٹوں نے ہمیں دوبارہ اسی منزل سے قریب کر دیا ہے اور اب ہم زیادہ گہرے شعور کے ساتھ داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارا کافر ذہن ان پیمانوں سے داستانوں کو ناپنا چاہتا ہے۔ جو داستانوں کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے۔ مغرب کی روشنی میں آپ ناول افسانہ اور جدید نظم کا مطالعہ شوق سے کیجیے لیکن اس مانگے ہوئے اجالے کی مدد سے اگر آپ داستانوں کے خط و خال کو دیکھنا چاہیں گے تو ہر راہ تاریک ہو جائے گی اور کوئی جگنو بھی آپ کی رہنمائی نہ کرے گا پھر اس چشمۂ ظلمات سے شاید آپ لوٹ بھی نہ سکیں۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو آپ کی آنکھیں اپنے تہذیبی ماضی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

ادب کو زندگی کی تعبیر و تفسیر اتنی بار کہا گیا ہے کہ اب اس جملے کو لکھتے یا بولتے وقت ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ ادب صرف حقیقت (مروجہ اصلاح میں) نہیں بلکہ خواب بھی ہے۔ اور خواب بھی تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ داستان اپنا عالم آپ ہے۔ اسی لیے اس کے ماحول کو غیر فطری اور اس کے کرداروں کو عجیب کہنے والے سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ع     سخن شناس نہ دلبرا! خطا اینجاست

اور داستان سرائی کے بارے میں مرزا غالب یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ: "داستان سرائی منجملہ فنونِ سخن ہے"۔ آپ میں اگر ہمت ہو تو غالب کے اس فیصلے کو نہ مانیے۔

مگر ع     یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

تخیل داستان کی بنیاد ہے۔ اسی لیے داستان کی دنیا مثالی دنیا ہوتی ہے۔ جسے مناسب لفظ کی تلاش کے بغیر یاروں نے "عجیب" کا نام دے دیا ہے۔ بعض بڑے فن پاروں کی دنیا بھی تخیلی دنیا ہے۔ مگر تخیل کی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے اندازِ نظر کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کی ہر چیز حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامے "خوابِ شبِ نیم گرما" کو پیش کیا جا سکتا ہے ادب کی اس سے بڑی قوت اور کیا ہوگی کہ وہ ہمیں نئی دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دنیا مثالی ہے تو جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالی دنیا داستانوں میں نہ ہوگی تو کیا ہمارے اس ذلیل معاشرے میں ہوگی؟ ـــــ داستانوں میں ہمیشہ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ حسن ابدی ہوتا ہے۔ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ "پھول عورت بن جاتا ہے اور عورت ہوتی۔ یہ فریب سہی، مگر یہ فریب بھی کتنا سچا ہے۔ یہ فریب ہمیں انسانیت کے تصور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور رہا حسن ...... آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی یہ لالہ و گل بن جاتا ہے۔ کبھی خندہ برق و شرر ......... عورت ہو یا زندگی یا حقیقت .. ...... ان تینوں کو بھیس بدلنے میں ملکہ

حاصل ہے ............ اور ؎ عاشق ہو تو معشوق کو ہر رنگ میں پہچان

اس بات کو جاننے کے بعد کہ داستان اپنی دنیا آپ ہے، یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ یہ "احساسِ تناسب" ہمارے ذہن میں جدید ادبی اصناف کی تنقید نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ اصطلاح اتنی مختصر ہے کہ داستانوں کے جسم پر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ داستانوں میں اُلو، طوطے اور گیدڑ کی باتیں تو ہم پڑھ لیتے ہیں، مگر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ الّو فلسفی بھی ہے اور ہمارے اس وجود کا غماز بھی جو خواب دیکھتا ہے ......... جو طرزِ تپاک اہلِ دنیا سے جل کر وہاں جانے کی تمنا کرتا ہے: "جہاں کوئی نہ ہو۔" طوطا "ناصح بھی ہے اور مرشد بھی۔ جو کبھی ہیرو کو شہزادی سے ملا دیتا ہے۔ اور کبھی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے۔ گیدڑ کے بارے میں اس دور میں کیا عرض کروں ......... یوں سمجھیے کہ یہ جانور اور یہ علامتیں رموزِ مملکت کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔

عدیم المثال کردار اور غیر معمولی چیزیں مثلاً چراغ الہ دین وغیرہ کے بارے میں چند اشارے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ ایک بات اور (کہتا چلوں کچھ باتیں آگے آئیں گی) وہ یہ ہے کہ ایسے تصوّرات اس عہد سے مخصوص ہوتے ہیں جب آدمی لڑکپن سے گزر کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اُس دور میں "جاگتے کے خواب" دیکھتا ہے۔ کیا کبھی آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ اگر آپ کے پاس کوئی طلسمی انگوٹھی ہوتی تو آپ اس کی قوت سے بہت میٹھے "بادلر" بن جاتے ہیں اور پھر ہندوستان انگلستان کی ٹیم کو عبرت ناک شکست دیتا۔ یا چراغ الہ دین کی مدد سے ایفل ٹاور فرانس سے اٹھا کر اپنے دیس لے آیا جاتا۔ یہی حال تہذیبوں کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کو تہذیبوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ کہہ لیجیے۔ ہماری داستانیں قرونِ وسطیٰ کی یادگاریں ہیں۔ اور دنیا کے ہر ادب کے قرونِ وسطیٰ کے کارناموں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا "باغ و بہار" سے کیا تعلق ہے؟ میں نے اس کا جواب سوچ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے یہ باتیں کہنی ہی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ باغ و بہار بھی ایک داستان ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں داستانوں کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔ ویسے اس بات پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ہم خلاؤں کو فتح کر رہے ہیں اور دوسری طرف داستانوں کی دنیا کو اپنے لیے اجنبی پاتے ہیں۔ حسرت کی طبیعت ہی "طرفہ تماشا" نہ تھی ہماری طبیعت بھی طرفہ تماشا ہے۔ باغ و بہار میں داستان گوئی و داستان نگاری کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مگر درمیان میں "میر امن" کی ذات بھی ہے۔ ہر خصوصیت اسی "فلٹر" سے گزر کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اسی لیے باغ و بہار ہماری داستانوں کی روایت کا حصہ بھی ہے۔ اور ان سے مختلف بھی۔

اردو کی اولین داستانوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے۔ انھیں مثالیہ قصّہ کہنا مناسب ہوگا۔ ایسے قصّوں کی نمائندگی کے لیے "سب رس" موزوں رہے گی یہ انداز مشرقی داستانوں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ مگر باغ و بہار یا بعد کی داستانوں میں اولیت مثالیہ یا تمثیلی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ قصّے کو حاصل ہے اسی لیے باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی سیر محض روحانی تجربے کا اظہار نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک مادّہ پرست نقاد نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ارضی کہانیاں ہیں۔ روح اس زمین پر بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں میں روحانی تجربوں کی جھلک بھی ہے۔ مگر اولیت قصے ہی کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں "باطنی حقیقت" کا اظہار تو ہے۔ مگر یہ باطنی حقیقت "مقصود بالذّات" نہیں ہے۔

"تلاش و جستجو" "سب رس" میں بھی ہے اور "باغ و بہار" میں بھی۔ سب رس میں تلاش ابدی حقیقتوں کی ہے اور "باغ و بہار" میں "شہزادیاں" اور گمشدہ محبوبائیں گوشت پوست بھی رکھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی پیش کش پر روحانی تجربے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ تلاش و جستجو کے یہ افسانے صرف ہماری زبان تک محدود نہیں بلکہ ان کا عالمگیر سلسلہ ہندوستان اور ایران سے لے کر "آئرستان" تک پھیلا ہوا تھا۔ "سب رس کے سلسلے میں افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھا ہے۔

"یہ سلسلہ تلاش و تجسس کے افسانوں کا سلسلہ ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے۔ جو پھول بھی ہے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی ......... اس پھول کی تلاش رازِ حیات کی تلاش ہے اور یہ گل و بلبل کے قصوں سے زیادہ پرانی ہے کبھی تلاش کے قصّوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرفِ مقدس یا نایاب ہیرا ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ ترین شوکت و شانِ شاہانہ کا رمز ہے ......... تلاش کے قصّوں کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں "چشمۂ آبِ حیات" کی تلاش ہے ......... مگر دراصل یہ تینوں گروہ ایک ہی

بگاڑ لی پھول بھی ہے۔ چشمہ بھی اور عورت بھی۔" (ترقی پسند ادب صفحہ ۲۳ تا ۲۲۲)

ایسی تمام داستانوں میں ہیں "دورانِ محض" سے واسطہ پڑتا ہے "زماں" (وقت) سے نہیں۔ "مکان" کے سلسلے میں مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ تلاش کے عمل کے لیے "مکان" ضروری ہے۔ "باغ و بہار" میں دورانِ محض نہیں بلکہ وقت ہے۔ اسی لیے میں اس داستان کو محض روحانی تجربہ نہیں سمجھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مثالیہ قصوں میں تلاش کے عمل سے "مکان" اور "اشکال" وابستہ ہیں۔ مگر باغ و بہار میں "وقت" ہے۔ اور اسی لیے اس میں "اشکال" نہیں بلکہ "کردار" ہیں۔ وقت اور اس کے تقاضوں کے مطابق یہ بدلتے ہوئے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ باغ و بہار محض مثالیہ قصہ نہیں ہے۔

"باغ و بہار" کے کردار متحرک ہیں اور ہماری آپ کی طرح زندہ۔ پہلی کہانی کا درویش بھلا آدمی تھا مگر "آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر وقت کے کہنے سننے" سے اس کا "مزاج بہک" گیا۔ اور اگر اس کا مزاج نہ بہکتا اور وہ "آدمیت" کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا تو کہانی آگے نہ بڑھتی۔ اسے سفر سے واسطہ نہ پڑتا۔ اور وہ بھی اپنے باپ "خواجہ احمد" کی طرح یمن کا "ملک التجار" بنکر چین کی بانسری بجاتا اور گھوڑے بیچ کر سوتا۔

میرامن کے فسانے میں صرف شہزادے۔ شہزادیاں۔ بادشاہ۔ وزیر اور امراء نہیں ہیں۔ ان کے کرداروں میں سوداگر۔ عام آدمی اور کنیزیں بھی ہیں (آپ کا دل چاہے تو انھیں "صوفیانہ" شکلیں اور معنی دیدیں) دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش شہزادے ہیں۔ مگر پہلا درویش جس کی سیر میں سب سے زیادہ تکمیل موجود ہے۔ وہ سوداگر اور خواجہ زادہ ہی ہے۔ خواجہ۔ سگ پرست کی کہانی میں انسانی فطرت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ بہزاد خاں کی شجاعت۔ تیسرے درویش کی کہانی میں کٹنی کی مکاری۔ اور پہلے درویش کی "بہن کی ممتا" اور جذبے کی گہرائی ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ باغ و بہار کے بہترین عناصر پر شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں بلکہ عام آدمی کا ابھرا ہوا ہے۔

آدمی اور زمین سے میرامن کی بے پایاں محبت نے باغ و بہار کو اردو کی دوسری داستانوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ باغ و بہار داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے اور ایسا دریچہ بھی جس سے پہلی بار ہم آدمی کے دل میں جھانکتے ہیں۔ باغ و بہار میں بھی مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے قصوں کی "ارضی" ہے۔ مگر بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے میرامن کو "ملک شہبال" کا سہارا لینا پڑا۔ جن اور پری اس کہانی کی بنیاد نہیں ہیں۔ ان کا سایہ بہت دور سے باغ و بہار پر پڑا ہوا نظر آتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولیے کہ باغ و بہار ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرون وسطیٰ کا ذہن رکھتا تھا اسی لئے مافوق الفطرت عناصر سے نہ بھاگ سکتا تھا۔ جنوں اور پریوں کا ذکر اور مافوق الفطرت عناصر تو عہد وسطیٰ کے ادب کی خصوصیات ہیں اور میرامن بھی اسی دور کے آدمی ہیں۔ ان کے دور کا عام آدمی ان عناصر پر ذہنی طور پر اعتقاد رکھتا تھا۔ آج بھی آپ کی نانی جان یا دادی جان (اگر وہ زندہ ہوں تو خدا ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے) ان باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ بچہ مضمحل ہوتا ہے تو اسے نظر بد سے تعبیر کرتی ہیں۔ محلے کی کسی کنواری لڑکی پر "ہسٹریا" کے دورے پڑتے ہیں تو "عامل" کو بلانے پر اصرار کرتی ہیں۔ میرامن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی دیر تک انسانی زندگی سے دور نہیں رہتے وہ "دیدۂ وا" کے ساتھ اس عہد کی زندگی اور اس کی رنگارنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے "باغ و بہار" میں ان کے عہد کا معاشرہ اور زندگی سمٹ کر آ گئی ہے۔ (نہ جانے یہ کس کا کمال ہے۔ میرامن کا۔ یا فارسی قصہ چہار درویش کے نامعلوم مصنف کا)

"باغ و بہار" قصہ گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے جو قدرت نے میرامن کو ودیعت کی تھی۔ "باغ و بہار" میں "بوستان خیال" اور "طلسم ہوشربا" کی سی وسعت اور طلسم بندی تو نہیں ہے لیکن میرامن کہانیوں کا سلسلہ یوں ملاتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانیوں کی فضا میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور یہی کہانی کہنے کا فن ہے۔ (داستان کا ایک اہم عنصر دلچسپی ہے) ان کی کہانیوں کی رفتار میں حرکت بھی ہے اور توازن بھی۔ "باغ و بہار" پر جدید تقاضوں کا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ "داستانوں میں احساس تناسب نہیں ہے" ان کی کہانیوں میں بعض پراسرار واقعات بھی ہیں جو شروع میں بظاہر ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے۔ گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور واقعات سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ مثلاً پہلے درویش کی کہانی میں شہزادی کا عجیب و غریب رویہ ــــ ان کہانیوں میں "ارضیت" صرف کہانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں میرامن کے اسلوب کا بھی دخل ہے۔

میرامن کے یہاں رکاوٹ اور ٹھہراؤ نہیں۔ نہ اسلوب میں نہ کرداروں میں۔ رجب علی بیگ سرور کے کردار بڑی حد تک بے جان ہیں اس کے برعکس میرامن کے کرداروں میں ہمیں زندگی ملتی ہے اور تند و تیز انسانی جذبات بھی۔ یہاں "اسم اعظم" بھی جنسی جذبہ کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ پہلے درویش کی

سیر میں شہزادی کی نفرت کتنی انسانی اور کتنی شدید ہے۔ یہ نفرت اس "بے وفا" اور اس "بدروز" کے خون سے بھی اپنی پیاس نہیں بجھا سکتی اور درویش سے دوری کی تہ میں ان "دونوں" کی نفرت ہے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو ان کا شریک محفل اور شریک جام کیوں بنایا؟

میرامن کے کردار تخیلی یا ان کے "ہمزاد" نہیں ہیں۔ وہ اپنی شخصیت رکھتے ہیں اور داستان گو کو جہاں چاہتے ہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ داستان گو مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ کرداروں کے ساتھ سیر کرنے پر مجبور ہے مگر اپنے "بیانیہ" میں وہ اپنی مختاری کا اظہار کرتا ہے مشرق وسطی کے ایک دیس میں اسے جون پور کا پلیا دآتا ہے۔ بصرے کی شہزادی سے وہ ہندی کے دوہے پڑھوا دیتا ہے۔ کسی بتکدے میں وہ لات و منات کو بٹھا دیتا ہے۔ (اس اعتبار سے میرامن اور انیس کے درمیان مجھے ہمیشہ مشابہت کا احساس ہوا ہے)

# توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت

نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کس طرح شروع کیا، اس کی داستان بہت دلچسپ ہے محض حسن اتفاق سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ایسے مبارک وقت اس کا آغاز ہوا کہ اس سے نذیر احمد کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور اردو زبان کو ایک ایسا عظیم المرتبت مصنف ہاتھ آیا جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

یہ حسن اتفاق کیسے پیش آیا، اس کی تفصیل خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں بڑے دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے اور انھیں کی زبانی سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا، لیکن پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں، نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے کے لیے اور جس کو ایک صفحہ کی استعداد تھی، وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا۔"

"اتنے میں کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر تانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ کر تانگن پر سے اتر کر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو!

بشیر: چند پند

صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

بشیر: یہ کتاب میرے والد نے میرے لئے بنا دی ہے۔

صاحب: کتاب کا مضمون کیا ہے؟

بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔

صاحب: مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

بشیر: میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دور سے لوٹ کر)

میں آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

"بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا"

"شام کو میں جو کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کہ کیا

مونا لگتا ہے۔ میں تم سب کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔"

"اگلے دن میں جو کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید ان کتابوں کو دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خرے کی صفائی میں بہت سے اچھے خوش خط۔ اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آگئے۔ جلتی ہوئی جلدیں بنا کر، صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے، میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنے طرز معقول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی ٹائم پیس میرا نام کندہ کر کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب اور اپنے ریویو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔"

"وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کار بیش کند، میں نے بھی تصنیف کا ڈربہ کھول دیا اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پٹے پھیر دیئے ہیں، بند نہیں کیئے۔"[1]

یہ ۱۸۶۹ء کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے مولانا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر س آف اسکولس کے عہدے پر فائز تھے۔ محض ایک حسن اتفاق سے ان کی رسائی سر ولیم میور تک ہو گئی تھی جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ سر ولیم میور کے حکم پر انھوں نے انکم ٹیکس کے قانون اور اس کے بعد قانون تعزیرات ہند کا اردو میں بہترین ترجمہ کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ محکمہ تعلیم سے محکمہ مال میں عہدہ دار بندوبست کی حیثیت سے لیے گئے تھے۔ محکمہ تعلیم سے ان کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ محض دوسرا حسن اتفاق تھا اور اردو زبان کی خوش بختی تھی کہ اس صوبے کے انگریز ناظم تعلیمات میتھیو کیمپسن دورے پر اس مقام پر گئے جہاں مولانا نذیر احمد متعین تھے۔ بالکل ہی اتفاقی طور پر ان کی مڈبھیڑ مولانا کے صاحبزادے میاں بشیر الدین احمد سے ہو گئی اور وہ کتابیں جو محض خانگی استعمال کے لیے لکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ آگئیں۔ یہ کیمپسن کی جوہر شناسی تھی کہ انھوں نے بیک نظر ان کتابوں کی اہمیت اور ان کی خوبی کو پرکھ لیا۔ انھیں گورنمنٹ میں پیش کر کے ان پر انعام دلایا۔ اس ہمت افزائی نے مولانا نذیر احمد کے حوصلے بلند کر دیئے اور انھوں نے انتھک محنت سے ایک سے ایک اچھی کتاب لکھی اور اردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے ان کا مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے مولانا نذیر احمد کی دریافت کا سہرا کسی اور کے نہیں مسٹر میتھیو کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے سر بندھتا ہے افسوس ہے کہ ان کے تفصیلی حالات مجھے نہ مل سکے مولانا کے اسی محولہ بالا لکچر کے ایک حاشیہ میں بشیر الدین احمد مرتب "لکچروں کا مجموعہ" نے لکھا ہے کہ کیمپسن صاحب ایم اے تھے۔[2]

انگلستان کی کس جامعہ کے ایم اے تھے، یہ واضح نہ ہو سکا۔ اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے دوران میں جو بھی انگریز عہدہ دار ہندوستان بھیجے جاتے تھے ان میں بیشتر عہدہ دار عربی، فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کافی درک رکھتے تھے۔ غالباً کیمپسن عربی اور فارسی سے واقف تھے۔ اور مولانا نذیر احمد سے جو معاملہ پیش آیا اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے انھیں اردو بہت اچھی آتی تھی مولانا کے ادبی قدردان سر ولیم میور کے داماد بھی تھے۔ چنانچہ بشیر الدین احمد نے اسی حاشیہ میں لکھا ہے:

"سر ولیم میور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے انھوں نے ہی مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔"[3]

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس اپنی بچیوں کے لیے لکھی تھی اور اسے دریافت کر کے گورنمنٹ میں پیش کر کے انعام دلانے اور عوام تک

---

[1] نذیر احمد کے "لکچروں کا مجموعہ" جلد دوم، چالیسواں لکچر ص ۴۳۶ — ۴۳۸۔ مرتبہ بشیر الدین احمد مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء

[2] ایضاً، حاشیہ ص ۴۳۹

[3] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۳۹

پہچاننے کی سعادت کیمپین صاحب کے حصے میں آئی تھی، لیکن اس کتاب کے لکھنے کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں مولانا نے عائلۃ المسلمین کو پیش نظر رکھ کر توبۃ النصوح لکھی تو اس کتاب کو بھی گورنمنٹ میں پیش کرنے کا افتخار کیمپین صاحب کو حاصل ہوا۔ اسی لکچر میں مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں:

"اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو میری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرالٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجود اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے۔ اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔" [1]

مسٹر میتھیو کیمپین مولانا نذیر احمد کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کتابوں کو انھوں نے خود ہی گورنمنٹ میں پیش کیا، اپنے شخصی اثر سے کام لے کر ان پر مولانا کو انعام دلایا، ان کو نصاب میں شامل کر لیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک کی شرح بھی لکھی۔ انعام کے لیے توبۃ النصوح کو گورنمنٹ میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں اس کتاب کو مولانا کی اس وقت تک کی لکھی ہوئی تمام کتابوں سے افضل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میں اس کتاب کو مصنف کی مرآۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔" [2]

راقم نے مرآۃ العروس کا انگریزی ترجمہ اور توبۃ النصوح کی شرح نہیں دیکھی لیکن توبۃ النصوح کا ترجمہ دیکھا ہے، اس مضمون میں اسی انگریزی ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسٹر میتھیو کیمپین نے توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ مولانا نذیر احمد کی اجازت سے اس وقت کیا ہے جب کہ مولانا ریاست حیدر آباد دکن کے بیدار مغز وزیر اعظم نواب سالار جنگ اول کی طلب پر حیدر آباد چلے گئے تھے اور اس ریاست میں ناظم محکمۂ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مسٹر کیمپین کا یہ ترجمہ "THE REPENTANCE of NUSSOH" کے نام سے انگلستان کے ایک ایسے مشہور ناشر ادارے نے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا جو اس زمانے میں مشرق اور مشرقی علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شایع کر رہا تھا اس ادارے کا نام ہے:

**" W.H.Allen & Co, 8, Waterloo Place, London, 1884 "**

ترجمہ کی ابتدا میں مترجم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مترجم کا دیباچہ

یہ ہندوستانی نقص حس کا آزاد ترجمہ اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں ملازمت کے دوران میں میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے مصنف خان بہادر مولوی حاجی حافظ نذیر احمد، ناظم محکمۂ مال ریاست حضور نظام، حیدر آباد دکن) نے اسے شایع کر دیا۔ اگرچہ کہ اس کتاب کا علم اہل یورپ کو بہت کم ہے، لیکن آگرہ اور لکھنؤ کے مقامی مطبعوں سے اس کے کئی اڈیشن

---

[1] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۴۰

[2] توبۃ النصوح کی "تقریظ" کے ایک حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے: "واضح ہو کہ اصل کتاب کے حاشیہ پر عند الملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے دست خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت خط پنسل سے لکھ دی تھی۔ چنانچہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ہوا ایما و اشارہ کے مطابق کتاب میں ترمیم کر دی۔"

[3] "چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم"، تقریظ توبۃ النصوح۔

شایع ہو چکے ہیں۔

میں نے تین وجوہ کی بنا پر اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنی ہم جنس ہندوستانی رعایا کی حالت اور ان کی ترقی سے جتنی دل چسپی ہے، اگر وہ کتاب پڑھیں تو مجھے یقین ہے انھیں اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کتاب میں ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ میں اصل کتاب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ مستعمل زبان میں اب تک کی چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ یہی زبان اس زبان کے وطن دہلی میں بولی جاتی ہے جہاں کا یہ قصہ ہے۔

توبۃ النصوح اور اس کے ساتھ ہی دوسرا قصہ مراۃ العروس دونوں ہی پہلے پہل مصنف کے افراد خاندان کے خانگی استعمال کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں زندگی اور عادات و اطوار کی جیسی تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس ملک کا باشندہ ہی پیش کر سکتا تھا۔

اس کتاب کے مصنف ایک بڑے عالم ہیں اور مشرقی مکتب فکر کے علم کلام کے ماہر ہیں وہ عرصۂ دراز تک انگریزی حکومت کے تحت ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ ادھر چند سال پہلے سر سالار جنگ مرحوم نے انھیں حیدرآباد کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک اہم عہدے کے لیے منتخب کیا تھا اس عہدے پر وہ اب تک فائز ہیں۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ ان کی اجازت سے کیا ہے۔

ستیفیو کیمپین ۔ اسکوٹ۔ ۱۸۸۴ء

اس کے بعد مترجم کے خسر سر ولیم میور کا مقدمہ درج ہے جو چار صفحوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سر ولیم میور، مولانا نذیر احمد کے اولین قدر شناسوں میں تھے۔ مولانا کو جو شہرت، جو عزت اور جو مرتبہ حاصل ہوا اس میں سر ولیم میور نے صوبہ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ ادا کیا ہے

ولیم میور ۱۸۱۹ء میں بمقام گلاسگو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاسگو کے ایک تاجر تھے۔ اپنے والد کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جان میور سنسکرت کے بڑے عالم رہے ہیں۔

ولیم میور ۱۸۳۷ء میں پہلی بار ہندوستان آئے۔ مال گزاری کے تعین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی خدمت پر کانپور، بندھیل کھنڈ اور فتح پور میں دس سال تک مقیم رہے۔ ۱۸۴۷ء میں شمال مغربی صوبے کے گورنر معتمد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں وہ اسی صوبے کی مجلس مال کے معتمد بنائے گئے۔ ۱۸۶۸ء میں انھیں شمال مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنری کے عہدۂ جلیلہ میں ترقی دی گئی اور ۱۸۷۴ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ ۱۸۷۶ء تک وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی کونسل کے رکن فینانس رہے اور اسی خدمت سے وظیفۂ حسن خدمت پر حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے وہ انگلستان پہنچے تو لارڈ سالسبری نے انھیں کونسل آف انڈیا کا رکن نامزد کیا۔ ۱۸۸۵ء میں کونسل آف انڈیا کی رکنیت سے استعفا دے کر انھوں نے ایڈنبرا یونیورسٹی کی چانسلری قبول کر لی اور مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے اس یونیورسٹی کی بڑی خدمت کی اسی یونیورسٹی سے انھوں نے مولانا نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دلائی۔

سر ولیم میور کو عربی اور اردو خوب آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انھیں کے مشورے سے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ ملکہ کو اردو زبان سیکھنے میں بھی سر ولیم میور نے مدد دی تھی۔ الہ آباد کا میور کالج اور الہ آباد یونیورسٹی دونوں انھیں کی گورنری کے عہد میں قائم ہوئے۔ تاریخ اسلام سے انھیں شروع ہی سے دل چسپی رہی۔ ہندوستان میں قیام کے دنوں میں وہ "کلکتہ ریویو" میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ان ہی مضامین کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "حیات محمد" (LIFE OF MOHAMMAD) چار جلدوں میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء تک شایع کی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ اور اس کے بعض مضامین ہندوستانی مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اسی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سر سید نے اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان کا سفر کیا اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے سوا سر ولیم میور نے مسلمانوں سے متعلق اور بھی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ابتدائی خلافت اور اسلام کا عروج ۱۸۸۳ء (۲) سلاطین مملوک مصر کا غلام خاندان ۱۸۹۶ء (۳) قرآن اس کی ترکیب و تعلیم ۱۸۷۸ء (۴) قرآن مجید کے اقتباسات انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۰ء (۵) الکندی کی کتاب العتذار کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۷ء — ۱۸۸۱ء - (۶) مسلمان

کو توریت، زبور اور انجیل کے دیکھنے اور پڑھنے کی دعوت ۱۸۹۷ء۔

۱۸۸۴ء میں وہ اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے، اسی حیثیت سے انھیں ۱۹۰۳ء میں جوبلی گولڈ میڈل عطا ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں جامعہ آکسفورڈ نے ڈی سی ایل کی اور جامعہ گلاسکو اور جامعہ اڈنبرا نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

سر ولیم میور نے ۱۹۰۵ء میں بمقام اڈنبرا وفات پائی۔

سر ولیم میور نے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمہ پر جو مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، اب اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یہ مقدمہ بھی ان کی کتاب "حیات محمد" کی طرح تعصب و تنگ نظری سے خالی نہیں۔

## مقدمہ

"ہندوستان کی دیسی زبانوں میں دل چسپ اور کارآمد ادب کی بہت کمی ہے۔ ان زبانوں میں ایسی کتابیں بہت ہیں جن کا بڑا حصہ قابل اعتراض باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان زبانوں میں ایسی دل چسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سرے سے موجود نہیں جو بچوں یا صنف نازک کے لیے موزوں ہوں۔ اس طرح تعلیم اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شوہروں اور باپوں کو فطری طور پر قابل اعتراض کتابوں کے پڑھانے میں بڑا تامل ہوتا ہے۔

آج سے کوئی دس سال پہلے دیسی زبانوں میں اچھی کتابوں پر انعامات کے ایک اعلان کے سلسلے میں کتاب توبۃ النصوح مسٹر کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات شمال مشرقی کے پاس پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کیا گیا تھا۔

مصنف کو توبۃ النصوح پر ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کرتے ہوئے حسب ذیل احکام مسٹر کیمپسن کے نام جاری کیے گئے تھے۔ یہی احکام صوبجات شمال مشرقی کے سرکاری گزٹ بابت ۱۸۶۹ء میں شایع کیے گئے تھے۔

"کتاب کا مقصد اور زبان دونوں نہایت قابل تعریف ہیں۔ واقع میں بیان کی قوت اور جودت عبارت کی سادگی اور بے ساختگی اور محاورات کی سلاست اور عمدگی جو اس کتاب میں ہے شاید اردو کی اور کسی کتاب میں نہ ہو۔ اور بڑی صفت یہ ہے کہ ہندی، فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش اس بے تکلفی کے ساتھ ہے جو دلی کی زبان میں پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ضرب المثل باتیں اور بخصوص روزمرہ کی گفتگو کے مستعمل فقرے اس کثرت سے ہیں کہ ان کے سبب سے کتاب مذکور بہت ہی فائدہ مند معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک بات نہایت عمدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خانگی حالات بھی اس میں مشرح بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے سبب مراۃ العروس کے اہالیان یورپ کے لیے بھی جو اس کا مطالعہ کریں تو موجب آگاہی اور واقفیت ہے۔

اگرچہ اصل مضمون اس کتاب کا مذہبی باتوں سے علاقہ رکھتا ہے، لیکن مصنف نے شروع کتاب میں صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ مذہب سے علیحدہ امور خانگی میں اخلاق کی تعلیم کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور اس بات میں اس نے اپنی رائے نہایت مستحکم عبارت میں ظاہر کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ خانہ داری اور بود و باش باہمی کے واسطے نیکی اور خوش خوئی کا ضروری ہونا بغیر تعلق مذہبی ثابت کروں۔ لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا قصد کرنا گویا روح کو قالب سے، شعاع کو آفتاب سے، عرض کو جوہر سے، ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔ سو اس بیان کے مطابق اس قصے سے یہ نصیحت نکلتی ہے کہ سرگرمی اور صدق دل سے عقائد مذہبی کی پیروی کرنا ہی خانہ داری میں خوش حالی کی مستحکم بنا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ مصنف کے اس قاعدے پر رایوں کا اختلاف واقع ہوگا۔ مگر مشارٌ الیہ نے جس حسن عقیدت اور خلوص نیت سے اپنے مطلب کو برعایت مذہب اسلام ادا کیا ہے، اس کی نسبت کسی کو اشتباہ نہ ہوگا ............ لیکن جب نواب ممدوح نے کل کتاب کو بغور ملاحظہ فرمایا تو اس بات سے تسکین ہوئی کہ مصنف نے اپنے قصد کو کہ کوئی امر متعلق مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو، اس میں داخل نہ ہونے دے، بہت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اور عموماً ایمان اور عقائد مذہبی کے ضمن میں جو جلائل حقائق مندرج ہیں ان کو اس قدر استحکام دیا ہے کہ جو نصیحتیں اس میں کی ہیں ان سے استنباطاً غیر مذہب والے بھی بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور اس باب میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف اہل اسلام بلکہ ہندو اور مسیحیوں کو بھی پسند خاطر ہوگی۔ ایسے مناظر جیسے چھوٹی لڑکی کے مکالمے

فہمیدہ کے ساتھ در باب ان امور کے جن کا ذکر نا خالق کی جناب میں اس پر فرض تھا وہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرے ہوئے ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو۔

اس صورت میں جناب سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس کتاب کا داخل مثالے اشتہار مذکور کرنا مناسب ہے۔ اس کو داخل کر کے جناب ممدوح کو خوشی تمام پورا انعام ایک ہزار روپیہ کا عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے علم و ادب میں ایک عمدہ تصنیف ہے اور اہل اسلام کو بہت پسندیدہ ہوگی اور دیگر اقوام میں بھی بہت رواج پکڑے گی۔ [1]

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کی اس وقت جو حالت ہے، اس کے پیش نظر انگریز طالب علموں کو بہترین اردو بولنا اور لکھنا سیکھنے کے لیے ہمارے مصنف کی مذکورہ دو کتابوں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی ان کا روزمرہ وہ خالص زبان ہے جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی کہانیاں مسلمانوں کی مخصوص حالات اور ان کے عادات و اطوار کی مفید مثالوں سے بھری پڑی ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں خاص طور پر ان انگریز خواتین کے لیے مفید ثابت ہوں گی جنھیں شمالی ہند کے زنان خانوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مسٹر کیمپسن نے اس کتاب کا ترجمہ ایمان داری اور لیاقت کے ساتھ کیا ہے انھوں نے اصل طرز انشا اور مقامی محاوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے اور مشرقی تصورات اور خیالات کو یورپی قاری کے لیے آسانی کے ساتھ قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے، یہ کام اکثر اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض ابواب اور مکالمے کیا طور پر مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ابواب اور مکالمے اصل میں غیر ضروری طور پر بہت طویل ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہتر رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے یہ رجحانات ہیں خیر کی ہمت افزائی اور شر کے دبانے کے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے قصے کا مذہبی رنگ اپنی آپ مثال ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں میں نے پڑھی ہیں، یہ کتاب ان سے اسی لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمانوں میں جو مذہبی کتابیں مقبول ہیں وہ مسلمہ طور پر خالصتاً رسمی ہیں اور ان میں صرف فرائض و واجبات اور دینی احکام ہی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خیال کہ مذہب کو ایک ہمہ گیر اثر ہونا چاہیے اور خاندان کو اسی کی رہنمائی میں اپنی گھریلو زندگی بسر کرنا چاہیے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس قسم کی کتاب لکھنے کا خیال صرف ایسے ہی ملک میں آسکتا ہے جو نصرانیت کے مذہبی تصورات سے متاثر ہو رہا ہو۔ ایسے ملکوں میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں یہ اثرات مسرت کے ساتھ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کا ایک ہمت افزا اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو وہ انگریزی ادب سے قریب قریب ناواقف ہی تھے اسی طرح انھوں نے انگریزی ادب کا اثر یا لکلیہ بالواسطہ قبول کیا ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اثر اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ بالواسطہ قبول کیا گیا ہے کتاب کا قصہ کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں۔ لیکن اس کے انگریزی خیالات اور تصورات کے حقیقی پیداوار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر کیمپسن کے ترجمہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھیں ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ میں ان کے اس خیال کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ ہندوستانی سیکھنے اور ہندوستانی میں مہارت کے امتحانوں کے لیے اصل کتاب بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جانی چاہیے۔

---

[1] مسٹر میتھیو کیمپسن نے کتاب توبۃ النصوح پر انعام عطا کرنے کے لیے جو مراسلہ حکومت کو لکھا تھا اور حکومت نے اس کا جو جواب دیا تھا مولانا نذیر احمد نے ان دونوں مراسلوں کا ترجمہ کر کے توبۃ النصوح کے بعد کے اڈیشنوں کے ساتھ "تقریظ" کا عنوان دے کر چھاپا تھا۔ مولانا کا یہی ترجمہ منشی نولکشور لکھنؤ کے چھاپے ہوئے توبۃ النصوح کے بارھویں اڈیشن (دسمبر ۱۹۱۴ء) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

ولیم میور ۱۸۸۴ء

اب جناب میتھیو کیمپسن صاحب کے کیے ہوئے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمے کی طرف آئیے۔ یہ ترجمہ چھوٹی تختی کے کل ایک سو اٹھارہ صفحات میں آیا ہے مترجم نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بڑی حد تک یہ آزاد ترجمہ ہے اگر آزاد ترجمہ نہ ہوتا تو یقیناً اتنے کم صفحات میں یہ ضخیم کتاب نہ سماتی۔ مولانا نذیر احمد نے اس کتاب میں وقت بے وقت نصیحتوں کا جو پٹارا کھولا ہے وہ بجائے خود بالکل درست و بجا ہوتے ہوئے بھی اکثر مقامات پر قصہ کی دلچسپی میں بہت حائل و مانع ہوتا ہے۔ یہ مواعظ کافی اکتا دینے والے ہیں۔ کیمپسن نے ان مواعظ کو اکثر جگہ حذف کر دیا ہے یا پھر مختصر الفاظ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس سے قصہ کی روانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ناول کی حیثیت سے کتاب زیادہ پرلطف ہو گئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ۱۲ باب قایم کیے تھے اور ان پر بڑے لمبے لمبے عنوان لگائے تھے۔ کیمپسن نے اپنے انگریزی ترجمے میں قصہ کے ابواب کی تقسیم میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور بارہ کی جگہ تیرہ باب قایم کیے ہیں۔ ابواب کے طول طویل عنوانوں کی جگہ بہت مختصر عنوان دیئے ہیں۔ کہیں کہیں ہندوستانی رسوم سے متعلق مختصر حواشی بھی ثبت کیے ہیں۔

آج کل اردو ادب کے شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ توبۃ النصوح کا یہ انگریزی ترجمہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے اور اس قابل ہے کہ تھوڑی سی نظرثانی کے بعد اسے دوبارہ شایع کیا جائے۔ جب کبھی بھی توبۃ النصوح، یا مولانا کی دوسری کتابوں کو انگریزی یا دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی نوبت آئے کیمپسن صاحب کا آج سے لگ بھگ اسّی سال پہلے کا کیا ہوا یہ انگریزی ترجمہ یقیناً ایک رہنما کا کام دے گا۔

---

## "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" (بقیہ ص ۱۳)

(بقیہ ص ۱۳)

اسی رجسٹر سے انتخاب کیے جاتے تھے۔

غالباً اس رجسٹر کی ضخامت چند ہی سال میں ہزاروں صفحات پر پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ اسلام کی روز افزوں تحریک نے بہت جلد باد و پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ اور قبائل جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس دیوان سے صرف اس قدر افراد کے نام قلمزد کیے جاتے ہوں گے، جو مر جاتے یا مرتد ہوتے! لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعداد نومسلمین کے مقابلے میں تھی ہی کیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس عمومی رجسٹر کے مقابلے میں وہ چھوٹے رجسٹر زیادہ اہم اور مفید تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غزوات و سرایا کے ذیل میں مرتب ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان سے شرکاء جنگ اور مقتولین و مجروحین کی ٹھیک ٹھیک تعداد کا اندازہ ممکن تھا؛ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں قسم کے رجسٹر عہد رسالت کے بعد بھی کچھ عرصہ محفوظ رہے تو ظاہر ہے تاریخ کا یہ بہت بڑا سرمایہ تھے جو ابتدائی مدونین اور رواۃ سیرۃ کی نظر سے گزر سکتا تھا۔

میں آئندہ فصل میں اس کی افادیت کو دوبارہ پیش کروں گا۔

---

# نامۂ مومن

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فارسی ادب میں ایک مدت تک سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور پنج رقعہ کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور اسی انداز کو معیاری مقام حاصل تھا۔ مومن کے فارسی انشا کا بھی یہی انداز رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا وہ مرتبہ نہیں جو ظہوری کا ہے مگر ان کے انداز بیان نے ظہوری سے قربت ضرور حاصل کرلی ہے۔ اس وقت مومن کے فارسی انشا سے بحث مقصود نہیں۔ صرف چند باتیں اس خط کے متعلق عرض کرنا ہیں۔ تاکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ ادبیات کے حسن و قبح کا فیصلہ ذوق و وجدان پر ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں فارسی کا سمجھنا چہ جائیکہ مومن کی فارسی کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے مومن کے خطوط کا ترجمہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

خط نہ کور انشائے مومن کا ستائیسواں خط ہے۔[۱] جو انھوں نے ایک مطربہ کے ناز بے جا کی شکایت میں لکھا ہے۔ اس خط کا جو عنوان حکیم احسن اللہ خاں (مرتب انشائے مومن) نے تحریر کیا ہے وہ یہ ہے: "نامۂ لبریز گلۂ ناز بے جا۔ بنام مطربہ ماہ جبینے زہرا نوا"۔ یہ خط کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے۔

۱۔ یہ خط مومن کی حیات معاشقہ سے متعلق ہے اور ان کی جوانی کی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس "ماہ جبیں" کا نام کیا تھا۔

۲۔ اس میں ایک حسین ڈومنی کے ناز بے جا کی شکایت کی ہے اور بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ جس میں مومن کا طنز اپنے پورے نکھار پر نظر آتا ہے۔

۳۔ تحریر میں بے حد رنگینی ہے اور اس رنگینی کے باوجود بے ساختگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ مقفیٰ عبارتوں، برجستہ اشعار اور دلچسپ تشبیہات نے اور بھی زور پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ حسب عادت مومن نے اپنے اس خط میں بھی "انا" اور "خودداری" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

مومن کی حیات معاشقہ کے سلسلے میں صرف "صاحب جی" کا نام ملتا ہے اگرچہ مومن نے اپنے چھ عشقوں کی داستان اپنی مثنویات میں لکھی ہیں۔ اور ان مثنویوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کا مکتوب الیہ ان محبوباؤں میں کون ہے۔ محض "صاحب جی" کا نام معلوم ہونے کی صورت میں ہر مثنوی اور ہر عشقیہ خط کو ان سے منسوب کر دینا مضحکہ خیز ہے۔ اس خط میں محبوبہ کے ناز بے جا کی شکایت ہے اور اس کی جفاؤں کا شکوہ جو ان کی تقریباً ہر مثنوی کا بھی موضوع ہے۔ افسوس ہے کہ اس خط کی تاریخ کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کاش حکیم احسن اللہ خاں نے جہاں اس کی ترتیب کا احسان کیا ہے وہاں تاریخ یا سنین کا بھی حوالہ دیتے۔

مومن کی جوانی عشق اور حسینوں کی چھیڑ چھاڑ میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی وہی انداز موجود ہے اور ان کے خطوط میں بھی یہ رومانی کیفیت ان پر اس قدر حاوی ہے کہ جب وہ اپنی پھوپی (والدہ حکیم احسن اللہ) کو بھی خط لکھتے ہیں تو اس میں رنگین اور رومانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کا موضوع سخن جہاں حسینوں سے ہوگا وہاں شوخی بھی ہوگی اور طنز بھی۔ یہ طنز خواہ مقصد براری کے لیے ہو یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شوخی اور طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ چند فقرے قابل غور ہیں۔

"ایسی جلاد کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے!

"ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے!

"ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے"[۲]

---

۱؎ ملاحظہ ہو انشائے مومن مخزونہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔

۲؎ جلادے کہ دست بخون بے گناہ آلاید و حنا پندارد و صیادے کہ اگر طائر بام حرم بدامش آید بے کشتن نگزارد، سخت گیرے کہ قصہ فرہاد و بے ستون بہ مٹی گل بر گرفتن گیرد۔

مومن کی نثر میں شوخی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو نثر مرصع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ چوں کہ یہ انداز ان کا اپنا مزاج ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں بیشتر رعایتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں نہ صرف قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ اس میں صنعت تجنیس اور ایہام تناسب کی مثالیں بھی موجود ہیں[1]۔ نئی نئی تشبیہات سے خط کو اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں ایک امر کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ خط انھوں نے ایک محبوبہ کے نام لکھا ہے اور بارگاہ حسن میں اپنی خودداری کا اظہار تو بڑی چیز ہے اپنے وجود کا تصور بھی محال ہے۔ اس خط میں جذبۂ خود نگہداری بھی موجود ہے۔ حوالہ جات ذیل سے نہ صرف ان کی بیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ذہنی تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔

"میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج"

"اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ دیتا ہوں"

"عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند"[2]

"میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی"

موجودہ طبایع ممکن ہے کہ اس انداز کو نہ پسند کریں اور اس کے مقابلے میں سادگی اور اختصار کو ترجیح دیں مگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے ماحول میں دیکھیں۔

# ایک مطربہ کے نام

## (ناز بے جا کی شکایت میں)

اے خانۂ فریاد نوا و بلبل کی طرح نالے کر کہ ایک گل گوش، غنچہ دہن تیری آواز پر کان لگائے ہے۔ اے نامۂ خونیں تحریر لالے کی خوشی سے پھول جا کہ ایک رنگین دل کے دست نگاریں میں تیری جگہ ہے۔ اے دل بے قرار مدد کر کہ ایک تغافل شعار نے میرا حال پوچھا ہے۔ اے درد جاں فرسا رحم کر کہ ایک عیسیٰ لب میری بے چارگی کے علاج پر متوجہ ہوا ہے۔ اے نازک معانی بہ نزاکت کا وقت ہے کہ ایک نازک دماغ نے پرسش حال کی ہے مگر میں اس کے درد سر سے ڈرتا ہوں۔ اے مضامین لطیف دل سے زبان تک آنے کا موقع ہے کہ لطیف مزاج میرے ملال کی چارہ جوئی پر آمادہ ہے مگر سخت کلامی کی سزا جانتا ہوں۔ اے میرے شب کی تیرگی میری سیاہی کے کام آ میں ایک ماہ رخسار کو دو حرف لکھنے والا ہوں اور اے میرے نصیب کی ظلمت مجھ سیہ کار کے خط کی تحریر میں مدد دے کہ میں ایک مہر لقا سے شام ہجر کی شکایت کرنے والا ہوں۔ اے دیدۂ خوں بار اشکوں میں جگر کے ٹکڑے گرا اس واسطے کہ میں لوح خط کی سرخی کے لیے حیران ہوں۔ اے زردی رخسار میرے آنسوؤں میں شامل ہو جا اس واسطے کہ مکتوب کی زر افشانی کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ اے دود جگر میرے نامہ کی سطر کا پیچ و خم بن جا، زلف پرخم کی حسرت حوصلہ فرسا ہے۔ اے شعلۂ پر شرر مدد کر، مضامین غم کی گرمی ہنگامہ کا وقت ہے۔

---

[1] اے خانۂ نظلم صریر بلبل آسا بنال، گل گوش غنچہ دہانے بر صدائے تست و اے نامۂ خونیں تحریر چوں شقایق بر خود ببال بہ نگاریں دست نگیں ادا جائے تو۔ "صریر" اور "تحریر"، "خامہ" اور "نامہ"، "ببال" اور "بنال" یہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ اس کے علاوہ "خامہ" "نامہ" "بنال اور ببال" میں صنعت تجنیس ہے۔ آگے بڑھ کر مومن نے ایہام تناسب سے کام لیا ہے۔ "بلبل" کی رعایت سے "صریر" کا لفظ لانا کہیں کہیں چار چار فقرے آئے ہیں + اور ہر فقرہ اپنے متقابل فقرے کے قافیہ سے ہم آہنگ ہے۔

[2] عاشق معشوقانہ مزاجم و باصد نیاز مندیہا بے احتیاج۔ مدعایم اگر دل بہ بے حاصلی نہد آں مدعا ی گزارم ........ عاشق و فا شعارم اما غیرت مند ........ بلبلم در ہر گلشن نغمہ نسراید و طوطیم بر ہر شکر لبے منقار نکشاید۔

رباعیات :-

اے لب ! افسانۂ تمنا کی کچھ بات سنا
اے نالے ! شوق حوصلہ فرسا کا کچھ ذکر کر
اے شخص ! اس نے آج وفا کی حکایت پوچھی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری داستان کا کچھ ذکر سننا چاہتا ہے۔

---

میں دیوانہ ہوں اور اس کے ساتھ اپنی دور اندیشی پر خوش ہوں۔
ایسے دیوانہ پر سو عقلیں قربان
اپنے خط کو کبھی چومتا ہوں، کبھی دل پر رکھتا ہوں۔
جانتا ہوں کہ یہ محبوب کے ہاتھ میں جائے گا۔

اے زبان ہرزہ درا ، بے ہودہ نالے نہ کر کیوں کہ ایک شوخ جفا شعار مخاطب ہے۔ اے نطق پریشاں نوا بے باکانہ فریاد نہ کر کیوں کہ ایک سخن ناشنو ظالم سے کام پڑا ہے۔

رباعی :-

ایسا شوخ جس نے کسی سے وفا نہ کی اور نہ کرے
جس نے کسی کی مشکل گرہ نہ کھولی ہے اور نہ کھولے
بے کار نالے کرنا کس لیے ۔ میں جانتا ہوں
کہ ہمارے حال پر اس نے رحم نہ کیا اور نہ کرے

اے اثر ! میری دادرسی کر میں ایک ظالم کے ہاتھ سے گرم فریاد ہوں۔ اے آسمان میری مراد کے مطابق گردش کر کہ میں ایک زہرہ جبیں کے سر کے گرد پھرنے سے محروم ہوں۔ اے آہ نارسا ! یہ بے سر اپن کیوں ہے۔ اسے شور فریاد کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرا روئے سخن کس کی طرف ہے ( اس کی طرف ہے ) جس کی ناہید نوائی دلوں پر اثر کرنے والی اور سرود سرائی محل اختیار۔ باربد کا ترانہ اس کی شیریں ادائی پر قربان اور حضرت داؤد کا نغمہ اس کے انداز کا دعا گو۔ اس کے کلام شیریں کی حسرت میں طوطی شیریں گفتار تلخ کام ہے اور اس کے سخن رنگین کے رشک میں باغ کا افسانہ بلبل کے لب سے ناتمام ہے۔ اس کی گوش آشنا آواز کی نرمی کے مقابل پھولوں کے کھلنے کی آواز خزاں دیدہ پتیوں کے شور سے مشابہ ہے اور اس کی طرب فزا گفتار کی نزاکت کے سامنے بانسری کا نغمہ کسی ماتم رسیدہ کے گلے کی فریاد کی مانند ہے۔

مثنوی :

اس کا لعل لب موتی برسانے میں
رخ معانی کے لیے آب و رنگ کا حکم رکھتا ہے
اس کے رنگین ہونٹ یاقوت کی تحریر ہیں
اس کے انفاس سحر ہا روشنا کا کام کرتے ہیں۔
اس کے انفاس کا افسانہ اعجاز سے کم نہیں
حضرت مسیح بھی اس کے غم میں جان دیتے ہیں
اس کے مژگاں کی تلوار مشتاقوں کی آہ کی طرح کاری ہے
اس کی چشم سیاہ عاشقوں کے نصیب کی طرح کالی ہے
اس کی نگاہیں دلبری میں سحر کرتی ہیں
اس نے جادوگری کو قصۂ ماضی بنا دیا ہے

اس کی پیشانی آئینہ تمثال ہے
صبح کی پیشانی اس کے روبرو سر بہ سجود ہے
اس کا رخسار اپنے دل افروز جمال سے
آفتاب کے جگر کا داغ (باعث رشک) ہے
قیامت اس کے قامت کے گرد پھرتی ہے
سو طرح کی بلائیں اس کے قد پر قربان ہوتی ہیں
جب وہ جلوہ دکھاتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے
جب وہ اٹھتی ہے تو فتنے اٹھاتی ہے
اس کی جلوہ گاہ کا غبار سراپا آشوب ہے
صحرائے قیامت اس کی گزرگاہ ہے
اس کے زلف کی حکایت بہت دراز ہے
یہ سمجھو کہ وہ میری شب ہجر کی ترجمان ہے
اس کے گیسوؤں کا ہر بال اپنے پیچ و خم سے
دانا اور نادان سب کے دلوں کے لئے جال کا کام دیتا ہے
نزاکت کے باوجود اس کی طبیعت
سنگ دلی کا بار اٹھاتی ہے
اس عادت میں سمن زار کی سی لطافت ہے
اس کی گلی میں چمن زار کی سی طراوت ہے
اس کا ہر غمزہ عاشقوں پر نظر رکھتا ہے
اس کا ہر عشوہ مشتاقوں کا آرزومند ہے
اس کا شیوہ دل ستانی
لوگوں کو لطف و مہربانی کے ساتھ زندگی بخشتا ہے

ارے میں نے کیا کہا۔ طریقہ دل ستانی اور شیوہ مہربانی کا کیا ذکر وہ تو ایسی بے مہر ہے کہ دل بھی جسے کھینچتی ہے۔ جفا اس کی طبیعت سے اتنی قریب ہے کہ فریاد بھی زبان مظلوم سے اس قدر قریب نہ ہوگی اور رحم اس کے دل سے اتنا دور ہے کہ ہنسی بھی غم رسیدہ کے منہ سے اس قدر دور نہ ہوگی۔ وہ ایسی خوں خوار ہے کہ میری چشم خوں فشاں کی طرح عاشقوں کا خون گراتی ہے اور ایسی ظالم جس کی گلی سے فتنہ عرصہ محشر کا غبار لے کر اٹھتا ہے۔ ایسی جلاد کہ بیگناہوں کے خون سے ہاتھ سے رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔ ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔ ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہکنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے اور ایسی بدعہد کہ شیریں اور شیرویہ کے وعدے کو وفا شعاروں کی درستی عہد ٹھہراتی ہے۔ ایسی بے درد کہ مظلوموں کے نالوں پر ہنستی ہے۔ ایسی بے رحم کہ پروانہ کی بالیں پر شمع کا رونا پسند نہیں کرتی۔ ایسی غلط اندیش کہ محتسب کو قتل کرنے کے لیے مستی کا بہانہ بناتی ہے اور ایسی کافر کیش کہ بادہ گلگوں کا مزا لے کر مومن کا خون پیتی ہے۔ ایسی زود خشم کہ کسی کو سزا دیتے وقت اتمام حجت کی تاخیر اس کو درازی روز حشر نظر آتی ہے۔ ایسی سیاہ چشم کہ شب ہائے فراق کی سیاہی اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ ایسی بے وفا کہ عہد باندھنے ہی کو ایفائے عہد سمجھتی ہے اور ایسی صبر آزما کہ عاشق کے دم واپسیں کو آغاز امتحان ٹھیراتی ہے:۔

رباعی: ایسی شوخ جس کی جفائیں نہیں اٹھائی جا سکتیں
ایک دن بھی اس سے مراد دل حاصل نہیں ہو سکتی
اگر اس نے میرا سرتن سے قطع کیا تو مشکل نہیں
مشکل تو یہ ہے کہ اس سے قطع محبت نہیں کر سکتے۔

اے کافر بے وفا۔ اے غیروں سے محبت کرنے والی۔ اے ناشکر، الفنت دشمن، اے حق ناشناس، سخن ناشنو، اے درشتی پسند و سست عہد۔ اے وفا ہونے والے وعدوں پر بھی پشیمان، اے ستم شعار، آسمان کو ستم سکھانے والی۔ اے گردش روزگار کی استاد۔ اے سفلہ پرور، رقیب نواز۔ اے لطف خدا سے بے نیاز۔ اے نامرادوں کے خرمن کو جلانے والی برق۔ اے دلوں کے جگر کو پگھلانے والے شعلے، اے قیامت کی پرسش سے بے پروا رہنے والی۔ اے قتل مومن بے گناہ پر کمر باندھنے والی۔ اے اہل عزت کی ذلت چاہنے والی۔ اے بے تمیزوں کے دام میں اسیر۔ اے غرور سے تیوری چڑھائے ہوئے۔ اے بے پروائی سے میرے التجا سے ہاتھ اٹھائے ہوئے۔ اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا۔ اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا۔ اے مہربانیوں پر نامہربانی کرنے والی اے وہ کہ سوغم و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے اور میری ناتواں، نیم جاں تجھ پر فدا ہے۔ آخر کب تک میں آتش فراق میں جلوں اور درد تنہائی سے تباہ روں۔

فرد: تیری جفا اور میری وفا دونوں حد سے گزر گئیں
تجھ کو اپنے سے اور مجھے خود سے شرم آنی چاہیے

وصل کی شب نے جو ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے یہ دن دکھایا۔ ... ......... جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما، کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں، کبھی سر پر اور جب سے تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی، کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ وفا کا ذکر کہاں گیا۔ راستی نما جھوٹی قسمیں چھوڑ اور وعدہ ہائے تسلی آمیز یاد رکھ۔ آخر روز جزا آنے والا ہے۔ خداوند بے ہمتا کا سامنا ہونے والا ہے۔ خدا اس دن سے بچائے میں تیرا دامن پکڑوں اور دل کے ٹکڑے داور محشر کے سامنے پیش کروں۔ اپنے نالہ ہائے قیامت گداز سے ایک نئی قیامت برپا کروں اور شعلہ ہائے آہ سوز سے اہل جنت کو دوزخ میں ڈال دوں۔ میری آہوں کے شعلے فرشتوں کے بال و پر تک جلا دیں اور سدرہ طوبیٰ کی شاخیں آتش پرستوں کے ہاتھ پاؤں کی طرح بھڑک اٹھیں، میں ایسی فریاد کروں جن کے شعلوں کی گرمی کوثر کو آب گرم اور خلد بریں کو جہنم بنا دے۔ سچ ہے۔

شعر: اگر ایک دن جدائی کی آگ دوزخ پر مسلط ہو
تو یقیناً اس کے شعلے پگھل کر رہ جائیں

نہیں نہیں کہاں میں اور کہاں یہ بے مروتی۔ لیکن "یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر"[1] کے مفہوم سے ڈرتا ہوں اور دل میں "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"[2] کی فکر سے دونیم ہے۔

بیت: میں نامراد تیرے مظالم سے کیوں کر نبھاؤں
میں نہیں کہتا کہ تو نے کیا کیا تو ہی بتا کہ میں کیا کروں

میرا غبار خاطر تیرے قدموں کے آوارگی ہوا سے اڑ جائے گا، میرے دل کی کدورت تیرے قدوم صفا لزوم سے پامال ہو جائے گی۔ اگرچہ میں شیشۂ شراب کی طرح صاف طینت ہوں لیکن ساقی کی دستگیری کے بغیر سر جھکانے والا نہیں۔ میں صیقل شدہ شمشیر ہوں اور چلے تک کھنچا ہوا تیر۔ جب تک تو مجھے سر پر نہ رکھے گی، میں اپنے ناخن کو تیری عقدہ کشائی کی زحمت دوں گا۔ اور اگر تو مجھے چٹکی سے چھوڑے گی تو پھر تیرے ہاتھ نہ آؤں گا۔ میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دست بردار

---

[1] جس دن لوگوں کے دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ مددگار
[2] جو کوئی ذرہ کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔

ہو جاتا ہوں۔ میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند اور بندہ حق گذار ہوں لیکن خود دار ۔ نہ میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی۔ میرا پروانہ ہر شمع رخسار کے گرد نہیں گھومتا اور میرا دیوانہ ہر پری جمال کا مجنوں نہیں ہوتا۔ طور کو جلانے والی آگ سے میں بے خود ہو کر گرتا ہوں تاکہ بال و پر کے جلنے کا عذاب نہ دیکھوں ...................... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد عشق شیریں کی تلخی سہتا کہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لیے وقف کر دے۔ میں حلقہ زنجیر ہوں جس کے پاؤں پر پڑا وہ اٹھا میرا گرفتار (گرفتار محبت) ہو گیا۔ میں رنگ حنا ہوں جس کے ہاتھ کو میں نے بوسہ دیا اس نے دوسروں کے قتل پر تلوار کھینچی۔ میں پایہ منبر ہوں جس کے پاؤں پر سر رکھوں وہ اپنی جبین نیاز میرے قدموں سے گھسے اور اور میں خط پرکار ہوں اسی کے گرد پھروں جو میرے آغوش میں آ ئے۔

رباعیات:

مومن مجھے تو بت پرستی سے روکتا ہے
مگر خود خدا کی بندگی کیوں نہیں چھوڑتا
یوسف نے زلیخا کی خدمت کا حق نہ پہچانا
میں اس کا غلام ہوں جو مجھے اپنا آقا سمجھے

وہ شوخ جو خدائی کے دعوے کرتا ہے
اور کبریائی کی سینکڑوں شیخیاں مارتا ہے
مومن کی محرومی گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں
کہ خدا عقدہ کشائی کی شان رکھتا ہے

جب تک فتنہ روز قیامت نہ اٹھے تیرا قد محشر خرام جلوہ نمائی کرتا ہے۔ اور جب تک شور محشر ہنگامہ بلا نہ کرے تیری رفتار فتنہ انگیز ہنگامہ اٹھاتی رہے۔

قطعہ:

جب تک عاشق کی شب ہجر کی درازی کے افسانے رہیں
تیری عمر تیری زلف مشکیں کی طرح دراز ہو
تو گرم صحبت رہے اور شمع محفل کی طرح
حاسد کی جان آتش غم سے پگھلتی رہے
میں تیرے ساتھ ہم کلام ہوں اور رقیب حسد سے گرم فریاد
میں تیرا ہم نشیں ہوں اور دشمن مارا مارا پھرے
میں کامیاب وصل ہو جاؤں اور غیر ناکامی کے باعث
مرنے کا امیدوار ہو
میں خدائے کارساز کی مہربانی کا شکریہ ادا کروں
اور وہ رقیب چرخ حیلہ سازی کی طرح شکایت کرتا رہے

## غلام ربانی تاباں

کسے دوام کی فرصت یہاں خضر کی طرح　　تپش کی زیست یہی ایک پل شرر کی طرح
طلب کی راہ سے گزرے ہیں یوں بھی دیوانے　　زمانہ ساتھ چلا گردِ رہ گزر کی طرح
گلوں کو چاک گریبانیاں مبارک ہوں　　نسیم آئی بہاروں کے نامہ بر کی طرح
کبھی گزر بھی گیا شوق حدِ تمکیں سے　　کبھی چھلک بھی گیا جام چشمِ تر کی طرح
ہزار سادگی و صد ہزار پرکاری　　نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح
جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ　　ہوا کی زد پہ رہو شمعِ رہ گزر کی طرح
وہ گفتگو کا سلیقہ بھی چاہیے تاباںؔ　　کہ بات دل میں اتر جائے نیشتر کی طرح

## امتیاز علی عرشی

شبابِ عمرِ دو روزہ کا اعتبار ہی کیا　　چمک کے ساتھ جو بجھ جائے وہ شرار ہی کیا
نہ کر تو آمدِ فردا کا انتظار نہ کر　　جو جا کے آنہ سکے اس کا انتظار ہی کیا
اٹھا اور نگاہ کی خارا شگافیاں دکھلا　　کہ جو علم نہ ہو وہ تیغِ آبدار ہی کیا
تلاش آہوئے رم خوردہ اے خوشا لذت!　　جو آپ دام میں آجائے وہ شکار ہی کیا
بہارِ دامنِ گلِ تنگ، اے ہوس بازینت!　　جو خونِ دل نہ بہائے وہ دلفگار ہی کیا

## سحر رامپوری

یاد آیا جہاں بھولے سے تمہارا دامن　　وہیں بیساختہ آنکھوں نے پکارا دامن
ایسے کم ظرف کو مٹی ہی میں مل جانا تھا　　اشک حسرت کو نہ دینا تھا سہارا دامن
میری وحشت سے کچھ اچھی نہیں چھیڑیں یعنی　　ہے اسی چاک گریباں سے تمہارا دامن
لوٹ ہی لی تھیں گلستاں کی بہاریں میں نے　　کہاں آ کر دلِ کج فہم پکارا دامن
فیصلہ ہوش و جنوں کا ہے بہار آنے دو　　دیکھنا ہے، کہ کسے ہوتا ہے پیارا دامن
مسکراتی ہیں جو کلیاں تو اسی دامن میں　　اور کانٹوں کے لیے ہے تو ہمارا دامن
اپنا افسانۂ غم اب نہ سنائے گا سحرؔ　　اپنی آنکھوں سے ہٹائیں وہ خدارا دامن

## غلام ربانی تاباں

تھکے ہیں لاکھ مسافر، سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کشش رہ گزر ہے کیا کیجے

جنوں پہ قید طلب بھی بہت گراں ہے مگر
جبیں نواز ترا سنگ در ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار موسم رقص شرر ہے کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبار راہ سہی، ہمسفر ہے کیا کیجے

تمام عمر شکستوں سے دل کا کام رہا
خلوص شوق رقیب اثر ہے کیا کیجے

شکایت ستم روزگار لاحاصل
غم حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے

ہنسے تھا عقل کی دیوانگی پہ کل تاباں
مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

## صبا اکبرآبادی

آگ بجھ گئی غم کی ہم ہنوز جلتے ہیں
دن بدل گئے لیکن دل نہیں بدلتے ہیں

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں

وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

وہ عبور کر لیں گے قلزم مصائب کو
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں

ایک دن یہی شاید اس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل
پھول بھی کچلتے ہیں، خار بھی کچلتے ہیں

اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

## انجم قریشی رامپوری

عالم تمام مطلع انوار ہو تو ہو — جلوہ بقدر وسعت ذوق نظر نہیں
محروم ہوں نشاط محبت سے کیا کہوں — ظالم کو پاس سوزش زخم جگر نہیں
انجم نے پھول اپنے نشیمن میں رکھ لیے — افسوس بجلیوں کو ابھی تک خبر نہیں

# غالبیّہ ــــــــــ تیسرا باب

## اکبر علیخاں

اس عنوان کے تحت اس بار ایسی خبریں شریک کی جا رہی ہیں جو غالب کی زندگی میں معاصر اخبارات کے صفحات پر جگہ پا چکی ہیں۔ سوائے اردوے معلّیٰ اور عودِ ہندی کے اشتہارات کے جو غالب کی وفات کے صرف دو ماہ بعد شایع ہوئے تھے۔ زیرِ نظر خبروں کی تعداد یقیناً کم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بہت سی خبریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

مثال کے طور پر خود غالب نے اخبار لودھیانہ میں ایک خبر کی اشاعت کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے درباری اعزاز کی تخفیف و ترمیم کی اطلاع چھپی تھی۔

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا اہتمام

مگر اخبار لودھیانہ کے مذکورہ نمبر کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ہمارے پاس اُس عہد کے اخبارات و رسائل کی قابلِ لحاظ تعداد محفوظ ہوتی تو غالب اور معاصرینِ غالب کے بارے میں بڑے اچھے ذخیرے سے استفادہ کیا جا سکتا۔

بہرحال غالب کے معاصر اخباروں کے صفحات پر جو کچھ ملا ہے اسے ایک سلسلے میں پرو دیا گیا ہے۔

غالب کا اردو و فارسی کلام بھی اخبارات میں چھپا کرتا تھا، مراسلات بھی شایع ہوتے تھے اور غالب کی نثر غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔ خبروں میں قاطع برہان کے ہنگامے، قمار بازی کے ذیل میں سزائے قید، بند کا ذکر، انگریزی حکومت سے تعلق اور مشاعروں میں شرکت کا حال موجود ہے۔ جو غالب کی مقبولیت کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ یہ غالب کے مورخ کے لیے حسبِ مراد اور اطمینان بخش نہ سہی مفید اور کارآمد مواد کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

## دہلی اردو اخبار —— (۲۲ر اگست ۱۸۴۱ء)

### قمار بازاں

سنا گیا کہ ان دونوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے ......... یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی۔ لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانیدار کی قدر اخیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ بھیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۳)

## اخبار مہر منیر کلکتہ —— (۲ر ستمبر ۱۸۴۱ء)

از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی، یکی از عزیزان نواب شمس الدین خاں مرحوم اتنی چند مقامران نامدار کہ در دلیل و نہار بجز قمار دیگر کار نداشتند، در حالت مقامرت بسعی تھانیدار اسیر و گرفتار شدند و بر محکمہ حاکم حاضر گردیدند۔ حاکم نصفت شعار از شاعر یک صد روپیہ و از دیگراں سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۵)

## احسن الاخبار بمبئی —— (۲۰ر دسمبر ۱۸۴۴ء)

بتاریخ ۱۴ر ماہ اکتوبر مجر جان جاکرب اکبرآباد (آگرہ) سے دہلی وارد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رفاقت قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں کے مکان میں یہاں پہلے ہی مہمانداری کا انتظام کیا گیا تھا ٹھیرایا دو دن کے بعد میجر صاحب بہادر نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۵)

## احسن الاخبار بمبئی —— (۱۹ر دسمبر ۱۸۴۵ء)

ماہ گزشتہ کی پندرہ اور سترہ تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ عمائدین رؤسا شرفا اور خاص خاص اصحاب شریک تھے۔ تمام اہل دربار کو ان کے مرتبے کے موافق انعام و اکرام دیا گیا ......... ۱۷ر تاریخ کے دربار کی رپورٹ اور تقسیم انعام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دربار عام ہوا دور دور سے انگریزوں کو بلایا گیا بڑے بڑے صاحبان عالی شان تشریف فرما تھے۔ مجمع بہت بارونق تھا دو گھنٹے تک ملکی معاملات پر تقریریں ہوئیں اس کے بعد دو نئے آدمیوں نے نواب گورنر جنرل بہادر سے تعارف حاصل کیا محفل میں ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں سے ہر ایک کے بالخصوص حاکموں اور افسروں کے چہروں پر خوشی اور کامیابی کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

...... (۱۳) مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر ......... (۱۷) مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت پارچہ اور ایک گھنٹہ ......... اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے دست مبارک سے ایک ایک شال مرحمت فرمایا ... (۱) سید فیض الحسن صاحب کوتوال شہر ... اس موقع پر نذریں بھی پیش کی گئیں جو شکریے کے ساتھ قبول ہوئیں مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرنے کے وقت نواب گورنر جنرل بہادر نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی نیک نامی اور علم و فراست سے صاحب بہت مسرور اور رضامند ہیں ... ۸ ارتاریخ کو صدر الدین مہر کن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا تدرسکے

طور پر پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

جس صورت سے موجودہ گورنر کے عہد میں ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق و عنایات کا برتاؤ کیا گیا اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رعایا میں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ان کے عدل و داد کے تذکرے ہیں ان کے عہد کی یہ خصوصیت ہے کہ انشا پردازوں، تحصیلداروں تک کو خلعت تقسیم کیا گیا (بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۴۷۔

## اخبار فوائد الناظرین۔ کلکتہ ——— (۳۱ر مئی ۱۸۴۷ء)

۵ر مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قماربازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پاکر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو معہ چند قمار بازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ انکے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔

(قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں امتیاز علی عرشی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء)

## احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲۵ر جون ۱۸۴۷ء)

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث، قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا، معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ (یہ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی اس لیے کہ اعلیٰ کی مصروفیات۔ ۱۰ر جمادی الثانی کے تحت یہ خبر آئی ہے۔) کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معزز ین شہر میں سے ہیں یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔　　(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۱)

## احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲ر جولائی ۱۸۴۷ء)

میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر وہ سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ آقتہ مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔　　(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۴ — ۱۷۵)

## اسعد الاخبار آگرہ ——— (۱۲ر مارچ ۱۸۴۹ء)

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل میں قیمت بھیجدے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروان راہ سخن　　پایہ سنجان دستگاہ سخن
طے کر و راہ شوق زود از زود　　آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر　　دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی　　چشم بنیش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا　　جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے　　مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ　　گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار | بار ور جس کا ہر گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں | نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر | اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری | حبذا رسم و راہ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم | ہے مقرر جواب پنج تعلیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے | کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلا | ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلا
ورزش قصہ کہن کب تک | داستان شہ دکن کب تک
تا کجا درس نثرہائے کہن | تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
گئے ظہوری و عرفی و طالب | اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے | اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے درست | ہر کرا پنجۂ روز و بہ است
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے | شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دان معنی ہے | بادشاہ جہان معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز | نظم اس کی نگار نامۂ راز
دیکھیو اس دفتر معانی کو | سیکھیو آئین نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا | سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری | کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست | تین مہینے میں پاوے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب | زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت | اس لئے ہوں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے | احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا | جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پئے حصول شرف | نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر | کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے | ابتدائے ورق شماری ہے

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا۔

(آثار غالب صفحات ۷-۸ ۴۵ء)

## اسعد الاخبار آگرہ ——— (۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء)

ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر

جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تاریخ ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۸۸)

## اسعد الاخبار آگرہ ———— (۲ ستمبر ۱۸۵۰ء)

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن و ظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں حضرت شاہ والا درگاہ نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خطاب خلعت معزز فرمایا اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جناب تفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را	خطابائی کہ ہر یک لفظ آں روشن تراز اختر
دبیر الملک نجم الدولہ و یک جزو دیگر ہم	نظام اول بود زاں بعد لفظ جنگ بے مسود
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید و خلعت	ز دوہ جیغہ و سرپیچ و بالای دُر و گوہر
مدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی	سخن فہم و سخن گو پرور دوانا و دانشور
پئے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی	بہ دریای تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامی کہ شد در غوطہ یابش بر زمین قائم	بہ گوش تفتہ ہاتف گفت کای زندہ دل آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی

یکی سامان، دوم حشمت، سوم اعزاز چارم فر	(نیا نگار لاہور ص ۳۸ اپریل ۳۵ء)

## سراج الاخبار دہلی ———— (یوم سہ شنبہ چہاردہم محرم (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۰ء)

چون بہ نسبت نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب تخلص، ہیچ کس غماز ...... سمت لامذہبی و مذہب امامی وانمودہ بود، ہمی چند لطور رباعی بکمال متانت و خوش ادائی پیش بزرگان قدسی ادا نمودند از خیلی پسند افتادگی ایای طبع فرمودند۔

رباعیات نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ

جن کو ہے مجھ سے عداوت گہری	کہتے ہیں وہ مجکو رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہو وے صوفی	شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

ایضاً

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں	سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا کتا نبی نے ان کو اپنا ہمدم	ہے ہے نہ کہو کسے برا کہتے ہیں

ایضاً

یاران رسول یعنی اصحاب کبار	ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار	غالب وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایضاً

یاران نبی میں تھی لڑائی کس میں — الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق وہ عدل وہ حیا وہ علم — بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں

ایضاً

یاران نبی سے رکھ تو لا باللہ — ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن — لاحول و لا قوۃ الا باللہ

(ہماری زبان ۱۵ اپریل ۶۱ء)

## دہلی اردو اخبار ـــــــ (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء)

قصیدہ جو کہ نواب محمد اسداللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب نے مدح بندگانِ حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا اس ہفتے میں ہمارے پاس آگیا تھا۔ سو واسطے تفریح ناظرین اخبار کے درج ہوتا ہے:

خورشید بہ بیت الشرف خویش درآمد — زانسان کہ شہنشاہ بہ اورنگ برآمد

(نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۵۸ء)

## دہلی اردو اخبار ـــــــ (۱۱ مئی ۱۸۵۱ء)

اس ہفتہ میں ایک غزل جناب نواب اسداللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب کی ہمارے ہاتھ آئی سو درج اخبار ہوئی:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

(نسخہ عرشی حواشی ص ۳۶۳)

## دہلی اردو اخبار ـــــــ (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ، جو جناب نجم الدولہ اسداللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق نے بتقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار سبیل مبارک بادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سر دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین اہل بصر و بصیرت و ماہرین دوا تقین فصاحت و بلاغت کے بموجب ترتیب در پیش ہونے کے ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ (نوائے ادب اپریل ۵۸ء)

## دہلی اردو اخبار ـــــــ (۲۸ اگست ۱۸۵۲ء)

اس ہفتے میں جو مشاعرہ مرزا نورالدین بہادر دام اقبالہ المتخلص بہ شاہی نبیرہ جناب مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم نے کیا جو کہ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں غزلہای شاعران کثیر پڑھی گئیں۔ اور شاہ زادہ والا تبار اکثر رونق افروز محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل جناب مرزای ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسداللہ خاں بہادر المتخلص بغالب کی، راقم اخبار کے پاس پہنچی۔ سو درج اخبار ہوئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

(نسخہ عرشی، حواشی ص ۳۴۷)

## دہلی اردو اخبار ـــــــ (۱۳ فروری ۱۸۵۳ء)

ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشد زادہ بہادر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہی، جن کے محامد اوصاف اخبارات گزشتہ میں لکھے تھے، تحقیق سنا گیا کہ بفرمودہ بندگانِ حضور والا جناب نجم الدولہ اسداللہ خاں غالب سحر بیان نے ایک غزل اس ہفتے میں لکھی تھی، اور اس مقصود سے وہ غزل کہوائی

گئی تھی کہ مصرع لگانا جس میں دشوار بلکہ ناممکن ہو۔ صاحب عالم بہادر ممدوح نے ادنیٰ غور و تامل میں، کمال عجلت سے مخمس طیار کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے، اور سب لوگوں کو کمال تعریف و توصیف سے تر زبان پایا۔ جہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا کوئی لب نہ ہلاتا تھا۔ (نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۴۸)

## دلی اردو اخبار تتمہ ——— (۲۲ مئی ۱۸۵۳ء)

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے۔ حضور اقدس اعلیٰ بر آمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شاہزادگان والاتبار بعد باریابی مجرا حسب الحکم تھا تو تمام شرف نشست سے حسب مراتب بمقام معزز و مکرم ہوئے بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے۔

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۶۷ — ۳۶۸)

## اودھ اخبار[1] لکھنؤ ——— (یکم جنوری ۱۸۶۲ء)

"اشتہار طبع کلیات نظم" جناب میرزا غالب دہلوی۔

اک بشارت نئی سنو ہم سے — گوہر آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سنانے میں کہ کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کیسے شاہد شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دو چار ہوں گے نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آویزۂ گوش مہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش دلنگار اس دلارام، رنگین ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد لا جواب ہے، عالی مضامین قصائد لاجواب۔ رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے۔ نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے، آبدار قطعات کو بے ترند قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد ماہ سیما کے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں، کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی نہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کے صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر لفظ ان کے قلم کا اختراع کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے ہے کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے ۵ مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ چھپنے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے، صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان بکیسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مد نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں کم قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط

(ص ۲۰۱)

---

[1] اودھ اخبار کے حوالے سے مندرجہ تحریروں کے لیے میں محترمی ڈاکٹر امیر حسن نورانی صاحب کے لطف و کرم کا شکر گزار ہوں یہ موصوف ہی کا عطیہ ہیں (اکبر)

## اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء)

### نواب میرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں اُن کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطہ کو اختر اوج معانی بنایا۔ زور فکر اُن کا جہاں میں مشہور رہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور رہے۔ جناب جہاں مآب ملکہ معظمہ ہندوانگلستان کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ لارڈ کیننگ گورنر جنرل کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے جب فیضیاب سماعت ہوا۔ منظور نگاہ رحمت ہوا۔ دل اُس کی طرف ہمت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی، ولایت سے ڈاک پر بھیجکر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے عنقریب خطاب اٹھاؤ گے۔ بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بیگناہ یوں زیر آسیا گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مقصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ع۔ "جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا"۔ عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ع

حالت یاس میں لطف حسن ذاتی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیئے کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایۂ کا عالمگیر تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اُس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھدیا۔ نواب صاحب (غالب) نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں مدحت سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کردی:

شاہ عالی گہر دگوہر پاکش صد حیف ۔۔۔ دینکہ ناچار سپرد ند بخاکش صد حیف (ص ۱۸۵)

## اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء)

### ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روزنامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ مخالف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض ما لہا گزر گئے سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے باندھنو باندھے۔ توطیے اٹھایئے۔ محض اپنے گمان پر سکیڑوں لگاتے۔ اے بے فکرو، خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے۔ خصوصاً وقائع نگار ان انگریزی کو کو لکھا کرتا ہے۔ کیا کریں جب عموماً صحیفوں کو ایسے اخبارات سے مملو پاتے ہیں تو ہم بھی حسب ضرورت کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپواتے ہیں،

آج کل دانائے روزگار، سرمۂ اولوالابصار، ارسطو فطرت، افلاطون فطنت، جناب رفیع الشان، عالی مناقب، مرزا اسداللہ خاں غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھایئے، استقامت رائے سلیم کے صدقے جایئے۔ نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے معمول خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں

### نثر

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کچھ فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ فساد سے خوش اور امن

کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ سینکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اُس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو اتنا سبکہ توجہ طرف رفاہ عام کے ہے۔ اُدھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ بفرض محال اگر اُس گرد میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ جائے انصاف ہے جن ہمدیوں للہ حاکموں نے اپنی فوج باغی کو فقط اپنے حسن تدبیر و ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے مخالف کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہل ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں۔ وہ اپنی سلامت دھن پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہونچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں، حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں، ملک سراسر بے غش و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے، بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے، وہ احمق ہے وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخشنود ہے، حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہر صورت ہے؛ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبی قسمت ہے آدمی رحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے، امن و اماں کا طالب بخت و قسمت کا شاکی غالب۔ فقط (ص ۲۸۱)

## اودھ اخبار لکھنؤ ———— (۱۴ مئی ۱۸۶۲ء)

### خیال خیر مآل رعنا

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۲ اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم حضرت استادی جیب والامناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دام اقبالہم کی درباب تہدید تنبیہ عوام و کج فہماں خود میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں با افغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں۔

بہ تبعیت مضمون خیر اندیشی جناب مرشد ناو استادنا حضرت غالب دام فضلہم بمادہ تنبیہ ابلہان نسبت شہرت جنگ اہل ایران با افغانان از آنجا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے، اس لیے اس کو نتیجہ نتائج خیر و عافیت عام خیال کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو میں حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہ ہر خاص و عام عرض کر کے عارض ہوں کہ آپ بوسیلۂ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگان خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمایئے گا

## اودھ اخبار لکھنؤ ———— (۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء)

جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل سے ایک شیر کو بلی میں قید کر کر کئی روز گرسنہ کر کے جب وہ شور و شر سے باز رہا پنجرہ آہنی میں گرفتار کر لائے

اے صاحب مہاراجہ صاحب تو والی ملک اور صاحب اقبال ہیں وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرا منگا دیں۔ اُن کے رعب عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں پھر اُن کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تعجب خیز اور فسانہ حیرت انگیز گرفتاری زندہ شیر کا بے سر و سامانی

میں ایک معزز شخص کا سنا نامور یعنی سنہ ۵۶ء میں محمد مردان علی خان صاحب نے کہ اُس وقت تحصیلدار کوہ مری وامالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار پنجاب میں اہلکار ہیں خود ایک شیر ژیاں جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کا بنایا کہ شیر اُس میں سما سکے اور شکار لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خور اس میں پھنسا تھا اور اکثر کئی سو آدمی خان صاحب کے ساتھ اُس علاقے کے جو تھے ایک بار اپاس جانے تک نہ ہو۔ اور اس شیر دل جری نے رستا ڈال کے اوپر بیٹھ کر رستے سے پھنسا لیا اور پتھر اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کر کے قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک آدمیوں کے زہرے کو آب کرتا تھا اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا اسی دن اس شجاعت خداداد اور جرأت سے اُس کو گرفتار کیا۔ اور وہ چار ماہ پالا پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہر من الشمس ہے وہ شیر پورے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت پر ظہور میں آ چکی ہے۔ یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیلدار وغیرہ ہے تو ملک باغی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر بہت سے خونی اشتہاری مسلح بہادر پکڑ پکڑ لائے اور ہزارہا روپیہ سرکار انگریزی سے انعام پایا۔ فی الحال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر ہے۔ کوہ مری کے بغاوت و فساد میں جب کہ وہ دوسری تحصیل میں تھے کوہستان میں جا کر دافع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرأت و دلیری بھی ایک بڑی نعمت خداداد ہے اور جبلی ہے کچھ اختیاری نہیں اور امیر غریب پر بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض خان ممدوح بھی اسم با مسمی ہیں اور حق یہ کہ جانب مرد کی صفت ہی مردانگی ہے۔ فقط

راقم بندہ اسد اللہ

مفصلائٹ دہلی ــــ (مارچ ۱۸۶۸ء)

## CORRESPONDENCE

*Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for any thing that appears in our correspondence*-- Ed. Mof.

## TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instt., taken notice of the liable case now under enquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asadullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian Scholar and the Poet laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piaare Lall, Headmaster Delhi Normal School and secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Husain, first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, Delhi College

and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th instant; of the witnesses for the defence, only one, Maulavi Ziyauddin was examined on Tuesday when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an "awarda" of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulave Ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair on the dais next to himself, while taking his evidence. This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian courts, is, no witness ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition. "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect? The witness, to whom injustice and a gratitous insult has been offered by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governer of the Punjab and took precedence of the gentlemen to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian Scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole missul for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." ( Sic. )

Yours truly,

March, 1866 — IXION

**اکمل الاخبار دہلی** ———— (۶ مئی ۱۸۶۸ء)

ناظرین والاتمکین نیز شاگردان رشید حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ نیز والا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کرائی ہیں۔ پس جن صاحب کو یہ شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپے کے ٹکٹ بلفف عنایت نامہ پنڈت لالہ پیارے لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیجدیں یہ صیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔

(ماہنامہ آج کل ستمبر ۶۰ء ص ۲۹)

## اکمل الاخبار دہلی ——— (۲ ستمبر ۱۸۶۸ء)

تہنیت

بفضلِ الٰہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے۔ جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ماہ رخشندہ اور اختر تابندہ کو اوج عزت و اقبال پر تا طلوعِ آفتاب قیامت پر نور ضیا گستر رکھے ........

جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط دیدہ فہمید اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے ہم بہ افزائش رونق اخبار وہ رباعی اور قطعہ لکھتے ہیں۔

رباعی

حق داد بہ سیّ ازپی انعامش　　　فرخ پسری کہ واجبست اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش　　　ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

۱۲　　۸۵

قطعہ

غالب حال سنین ہجری　　　معلوم کن از خجستہ فرزند
چوں یکصد و بست و چار ماند　　　انیست شمار عمر دلبند

عرض کی جائے کہ جب خجستہ فرزند سے ۱۲۸۵ عدد لیے جائیں تو ایک سو چوبیس باقی رہتے ہیں۔ اس کو بطریق دعا مولود کی عمر قرار دی ہے۔"
(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

## اکمل الاخبار دہلی ——— (۲۸ اکتوبر ۱۸۶۸ء)

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب ہے۔ مہتمان اخبار بلاد ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ یہ فقیر کا استغاثہ ازرد ہے اکمل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر مجھکو اپنا ممنون فرمائیں۔"

استغاثہ غالب

"کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بعینہ بیرنگ میرے نام آیا راقم عبد اللہ رئیس و معافیدار ——— یہ نہیں مرقوم کہ رئیس و معافیدار کہاں کا ——— بہر حال محصول دے کر میں نے خط کو لیا اور پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ تو نماز نہیں پڑھا کرتا۔ خبردار نماز پڑھا کر اور گر نماز نہ پڑھا کرے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم ہے "انشاء اللہ لفافہ ہذا بمقام در شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب مشرف باد مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۲ رجب ۱۲۸۵ ہجری روانہ شد" مضمون بعینہ یہ کہ نماز پڑھا کرو ورنہ بعد مرنے کے بھوت ہو جاؤ گے والسلام علیک نام نامہ نگار فقط مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بسرکار خود تمام ہوا۔ اب فقیر مکتوب الیہ کہتا ہے کہ پہلے خط میں میں نے عبد اللہ کو اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب جب دوسرے خط میں اس توضیح سے کاتب کا اسم و مقام لکھا ہوا ہے کیونکر شک و شبہ باقی رہے، پس اب میں تہر بہ دلش بجانِ درویش کے مفہوم پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر یہ حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں ؎

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش　　　ہر کسی آں دِرَوَد عاقبت کار کہ کشت

یہ دوسرے شخص صاحب نام و نشان ہیں۔ اخبار میں دیکھ کر سمجھ لیں گے۔ شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں مشاہدہ فرمائیں۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء　　　)

## اکمل الاخبار دہلی —— (۱۴ر اپریل ۱۸۶۹ء)

" اشتہار کتاب اردوئے معلّٰی "

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی + گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

" فرزندگان والا نسطر و شائقان پاک گہر مژدہ ہو کہ ناظورہ معانی نے جلوہ دکھایا، شاہد سخن نے نقاب چہرے سے اٹھایا، گلستان فصاحت نے خرمی و نضارت پائی، چمنستان بلاغت میں بہار آئی یعنی حصۂ اول نسخۂ دلپذیر و کتاب بے نظیر" اردوئے معلّٰی " منشات زبدۃ الفصحا عمدۃ البلغا جناب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر مرحوم غالب کہ جس کا ہر ورق حدیقۂ نکتہ پروری و ہر صفحہ ریاض بذلہ گستری ہے اکمل المطابع دہلی میں بہ تصحیح و تنقیح احقر العباد چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ یہ کتاب خصوصاً واسطے طلبار مدارس کے ایک عمدہ دستور العمل زبان دانی اور عموماً برائے شائقین و محققین زبان اردو کے سرمایہ فصاحت و طلاقت لسانی ہے مضامین بلیغ اور روانی عبارت سے خود ایک معلم بے بدل اور استاد کامل ہے۔ غرضکہ بہتر اس سے زبان اردو میں کوئی کتاب ہاتھ نہ آئے گی۔

بنا بر علیہ اس شہر میں ہاتھوں ہاتھ اکثر متاع روئے دست خریدان خرد مند ہو گئی۔ باایں ہمہ ندرت قیمت اس کی زیادہ قرار نہیں دی گئی۔ حجم اس کا ۲۹ جزو ہے اور کاغذ ۲۰ × ۲۶ پر بہت خوشخط منطبع ہوئی ہے لیس جن صاحب کو اس صحیفۂ دانش و آگہی کی خریداری منظور ہو دو روپیہ بابت قیمت کتاب اور ۳؍ محصول ڈاک کے ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

" المشتہر سید فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی "

" محبان کرم گستر یعنی وقائع نگاران ہم عصر سے امید ہے کہ براہ عنایت اشتہار مرقومہ بالا کو اپنے اخبار گوہر بار میں درج فرما دیں "

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

## اخبار عالم میرٹھ —— (۲۲ر اپریل ۱۸۶۹ء)

### عود ہندی

یہ کتاب لطافت مآب بہ زبان اردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف لطیف و بیا یہ کتاب لکھے ہیں نواب اسد اللہ خاں صاحب غالب مرحوم کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور درستی زبان اردو کے مفید اور کار آمد ہے، مطبع مجتبائی واقع میرٹھ میں صاف اور خوشخط ...... ۱۸۸ صفحے کی چھپی ہے قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔ (اردوئے معلّٰی غالب نمبر جلد دوم)

# مطبوعات موصولہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**کچھ پرانے خط:** جواہر لال نہرو کے نام آئے ہوئے مشاہیر سیاست و ادب کے خطوط کا ایک انتخاب ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا۔ جس میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اسے خود پنڈت جی نے مرتب کیا ہے۔ ان خطوط میں سے بیشتر خط مرتب ہی کے نام ہیں مگر کہیں کہیں استثنا بھی برتا گیا ہے یعنی کچھ خطوط موتی لال نہرو کے نام اور کچھ موتی لال کے دوسروں کے نام بھی شریک ہیں۔ اسی طرح مرتب نے چند اپنے خطوط بھی شامل کر لیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی شمولیت دوسرے خطوط کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی۔

یہ مجموعہ نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کے خط شامل ہیں، بلکہ اس اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان کے مکتوب الیہ کی شخصیت جدو جہد آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں ترین حیثیت کی ہے۔ نیز اس مجموعے کی قدر و قیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطوط جس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی پیچ در پیچ سیاست کو اتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کوئی اور مواد پیش نہیں کر سکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے اپنی روایات کے مطابق یہ تحفہ اردو ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور ہر حصے کی قیمت ۸ روپئے ہے۔ جو کتاب کی باطنی خوبیوں کے علاوہ سفید لفٹیں کاغذ صاف ستھری طباعت اور مجلد ہونے کی وجہ سے بہت معقول ہے۔

اس کے مترجم مولانا عبدالمجید حریری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت رواں اور شستہ اردو میں خطوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ آخر میں انڈکس بھی ہوتا تاکہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے والوں کو مطالب کی تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

**اُردو ڈائجسٹ:** لاہور اردو میں یوں تو کئی ادبی ڈائجسٹ شایع ہوتے ہیں اور سب دل چسپ اور کامیاب ہیں مگر خالص معلوماتی نقطۂ نظر سے ایک ڈائجسٹ کی کمی برابر محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کا رسالہ مرتبین سے جس لگن محنت اور سلیقہ مندی کا مطالبہ کرتا ہے وہ بجائے خود حوصلہ شکن ہے لیکن اب لاہور سے چند نوجوانوں نے ریڈرز ڈائجسٹ کو نمونہ بنا کر اردو ڈائجسٹ جاری کیا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کا یہی ایک ثبوت کیا کم ہے کہ دو سال کے مختصر وقفے میں اس کے عام شماروں کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ گزشتہ نومبر میں اردو ڈائجسٹ نے اپنی دوسری سالگرہ پر ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو خاصا متنوع اور دلچسپ رہا۔ ہماری طرف سے اس ماہنامے کے مطالعے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے اس لیے کہ اردو رسائل میں حسن صورت اور سیرت دونوں کم نظر آتے ہیں اور یہ اردو ڈائجسٹ اُن گنتی کے رسائل میں ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

**بچوں کے لیے نظمیں:** ننھے منوں کے لیے جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں جناب شفیع الدین نیر کا نام بہت ممتاز ہے۔ نیر صاحب نے بچوں ہی کی ہلکی پھلکی زبان میں شاعری کی ہے اور موضوعات کے انتخاب میں بھی بچوں کی نرم و نازک طبیعت اور معصومانہ دلچسپیوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں اس میں بچپن کی شوخیاں سمٹ آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نیر صاحب بچوں کے مقبول اور محبوب شاعر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہماری نعت۔ وطنی نظمیں۔ منی کا تحفہ اور بچوں کا کھلونا۔

ہر ایسے گھر میں جہاں بچے ہوں ان کتابوں کو بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کتابوں میں وقتی تفریح ہی نہیں اصلاح اخلاق و عمل کا مقصد بھی کارفرما ہے۔

ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی

**نذرِ وطن:** ہندوستان کی قومی تحریکات میں اردو ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ جنگ آزادی کا سب سے اہم نعرہ "انقلاب زندہ باد" اردو ہی کی دین ہے جس نے مخالف طاقتوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور آج بھی جوش و ولولے کا عظیم نشان ہے۔ چین کی حالیہ جارحانہ یورش نے ہر ہندوستانی کو متاثر کیا۔ اس ہنگامی موضوع پر کہی گئی اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتبہ دور آفریدی ملوی بک ڈپو بمبئی نے شایع کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرتب نے حد چابک دستی سے چھوڈ کر ساری اہم نظمیں شریک کر لی ہیں۔ ضرورت تھی کہ انتخاب کچھ اور سختی برتی جاتی تاکہ بعض کمزور نظمیں درج نہ ہو پاتیں۔ پھر بھی اس انداز کی کتابوں کو خریدنا چاہیے اس طرح قومی خیالات کی تدریجی ترقی ہوتی ہے جو کسی بھی ملک کی ترقی کی اور اس کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔






ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپواکر دفتر نگار رکھیر کنج رامپور یوپی سے شایع کیا۔

SD.NO. A—466 42ND YEAR OF PUBLICATION
GAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. OCTOBER 1963
ISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ٥ > نئے پیسے
سالانہ دس روپے

# نگار

ایڈیٹر ڈاکٹر اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ مس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کردیا جائے گا
نمائندہ نگار ۱۶/۷ ای حسن آباد لاہور

جلد (۴۲) | فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ (۸)




# ملاحظات

پچھلے مہینے تاریخ لطیف اور افادۂ تاریخ دو اہم کتابیں نگار کے تاریخ نمبر کی صورت میں پیش کی جاچکی ہیں۔ ان کی وجہ سے دو سلسلے منقطع کرنا پڑے۔ پہلا غالبیہ کا اور دوسرا اسحاق النبی خاں صاحب کے مقالے "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" کا۔ ان میں سے دوسرا اس بار شریک اشاعت کیا جارہا ہے۔

ہند و پاک کے ان لوگوں کو میں نے اس مقالے کی طرف توجہ دلائی تھی جو اسلامیات سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں یا دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ درخواست کی تھی کہ خان صاحب اپنا جو نظریہ پیش کر رہے ہیں اس پر جرح و نقد کے ذریعے تلاش حق میں موصوف کی مدد فرمائیں۔ اس مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بظاہر اسلام کی ابتدائی تاریخ یعنی سیرۃ کی تاریخوں میں جو تضاد مختلف رواۃ سیرۃ کے ہاں نظر آتا ہے اور جس کو بنیاد بنا کر اکثر مستشرقین اسلامی تاریخ کی صداقت پر شک کا اظہار کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ دراصل وہ واقعات غلط ہیں نہ تاریخیں یہ تضاد محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ وہ غلط فہمی کیا ہے اور اس کا ازالہ کس طرح ہوا ہے یہ آئندہ قسطوں میں نگار کے صفحات پر آئے گا۔

میں نے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی تھی کہ ابھی جب تک یہ مقالہ مکمل طور پر سامنے نہ آجائے کوئی حکم نہ لگایا جائے لیکن میرے جواب میں جو خطوط آئے ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں نے پچھلی قسط کو بہت جذباتی ہوکر پڑھا۔ اس میں سرے سے ہی یہ بحث نہیں آئی تھی کہ رسول اکرم اُمّی ہیں یا نہیں، بحث صرف یہ تھی کہ جس عرب معاشرے کو ہم قطعاً جاہل سمجھ رہے ہیں وہ علم سے اتنا ہی شغف یا بیگانہ تھا جتنا آج سے تیرہ سو سال پہلے کا کوئی بھی ملک ہوسکتا تھا۔ لیکن نوے فی صد حضرات نے مجھے یہی لکھا کہ خان صاحب نے مسلمانوں کے ایک متفقہ عقیدے کو کہ رسول

اکرم اور مجھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے حلقے جن سے ہم بڑی بڑی توقعات وابستہ کرتے ہیں ایک مضمون سے صحیح نتائج بھی نہیں نکالتے، نکال سکتے کا میں استعمال نہیں کروں گا اس لیے کہ نکال تو سکتے ہیں۔ ان حضرات میں بہت پرانے خیال کے اسلام دوست بھی تھے اور بالکل نئے انداز سے سوچنے والے اسلام پسند بھی۔ مگر جذبات کو پورا پورا دخل دونوں کے ہاں تھا۔

اس بار میں پھر یہ درخواست کر رہا ہوں کہ مقالہ کا پیش نظر حصہ بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے مخالف یا موافق جو بھی باتیں ذہن میں آئیں انھیں نوٹ کرتے جائیں اور مقالے کی تکمیل پر مفصل اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ نگار کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں۔

---

ممتاز یزدانی مرحوم نے نگار کے لیے ایک مسلسل مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی قسط ان کی زندگی ہی میں کتابت کی منزلوں سے گذر چکی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اس بار آ رہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی دوسری کاوشیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں وقتاً فوقتاً نگار کے ذریعے شائع ہوتی رہیں۔ مرحوم نے نظام رام پوری کا ایک مختصر سا انتخاب بھی میری ہی درخواست پر کیا تھا جو عنقریب شائع ہو رہا ہے

کتاب تماشۂ رام پور کے چند مختصر رسائل بحر البیان، رسالہ متروکات وغیرہ کو ایڈیٹ کیا تھا، بڑی محنت سے مقدمے اور حاشیے لکھے تھے۔ رامپور سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے وہ شیدائی تھے۔ پچھلے سال برادرم رشید حسن خاں استفادے کے لیے ان سے یہ مسودے اپنے ساتھ مستعار لے گئے تھے۔ رشید حسن خاں سے میں نے استدعا کی ہے کہ وہ مرحوم کے یہ مسودے مجھے عطا فرما دیں تاکہ ان کی محنت رائیگاں نہ جائے اور میں نگار کے ذریعے انھیں شائع کر سکوں۔ کچھ اور مضامین ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ جن میں "نقوش" کے مثنوی نمبر کے لیے ایک مضمون ہے نگار پاکستان کے نیاز نمبر کے لیے بھی ایک مضمون مرحوم نے لکھا تھا مگر وہ شریک اشاعت نہیں کیا گیا۔ یہ مضمون فرمان فتح پوری کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، میں انھیں بھی لکھ رہا ہوں کہ مرحوم کی کاوشوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ مضمون مجھے واپس کر دیا جائے۔

---

# حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

( تواریخ سیرۃ کا تضاد اور ان کا حل )

مقالہ اوّل

(قسط سوم)

اسحاق النبی خاں

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرے میں نہ تو تعلیم کی غیر معمولی کمی تھی، نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان تھا، تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ترجمے ہو رہے تھے اور تقریباً ہر شعبہ حیات میں تعلیم نے وابستگی حاصل کر لی تھی۔ قدرتی طور پر ہماری نگاہیں خود عہد رسالت اور اس کے متصل زمانے کے مکتوبی باقیات کی تلاش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اور ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ جس قوم میں شروع ہی سے یہ صلاحیتیں موجود تھیں وہ تحریک اسلام سے متاثر ہونے کے بعد معطل ہو گئیں اور بروئے کار نہ آ سکیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے اپنی موت و حیات کی اس عظیم کشمکش کا بھی کوئی ادنیٰ ریکارڈ نہیں چھوڑا جس سے اس دور میں وہ دوچار ہوئے تھے۔

میرا مطلب عہد رسالت کی تاریخ سے ہے جس کے متعلق بعض علما کا خیال ہے کہ یہ تمام تر زبانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سر سید سے زیادہ وکالت اسلام کا شرف کم لوگوں کو حاصل ہوگا۔ مگر کتب سیرۃ کی تدوین پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔

"ان کی (یعنی سیرۃ نگاروں کی) تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں، جس کسی نے جو قصہ ان سے بیان کیا، انہوں نے نہایت اشتیاق سے اس کو سنا۔ اور اس قصے کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کے متعلق ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اس قصہ کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔" [1]

سر سید کی رائے میں یہ افسانے بھی کسی قریب العہد مصنف کے قلم سے نہیں نکلے بلکہ ان کی تدوین میں بھی صدیاں گذر گئیں، اور تقریباً دو سو سال لگ گئے۔ چشم دید گواہ ختم ہو گئے، ان کے بیٹے، پوتے، پڑپوتے بھی چل بسے، پانچویں اور چھٹی پشت بھی ختم ہو گئی، تب کہیں جا کر مسلمانوں میں شعور تصنیف پیدا ہوا چنانچہ تدوین روایات کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے:۔

"اس زمانے میں فن تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا، اس وقت میں ایسی باتوں کے لیے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا، ان اسباب سے نبوت سے دو سو برس تک اور ہجرت سے دو سو برس قریب تک حدیثوں کا قلمبند ہونا عمل میں نہیں آیا۔" [2]

یہ رائے کسی قدامت پسند یا کسی فرسودہ ذہن عجائب پرست کی نہیں، بلکہ ایک محقق کی ہے، اور ایسے بے خوف محقق کی ہے جس کی زبان قلم اظہار خیال میں کبھی جھجکی، نہ رکی، اور بلا کسی ادنیٰ تکلف کے ہمیں جدید طرز فکر اور نئے نئے تصورات سے روشناس کیا،

سر سید کی عظمت ایک طرف، اور واقعات و حقائق دوسری طرف۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی مسلمانوں کے پاس عہد رسالت کی کوئی مستند تاریخ نہیں؟ کیا حقیقتاً سیرۃ کی کتابوں کے اصل ماخذ وہ افسانے ہیں جو زبانی روایتوں کے ذریعے سیرت نگاروں کو پہنچے تھے، اور انھوں نے بلا کسی تحقیق و تفتیش کے ان کو قبول کر کے مدون کر لیا تھا؟

اس سلسلہ میں غالباً یہ موزوں ہوگا کہ یہاں ہم قدیم سیرۃ کی کتابوں کی داخلی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے ابتدائی ماخذوں کا ایک مختصر جائزہ لیں، اور اس کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ روایات سیرت کی تاریخی منزلت کیا ہے؟ اور وہ کس درجہ قابل اعتماد ہیں۔ ان کتابوں کا اگر بغور و احتیاط مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل پانچ ماخذ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید۔

۲۔ عہد رسالت کے سرکاری اور دفتری ریکارڈ۔

---

[1] خطبات احمدیہ/۳۳۳

[2] ایضاً /۳۲۲

۳۔ اسی عہد میں صحابہ نے جو نجی یادداشتیں مرتب کیں۔
۴۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کی قلمی کاوشیں۔
۵۔ تابعین کا وہ سرمایۂ تاریخ جو صحابہ کی مدد سے اکٹھا کیا گیا۔
یہاں میں علی الترتیب ان ماخذوں کی تاریخی اہمیت علیحدہ علیحدہ پیش کرتا ہوں۔

**پہلا ماخذ** سب سے پہلے قرآن کو لیجیے، جو مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا مرتبہ رکھتا ہے، مگر اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ اس مقدس صحیفے کی کتابت نہایت ہی ابتدائی زمانے سے شروع ہوگئی تھی بلکہ یہ کہ اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو خاص پیغمبر اسلام کی زبان سے نہ نکلا ہو، یا اس میں کوئی خفیف سی بھی تبدیلی کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے نہ صرف آنحضرت کے تمامتر تصورات، عقائد، رجحانات اور عزائم کا ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ تحریک اسلام کی اصل روح بھی سامنے آجاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس زمانے کی سماجی ضروریات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ واقعاتِ سیرۃ کو سمجھنے کے لیے قرآن سے بہتر کوئی دوسرا ماخذ نہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں اور اسی لیے اس میں تاریخی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا، جو تاریخ نویسی کے لیے سب سے ضروری شے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت کی پوری زندگی کا شاید ایک بھی اہم واقعہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن میں ٹھیک وقت پر کوئی بیان نہ دیا گیا ہو، یا اس کی مناسب توجیہ نہ کی گئی ہو۔ تقریباً تمام اہم غزوات کے متعلق قرآن میں واضح بیانات ہیں حتیٰ کہ آنحضرت کی نجی اور خانگی زندگی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں، اسی لیے سیرۃ کی قدیم کتابوں میں اس کے حوالے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اور آج بھی کوئی سیرۃ نویس اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

**دوسرا ماخذ** قرآن کے بعد دوسرا ماخذ ان سرکاری ریکارڈوں کا ہے جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئے تھے، مثلاً آنحضرت کے مکاتیب، معاہدات، اور فرامین وغیرہ، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور اس تعداد سے اس زمانے کے سیاسی انتشار اور عرب قبائل کی لامرکزیت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی جملہ دستاویزیں انتہائی قیمتی اور قابل اعتماد ماخذ تصور کی جاتی ہیں۔ جن سے اس زمانے کے اکثر سیاسی اور سماجی مسائل خود بخود سامنے آجاتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ان دستاویزوں کو اصلی کہا جاسکے۔ اور ان کے اصل متن ہمارے سامنے ہوں۔ چنانچہ علمائے سیرت نے شروع سے ان بیش بہا دستاویزوں کو محفوظ کرنے کی پوری کوشش کی تھی، نیز موقع بموقع ان کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ اصل عبارتیں تک نقل کی ہیں۔ چونکہ یہ دستاویزیں بجائے خود بھی ایک تاریخ کا مرتبہ رکھتی تھیں۔ اس لیے غالباً دوسری صدی کے اختتام سے پہلے ان کو یکجا جمع کرنے کے اقدامات شروع ہوگئے تھے، ابن ندیم نے مدائنی (۱۳۵ھ۔ ۲۱۵ھ) کی متعدد تصنیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں:-

۱۔ کتاب عہود النبی
۲۔ کتاب رسائل النبی
۳۔ کتاب کتب النبی الی الملوک
۴۔ کتاب من کتب لہ النبی کتاباً و اماناً [1]

ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدائنی کے زمانہ (یعنی دوسری صدی میں) ان قدیم دستاویزوں نے کتابی صورت اختیار کر لی تھی، اور ان میں سے سب کو نہیں تو اکثر کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا تھا۔
میور نے خود ان قدری کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان کی ( Biography ) میں ایک مستقل باب خاص ان معاہدات کے متعلق ہے۔ جس میں تقریباً دو یا تین بیسی ( Two or Three Score ) معاہدات کی نقلیں موجود ہیں اور بقول میور یہ نقلیں احتیاط سے کی گئی ہیں کہ ان میں

[1] ابن ندیم (اخبار المدائنی) ۱۴۷

سے اکثر دستاویزوں کو یا تو خود واقدی نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا یا اس کے کسی راوی نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا[1] میرے سامنے واقدی کا یہ باب نہیں البتہ واقدی کے شاگرد خاص ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات کی تیسری جلد میں بھی ان دستاویزوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو میرے پیش نظر ہے انہیں مجھے متعدد تحریریں ایسی مل سکیں جو واقدی واقدی کی نظر سے گذری تھیں[2] اور معلوم ہوتا ہے ان کا لفظ لفظ اصل دستاویزوں سے نقل کیا ہے۔

ابن سعد نے اس باب میں لگ بھگ سو مکتوبات اور معاہدے نقل کیے ہیں، اور ہر مکتوب یا معاہدے سے پہلے بطور تعریف تقریباً ایک ہی قسم کے الفاظ تحریر کیے ہیں۔ مثلاً، اور اہل علم بیان کرتے ہیں؟ اور علماء کا بیان ہے؟ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد کے عہد تک مدائنی کے علاوہ دوسرے علماء بھی اس موضوع پر کتابیں لکھ چکے تھے جو ابن سعد کے پیش نظر تھیں۔ ورنہ صرف مدائنی یا واقدی کا حوالہ کافی ہوتا۔

قدیم مورخین کو ان قیمتی دستاویزوں کی نقلیں کہاں سے ملیں، اور کس طرح ان کو جمع کیا گیا؟ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ قیاس غالب یہی ہے کہ یا تو یہ سرمایہ سرکاری دفاتر کے ریکارڈوں سے نقل کیا گیا ہوگا یا پھر ان قبائل کے قبضے سے مورخین تک پہنچا جن کے حق میں یہ تحریریں لکھی گئی تھیں۔ عہد رسالت میں دستور تھا کہ معاہدات کی دو نقلیں ہوتی تھیں ایک مدینہ میں رہتی اور دوسری فریق ثانی کے پاس۔ بہرصورت ان میں سے جو بات بھی ہو اتنا یقینی ہے کہ ان دستاویزوں کا بڑا حصہ ایک مدت تک اصل حالت میں محفوظ رہا جس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان فرامین اور معاہدات میں مختلف قبائل کو جو مراعات دی گئی تھیں، ان پر مسلسل عمل ہوتا رہا تھا۔

اشپرنگر کا خیال ہے کہ ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں بھی ان پر پورا عمل ہوتا رہا تھا[3]۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ جملہ دستاویزیں سیرۃ کا ایک ماخذ تھیں، جو ہمارے سیرۃ نگاروں کے سامنے رہیں، اور آج بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بشرطیکہ ہمیں ان کی صحت کا یقین ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ اگرچہ ان کا بڑا حصہ صحیح اور اصلی ہے، لیکن انہیں بعض مکتوبات ایسے بھی ہیں جن کی اصلیت بڑی حد تک مشکوک ہے، اور بعض صاف طور پر اصل دستاویزوں کا خلاصہ معلوم ہوتے ہیں۔

ابن ندیم کا بیان ہے کہ ان دستاویزوں میں سے چند اس کے زمانے تک محفوظ تھیں جن کو اس نے ایک پرانی کتابوں کے شوقین کے پاس بچشم خود دیکھا تھا[4]

ان دستاویزوں کے علاوہ، عہد رسالت کے سرکاری ریکارڈوں میں وہ رجسٹر بھی کم اہمیت نہیں رکھتے جو مختلف اغراض کے تحت اہتمام سے مرتب ہوتے رہے تھے، فصل دوم میں بیان کیا جاچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) کہ عہد رسالت میں ایک جنرل رجسٹر بھی موجود تھا جس میں تمام مسلمان مردوں کے نام درج تھے، غزوات و سرایا کے سلسلے میں جو رجسٹر مرتب ہوتے، ان کا بھی ذکر آچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) یہاں مجھے اتنا اضافہ کرنا ہے کہ عہد رسالت میں غالباً ان رجسٹروں کو "کتاب حافظ" کہا جاتا تھا کعب بن مالک جو نہایت قدیم الاسلام صحابی ہیں اور تقریباً ہر غزوے میں بجز غزوۂ تبوک کے شریک رہے، کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت کے ہمراہ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے نام "کتاب حافظ" (یعنی دیوان میں) نہ آسکے تھے[5] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک کے علاوہ باقی تمام غزوات میں یہ "کتاب حافظ" ضرور تیار ہوتی۔ گمان غالب ہے کہ ابتدائی رواۃ یا مدونین سیرۃ کے سامنے یہ مواد پورا کا پورا موجود تھا جسکو پیش نظر رکھ کر شرکائے غزوات (صحابہ، یا مقتول و مجروح مجاہدین) کی انہوں نے نام بنام نشاندہی کی تھی اور صحیح اعداد و شمار بیان کیے تھے۔

مثال کے طور پر ابن اسحٰق نے بڑی تفصیل کے ساتھ شرکائے بدر کے سیکڑوں نام معہ ولدیت اور خاندان بیان کیے ہیں[6]۔ جنگ احد کے ایک ایک مقتول اور مجروح سپاہی کی نام بنام فہرست پیش کی ہے[7] اس طرح دوسرے غزوات میں جو مجاہدین شہید ہوئے ان کی مکمل فہرستیں کتابا

---

1 MUIR LIFE xxii 2 طبقات ۳/۳۴ 3 MUIR LIFE xxii 4 ابن ندیم/۱۷ 5 والمسلمون مع رسول اللہ کثیر ولا یجمعهم کتاب حافظ یرید الدیوان (کتاب المغازی) 6 ابن ہشام / 7 ابن ہشام /

شامل نہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق کو یہ جملہ تفصیلات کہاں سے ملیں، اور کس نے ان طویل فہرستوں کو پوری تفصیلات کے ساتھ روایت کیا تھا؟ اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں، کیوں کہ خود ابن اسحٰق بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ فہرستیں بلا کسی تحریری ریکارڈ کے ممکن نہیں، اور اگر اس قسم کے ریکارڈوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود نہ ہوتا تو ہمیں حق پہنچا تھا کہ ان تمام تر تفصیلات کو مشکوک نظر سے دیکھیں اور تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر اس بات کی تلاش کریں کہ اس فہرست سازی کی کن کن اغراض کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ مگر ان رجسٹروں کی موجودگی میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفصیلات شاید ان پچھلے ریکارڈوں سے ماخوذ ہوں گی جن کو ابن اسحٰق کے کسی ابتدائی ماخذ نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا؛

اسی طرح ابن اسحٰق نے بلا کسی ادنیٰ حوالے کے مقاسم خیبر کی تفصیل دی ہے، اور خاص خاص لوگوں کو جو عطیات دیئے گئے تھے ان کے نام گنائے ہیں۔ اس فہرست میں عطیات کے اوزان تک کا خیال رکھا گیا ہے، میں یہاں ان کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جو اگرچہ تھوڑا طویل اور اکتا دینے والا ہے۔ تاہم معاملے کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس پر نظر رکھنا ضروری ہے، ابن اسحٰق کہتے ہیں:-

"پھر آنحضرت نے کتیبہ کو جس کا تعلق خاص وادی سے تھا، اپنے رشتہ داروں اور ازواج کے درمیان تقسیم فرمایا، اور چند مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی اس میں سے عطیات دیئے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمہؓ کو دو سو وسق دیئے اور علی بن ابی طالب کو ایک سو وسق اور اسامہ بن زید کو دو سو اور پچاس وسق کھجوریں، اور ام المومنین عائشہ کو دو سو وسق اور حضرت ابوبکر کو سو وسق، اور عقیل بن ابی طالب کو ایک سو چالیس وسق اور جعفر کی اولاد کو پچاس وسق اور ربیعہ بن حارث کو سو وسق، اور صلت بن مخرمہ کو مع ان کے دونوں بیٹوں کے سو وسق اس طرح کہ صلت کے چالیس اور ابی نبقہ کے پچاس، اور رکانہ بن عبد یزید کو پچاس وسق اور قیس بن مخرمہ کو تیس اور عبیدہ بن حارث کے بیٹوں اور ان کے بیٹے حصین بن حارث کو سو وسق، اور بنی عبید بن عبد یزید کو ساٹھ اور اوس بن مخرمہ کے بیٹے کو تیس وسق اور مسطح بن اثاثہ اور ابن الیاس کے بیٹے کو پچاس وسق اور ام رمیثہ کو چالیس وسق اور نعیم بن ہند کو تیس، اور بحینہ بنت حارث کو تیس وسق، اور عجیر بن عبد یزید کو تیس وسق اور ام حکیم کو تیس وسق اور جمانہ بنت ابی طالب کو تیس وسق اور ابن ارقم کو پچاس اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو چالیس، اور حمنہ بنت جحش کو تیس وسق اور زبیر کی ماں کو چالیس وسق اور ضباعۃ بنت زبیر کو چالیس اور ابن خنیس کو تیس وسق اور ام طالب کو چالیس وسق اور ابی بصرہ کو بیس اور نمیلہ کلبی کو پچاس وسق اور عبداللہ بن وہب کو مع ان کے دونوں بیٹوں کے نوے وسق جن میں سے بیٹوں کے چالیس تھے اور ام حبیب جحش کو تیس وسق اور ملکو بن عبدہ کو تیس وسق اور اپنی کل ازواج کو ۷۰۰ وسق عطا فرمائے۔" [1]

ان تفصیلات کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ تو شاید کوئی بھی نہیں نکال سکے گا، کہ ابن اسحٰق نے اس فہرست کو کسی کتاب یا دستاویز سے نقل کیا ہے اور یہ جملہ تفصیلات محض زبانی روایت کا نتیجہ ہیں۔ کیوں کہ اول تو روایت کی ساخت سے یہ اندازہ نہیں ہوتا، کیوں کہ ذہن انسانی سوا سو سال تک ان غیر اہم اور غیر متعلق تفصیلات کو یاد رکھنے سے قاصر ہے اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو شاید مصنف اس فہرست کے راوی کا حوالہ ضرور دیتا، جیسا کہ دوسری روایتوں کے سلسلے میں التزام ہے، اسی طرح یہ نتیجہ نکالنا بھی ممکن نہیں کہ یہ تمام تفصیلات خود ابن اسحٰق کی خود ساختہ یا بالقصد گھڑی گئی ہیں کیوں کہ ان سے نہ تو کسی خاص عقیدے کی تائید ہوتی ہے، اور نہ کسی غیر معمولی واقعہ کی طرف ہمارے ذہن منتقل ہوتے ہیں، پوری فہرست میں شاہیر کے نام محض گنتی کے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ تمام تر فرضی نہیں، بلکہ اصلی ہیں ان کے بیان کرنے سے مصنف کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ (کم سے کم) متذکرہ مال غنیمت کی تقسیم تحریری صورت میں ہوئی تھی۔ یحییٰ بن آدم جو دوسری صدی کے مشہور فقہا اور محدثین میں ہیں، اپنی کتاب الخراج میں بشر بن یسار کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں،

"فكتب فيها رسول للناس وكان لازواجه من ذالك" [2]

---

[1] ابن ہشام؛ [2] کتاب الخراج ص ۱۱۹ قاہرہ

بنابریں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جملہ تفصیلات عہد رسالت کے کسی سرکاری یا دفتری ریکارڈ سے نقل کی گئی ہیں خواہ اس کی نقل کسی اہل علم صحافی نے کی یا کسی مصنف نے بہر صورت ابن اسحٰق کو یہ روایت مکتوبی صورت میں پہنچی۔ چاہیے سیرۃ کی کتابوں میں اس قسم کی اور متعدد مثالیں موجود ہیں، جن کو میں یہاں ترک کرتا ہوں۔

**تیسرا ماخذ** سرکاری ریکارڈوں کے بعد کتب سیرۃ کا سب سے اہم ماخذ صحابہ کی وہ تحریریں کہی جا سکتی ہیں جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئیں اور جن کو تاریخی نقطۂ نظر سے معاصرین اور چشم دید گواہوں کی شہادتوں کا مرتبہ حاصل ہے۔

ان تحریرات کا پتہ نہ صرف روایات سیرۃ کی بناوٹ اور پرواز بیان سے چلتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں ان کے متعدد حوالے اور تذکرے موجود ہیں، جن پر ہمیں بڑی احتیاط اور غور و فکر کے ساتھ نظر ڈالنا چاہیے، تاکہ بے جا افراط و تفریط سے بچ سکیں، چونکہ یہی ماخذ ایسے ہیں جن پر واقعاتی تفصیلات کا بیشتر مدار ہے۔ اس لیے میں یہاں تھوڑی تفصیل سے کام لوں گا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں متعدد صحابہ آنحضرت کے احکام، افعال اور واقعات کو ضبط تحریر میں لاتے رہتے تھے، ان میں سے اکثر کی یادداشتیں غالباً بہت مختصر تھیں، اور یہ لوگ خاص خاص امور کے متعلق کچھ نوٹ کر لیتے، اس لیے ان پر لفظ تالیف یا تصنیف کا اطلاق مشکل ہے، تاہم کئی اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے پاس ضخیم مجموعوں کا پتہ چلتا ہے اور انھیں اس عہد کی کتابیں یا تالیفات کہنا بیجا نہ ہوگا، ان میں سے کم سے کم ایک کتاب کا نام بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہے، یعنی "صادقہ" کا جس کا میں آئندہ تفصیلی تذکرہ کروں گا۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس قسم کی تحریرات کا تعلق صرف مدینے کے رہنے والے صحابیوں تک محدود تھا، جو پیغمبر اسلام کی ذات اور شخصیت سے خاص طور پر متاثر تھے اور ان کے وسائل حیات کا تعلق بھی اسلامی تحریک کی کامیابی سے وابستہ ہو چکا تھا، جس کی بنا پر یہ ہمہ وقت دربار نبوت میں حاضر رہتے، اور آپ کے ایک ایک حکم اور ایک ایک عمل کا بغور مطالعہ کرتے۔ یہ خیال اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے مگر پھر بھی تھوڑی ترمیم کا محتاج ہے کیونکہ اسلام کی ہمہ گیر قوت انجذاب نے گرد و پیش اور دور و نزدیک کے قبائل کو بھی اتنا ہی متاثر کیا تھا جتنا خود اہل مدینہ کو۔

جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس کے سربراہ مدینے آتے، اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر اس عجیب و غریب شخصیت کے ویسے ہی دلدادہ ہو جاتے جیسے مدینے والے تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان کے تمام تر روحانی اور مادی وسائل کا واحد مرکز ثقل صرف آنحضرت کی ذات گرامی بن جاتی اور مدینے کی راجدھانی سے دینی، سیاسی، اور معاشی رشتے قائم ہو جاتے، جن کا ریکارڈ نہ صرف سرکاری طور پر ضروری تھا، بلکہ افراد متعلقہ کے لیے بھی عین سعادت تھی۔

خوش قسمتی سے اوراق تاریخ میں کم سے کم دو شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مدینے سے باہر بھی اس قسم کی تحریریں لکھی جاتی تھیں اور بعض قبائل میں بڑے عرصے تک یہ اپنی اصل شکل و صورت میں باقی رہیں۔ میرا مطلب بنو عذرا اور سلامان کی تحریری یادداشتوں سے ہے جن کا تذکرہ بصراحت ابن سعد نے کیا ہے۔ یہ دونوں قبیلے سنہ ۹ھ اور سنہ ۱۰ھ میں علی الترتیب اسلام لائے تھے۔ ان میں سے پہلے بنو عذرا کی یادداشت ملاحظہ فرمائیے جو ایک عذری نے اپنے بزرگوں کے باقیات میں دیکھی تھی اور گویا بنو عذرا کے مسلمان ہونے کی کہانی خود انکی زبانی ہے، عمر بن حریث العذری کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں کے ایک مکتوب میں دیکھا کہ

> صفر سنہ ۹ھ میں رسول اللہ کے پاس ۱۲ آدمیوں کا ایک وفد آیا جس میں حمزہ بن نعمان العذری اور مالک کے دونوں بیٹے سلیم اور اسد بھی موجود تھے، اور مالک بن رباح بھی، یہ لوگ رملہ بنت الحارث النجاریہ کے مکان میں مقیم ہوئے، نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے تو جاہلی سلام کیا، اور کہا کہ ہم لوگ قصی کے اخیافی بھائی ہیں۔ ہمیں نے خزاعہ اور بنو بکر کو مکے سے نکالا تھا اور ہماری آپ سے قرابت داری اور رشتے ہیں۔
>
> رسول اللہ نے فرمایا مرحبا و اہلاً۔ مجھ سے کسی نے تمہارا تعارف نہ کرایا تمہیں اسلامی سلام سے کس بات نے روک دیا
>
> ان لوگوں نے کہا کہ ہم اپنی قوم کی فکر میں آئے ہیں۔
>
> بعد ازاں آنحضرت سے چند دینی باتیں دریافت کیں جن کی آپ نے تشریح کی، تو سب مسلمان ہو گئے چند روز

قیام کے بعد اپنے عیال میں واپس آ گئے۔

آنحضرت نے انھیں اسی طرح انعام و اکرام سے نوازا جس طرح آپ دوسرے مومنوں کو نوازتے تھے۔ ایک شخص کو آپ نے چادر بھی مرحمت فرمائی۔"[۱]

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث کے سامنے ان کے بزرگوں کی لکھی ہوئی کوئی نہ کوئی یادداشت موجود تھی جس کا خلاصہ اور نچوڑ انھوں نے اپنے لفظوں میں دہرایا ہے، اور صرف ایک ہی واقعہ یعنی اسلام بنو عذرا کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر اتنی مختصر نہ تھی اور اس میں کچھ اور باتیں بھی ہوں گی جن کو خارج از بحث سمجھ کر قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ اپنے اسلام لانے کی داستان کو تحریری صورت میں محفوظ رکھتے تھے ان کے سامنے دوسرے مسائل اور دوسری قابل تحریر باتیں بھی ہیں۔

حدیث کے بیان میں صفر ۹ھ کا حوالہ بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی خود حدیث کے زمانے کا جبکہ سنہ ہجری رائج ہو چکا تھا۔ اس لیے اصل دستاویز میں یہ صراحت ممکن نہیں، سنہ ہجری کا اجرا خلیفہ ثانی کے عہد کا واقعہ ہے۔

اب بنو سلامان کی یادداشت پر نظر کیجئے، یہ بھی اگرچہ ایک طویل دستاویز کا مختصر حصہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کی عبارت سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ اصل دستاویز سے لفظاً لفظاً نقل کی گئی ہے۔

محمد بن یحییٰ بن سہیل بن ابی حثمہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد کی تحریرات میں دیکھا کہ

"حبیب بن عمرو السلامانی بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ وفد سلامان میں رسول اللہ صلعم کے پاس آئے۔ ہم سات آدمی تھے۔ رسول اللہ کے پاس پہنچے تو آپ مسجد سے نکل کر ایک جنازے میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ جس کی طرف آپ نے مدعو کیا تھا۔ ہم نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ" تو آپ نے "وعلیکم" کہہ کر جواب دیا (پھر فرمایا) تم کون ہو؟ عرض کی کہ ہم بنو سلامان سے ہیں اور اس لیے آئے ہیں کہ آپ کی اسلام پر بیعت کریں کہ ہم پسماندگان میں سے ہیں اور ان کے نمائندے ہیں۔

آنحضرت اپنے غلام ثوبان کی طرف بڑھے اور فرمایا کہ اس وفد کو بھی وہیں ٹھہراؤ جہاں دوسرے قیام کرتے ہیں۔ نماز ظہر کے بعد آپ اپنی رہائش گاہ اور منبر کے درمیان تشریف فرما ہوئے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے، نماز اور شریعت اسلام اور جھاڑ پھونک کے متعلق سوالات کیے۔

آپ نے ہم میں سے ہر شخص کو پانچ پانچ اوقیہ چاندی عطا فرمائی اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ یہ واقعہ شوال سنہ ۱۰ھ کا ہے۔"[۲]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس روایت کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنو سلامان کے وفد نے جب باریابی حاصل کی تھی تو یہاں سے واپسی کے بعد، حبیب بن عمرو السلامانی نے جو اس وفد کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں، مدینے کی پوری روداد یحییٰ بن سہیل کو سنائی جنھوں نے اس کو قلمبند کر لیا، اور اس کے بعد ان کے لڑکے محمد نے اصل دستاویز سے نقل کر کے مئلانشیان تاریخ کے حوالے کیا، آخری نوٹ یعنی یہ واقعہ شوال سنہ ۱۰ھ کا ہے۔" حدیث کی طرح یا تو خود محمد بن یحییٰ کا ہے، یا کسی سیرۃ نگار کا۔

بنو عذرا کی یادداشت کی طرح غالباً یہ دستاویز بھی مختصر نہ تھی، بلکہ شاید طویل تھی محمد نے صرف وہی حصہ نقل کیا ہے جس کا تعلق بنو سلامان کے اسلام لانے سے تھا۔

ان دونوں دستاویزوں کو مثال قرار دے کر یہ بات پوری قطعیت سے کہی جا سکتی ہے، کہ سیرۃ کی کتابوں میں کم سے کم وفود و قبائل کے سلسلے میں جو تفصیلات موجود ہیں وہ اگر سب نہیں تو بیشتر اسی قسم کی یادداشتوں کا نتیجہ ہیں جو خاص مدینے میں بھی ریکارڈ ہوتی رہیں اور متعلقہ

---

[۱] ابن سعد ۳/۶۶　[۲] ابن سعد ۳/۶۷

قبائل میں بھی ان کو تبرکاً محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

یہ بات قطعاً خلاف قیاس ہے کہ اس قسم کی یادداشتیں صرف بنو عذرا اور بنو سلامان نے ہی تحریر کی تھیں، اور دوسرے قبائل نے جو میدان تعلیم اور سیاسی شعور میں ان سے آگے تھے کوئی تحریری ریکارڈ نہ چھوڑا ہوگا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں ملک کے طول و عرض میں روایات سیرت کا ایک معتدبہ حصہ غالباً تحریری صورت میں موجود تھا۔

اب میں قارئین کی توجہ خاص مدینے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو مرکز اسلام تھا اور جہاں چند در چند ضروریات کے تحت آنحضرت کے اقوال و احکام اور حالات تحریری یادداشتوں کی صورت میں منتقل ہو رہے تھے، افراط تحریر کا یہ عالم تھا کہ کم سے کم ایک بار) خود آنحضرت نے بعض صحابہ کو حکم دیا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھیں اور اگر کسی نے لکھ لیا ہے تو اس کو مٹا دے۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے (دوبارہ) اجازت چاہی تو انکار کر دیا گیا[1]۔

اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کی ایک جماعت کثیر اس کام میں مشغول تھی۔ جن میں بہت سے بے احتیاط اور کم سوجھ بوجھ کے افراد بھی شامل تھے۔ لیکن محتاط اور صاحب شعور افراد کی بھی کمی نہیں تھی، اور تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو آج بھی درجنوں صحابہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن کے پاس چھوٹے بڑے صحیفے موجود تھے، بلکہ بعض نے تو شاید مستقل تصنیفیں چھوڑی تھیں۔

ان میں سے چند اکابر صحابہ کے نام بطور مثال پیش کرتا ہوں جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مصنفین نے خاص پیغمبر اسلام کی حیات اوقات یا تعلیمات کے متعلق کچھ نہ کچھ تحریر کیا تھا، مثلاً:

سعد بن عبادہ[1]، جابر بن عبد اللہ[2]، عبد اللہ بن مسعود[3]، سمرہ بن جندب[4]، رافع بن خدیج[5]، ابو موسیٰ اشعری[6]، ابو رافع[7]، عبد اللہ بن عمرو بن عاص[8] انس بن مالک[9] وغیرہ۔

ان میں دو آخر الذکر ایسے صحابیوں کے نام ہیں جن کی تالیفات کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔ باقی کتابوں کے متعلق ایسی کوئی شہادت ہمارے علم میں نہیں جس کی بنا پر ان کو زمانہ بعد کی تصنیف قرار دیا جائے بہر صورت یہ پورا لٹریچر تابعین کے عہد تک ہر طرح محفوظ تھا اور اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

سعد بن عبادہؓ کی کتاب کا حوالہ ترمذی میں موجود ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب انتہائی بلند پایہ ہوگی، سعد نہ صرف خزرج کے رئیس اور انصار کے چوٹی کے لوگوں میں تھے، بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی ان کی شخصیت بہت بلند تھی، مدینے کی سب سے اونچی تعلیمی ڈگری یعنی "سند کاملیت" ان کے پاس تھی۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ کی کیفیت یہ تھی کہ آنحضرت کی رحلت کے بعد ابو بکر صدیق کے مقابلے میں منصب خلافت کا کوئی دوسرا امیدوار کھڑا ہو سکتا تھا، تو وہ صرف سعد بن عبادہ کی ذات تھی۔ ترمذی کی اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں غالباً بعض قانونی مسائل تھے سعد کے ایک صاحبزادے کے بقول گواہ کو حلف دینے کا مسئلہ اس کتاب میں موجود تھا[3]۔

اسی طرح جابر بن عبد اللہ کی کتاب بھی مدتوں تابعی علماء کے زیر مطالعہ رہی۔ اس صحیفے کی منزلت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قتادہ کو سورہ بقرہ پر اتنا عبور نہ تھا جتنا اس صحیفے پر[4]۔ حسن بصری کے مطالعہ میں بھی یہ کتاب رہی، کہا جاتا ہے کہ ان کی روایات کا ایک ماخذ یہ صحیفہ بھی تھا[5]۔

---

[1] عن ابی سعید الخدری، ان النبیؐ قال لا تکتبوا فنی شیأ الا القرآن. فمن کتب عنی شیأ فلیمحہ القرآن

[2] ...... عن ابی سعید الخدری، انھم استاذنوا النبی فی ان یکتبوا عنہ فلم یاذن لھم۔

[3] قال ربیعہ داخبرنی ابن السعد بن عبادۃ قال وجدنا فی کتاب سعد ان النبی قضی بالیمین مع الشاھد (ترمذی کتاب الاحکام ۸۹/۱)

[4] التاریخ الکبیر ۱۸۲/۴ [5] کفایہ / ۳۵۴

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم جابر سے اکثر سنن رسول اللہ کے متعلق باتیں دریافت کرتے اور ان کو لکھ لیتے تھے[1] وہب بن منبہ نے بھی جو مشہور مصنف ہیں ان سے روایات کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیفہ جابر کو خود ان کی حیات میں کئی مشہور مصنفین نے نئے نئے جنم دیئے اور اپنے پاس اس کے اقتباسات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعود کی کتاب بھی قابل ذکر ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع و تفصیلات کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ بڑے عرصے تک ان کے خاندان میں محفوظ رہی، معن کہتے ہیں کہ ایک بار ان کے بیٹے عبداللہ نے جب یہ کتاب مجھے دکھائی، تو قسم کھا کر کہا کہ یہ صحیفہ خود ان کے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے[2]۔

عبداللہ بن مسعود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف قرآن پر ہو؛ یا اس کی تشریحات پر بہرصورت اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے اس کتاب کے اصل موضوع کا پتہ چل سکے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عبداللہ سے بہت سی روایتیں منقول ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا تعلق روایات سے ہو؛

کہتے ہیں کہ سمرہ بن جندب کی کتاب بھی تابعی علماء کے لیے بڑی حد تک باعث کشش رہی یہ کتاب ان کے بیٹے سلیمان کو ورثہ میں پہونچی ابن سیرین کا بیان ہے کہ سلیمان نے اپنے والد کے حوالے سے ایک بڑی کتاب (نسخہ کبیرہ) روایت کی ہے[3] ابن سیرین کہتے ہیں کہ سمرہ نے اپنے مطالعے کے لیے جو کتاب مرتب کی تھی، اس میں علم کثیر تھا۔

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت نے خاص خاص لوگوں کے لیے کتابت حدیث کی ممانعت کر دی تھی اور جب ان لوگوں نے دوبارہ اجازت چاہی تو بھی نہ ملی، رافع بن خدیج ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے آنحضرت سے استمزاج کیا تو ان کو اجازت دیدی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرتے رہے۔ چنانچہ مروان کے زمانے میں جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مدینہ حرم ہے یا نہیں، تو انھوں نے خود اپنی کتاب کے حوالے سے مدینے کے حرم ہونے پر استدلال کیا اور کہا کہ تم چاہو تو میں اس کی عبارت پڑھ کر سنادوں۔ یہ کتاب اد یم خولان پر لکھی گئی تھی[5]

متذکرہ بالا کتابوں میں غالباً سب سے اہم کتاب عبداللہ بن عمرو بن عاص کی صادقہ ہے، جس کی اہمیت شاید عہد رسالت میں بھی سب کو تسلیم تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام بھی اس عہد کی یادگار ہے، کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جس وقت یہ لکھی جا رہی تھی تو اس کے مندرجات و مضامین سے خود عبداللہ کے دوست اور قرابت دار بھی ڈرتے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ ایکبار قریش نے ان سے شکایت کی اور کہا کہ آنحضرت بہرحال بشر ہیں کبھی عام انسانوں کی طرح غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں[6]۔ اور کبھی عالم رضا میں، اور تم سب کچھ لکھ لیتے اس پر عبداللہ نے آنحضرت سے استمزاج کیا۔ اور آپ کی اجازت سے پھر لکھنے لگے۔ عبداللہ کا یہ استمزاج اور پھر آنحضرت کی اجازت کے متعلق بکثرت روایتیں موجود ہیں۔

اور بقول الفریڈ گیوم۔ کم سے کم تین مختلف طرق سے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جن میں بہت معمولی لفظی اختلاف ہیں[7]۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صادقہ کا وجود فرضی نہیں اور اس کی تصنیف خاص عہد رسالت میں ہوئی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ تابعین میں سے اکثر علماء نے اس کتاب کو بچشم خود دیکھا اور استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ مجاہد کو بھی یہ سعادت حاصل تھی[8] یہ صحیفہ مدتوں ان کے خاندان میں محفوظ رہا اور عبداللہ کے پوتے عمرو بن شعیب جب اپنے دادا سے روایت کرتے تو بطور سند کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی[9]۔ قیاس چاہتا ہے کہ ان کی روایات کا بڑا حصہ خود اسی کتاب سے ماخوذ ہے[10]۔

---

[1] شرح معانی الآثار للطحاوی ٢/٣٨٤ [2] تہذیب التہذیب ١/٢١٦ [3] جامع بیان العلم ١/٣٧ [4] تہذیب التہذیب ٤/٣٩
[5] مسند ٤/١٤١ [6] عن عبداللہ بن عمرو قال قالت لی قریش تکتب عن رسول اللہ وانما بشر یغضب کما یغضب البشر فاتیت رسول اللہ ..... [7] مستدرک ١/١٠٤ جامع بیان العلم ١/٣٦
[8] [9] ترمذی
[10]

آخر میں انس بن مالک کی قلمی کاوشوں کا ذکر بھی ضروری ہے، اس لیے کہ انھوں نے بھی آنحضرت کے حالات بکثرت جمع کیے تھے ایک روایت مستدرک حاکم میں معبد بن بلال سے اس طرح منقول ہے کہ جب ہم انس سے زیادہ سوالات کرنے لگتے، تو وہ ایک محال نکال لاتے اور کہتے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے خاص رسول اللہ سے سنی تھیں، اور ان کو لکھ لیا تھا، اور اس نوشتے کو میں نبی علیہ السلام کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ گویا اس تالیف کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔[۱]

انس اگرچہ اپنی اولاد کو بھی ترغیب کتابت دیتے،[۲] مگر ان کی روایات بیشتر مشہور تابعی عاصم بن عمرو بن قتادہ سے مروی ہیں۔ جن کا شمار سیرۃ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سیرۃ کی کتابوں میں ان سے کثیر روایتیں ملتی ہیں کہ اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو واقعات سیرۃ بالکل تشنہ رہ جائیں گے۔ گمان غالب ہے کہ انس کی تصنیف عاصم کے ہمیشہ پیش نظر رہتی۔ عاصم کے علاوہ دوسرے تابعی بھی ان سے تحصیل علم کرتے چنانچہ آبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انس کے پاس بیٹھے الواح پر لکھا کرتے۔

مندرجہ بالا مثالوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عہد رسالت میں بہت سے صحابہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق آنحضرت کے حالات، اوامر، نواہی، قانونی نکات اور واقعات لکھ لیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر کی یادداشتیں اور کتابیں عہد تابعین تک محفوظ رہیں۔ پہلی صدی کے آخر میں جب علم حدیث و سیرۃ کی عمارت نئے انداز سے تعمیر ہونا شروع ہوئی تو اس کے آب و گل میں یہی قدیم لٹریچر استعمال کیا گیا یا بالفاظ دیگر اس لٹریچر نے نیا جنم پاکر پیغمبر اسلام کی سیرۃ اور قانون اسلام کی شکل اختیار کر لی۔ تاہم یہ دعویٰ کسی عنوان نہیں کیا جا سکتا کہ عہد رسالت کے یہ مکتوبات بہ تمام و کمال علمائے اسلام کو مل گئے تھے، اور ان کا کوئی حصہ زمانے کی دستبرد کا شکار ہو کر ضایع نہیں ہوا مجھے تسلیم ہے کہ دور آخر کے صحابہ اور تابعین نے اس قیمتی لٹریچر کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، اور طرح طرح سے اسے زندہ رکھنے کے اقدامات کیے۔ لیکن مختلف تاریخی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ پھر بھی ضایع ہو گیا۔

عہد رسالت کے فوراً بعد جب مصر، شام، اور عراق فتح ہوئے تو اندرون عرب کے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں خاندان ترک سکونت کر کے وہاں آباد ہو گئے۔ ان میں مدینے کے گھرانے بھی تھے اور مکے کے بھی مہاجر بھی تھے اور انصار بھی، قدرتی طور پر یہ لپنے گھروں کی تمام ضروری اشیاء ساتھ لے گئے ہوں گے، کتابیں بھی۔ قرآن بھی، سامان کتابت بھی، اور یادداشتیں بھی۔ خاندانی سربراہ کے مرنے کی صورت میں، اور چیزیں تلف ہوں یا نہ ہوں، کتابیں ضرور ضایع ہو جاتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ عمر بھر کی کمائی دوسروں کے ہاتھ لگ جاتی ہے جنھیں ان کے مصنف کا نام بھی نہیں معلوم ہوتا؟

تاریخ میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اسی قسم کی لاوارث کتابوں کے متعلق ہیں، میں یہاں دو کتابوں کو بطور مثال پیش کرتا ہوں ان میں سے ایک کتاب عراق میں مشہور تابعی حسن بصریؒ کو ملی تھی، جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ محدثین جانتے ہیں کہ حسن کی اکثر روایتیں مرسل اور بے سند ہیں کسی نے ان سے سوال کیا کہ یہ حدیثیں آپ کس طرح بیان کرتے ہیں؟ (اور ان کا اصل ماخذ کیا ہے؟) تو حسن نے جواب دیا کہ ہمیں ایک کتاب مل گئی ہے۔[۳]

یہ صحیفہ کس کا لکھا ہوا تھا، کسی مہاجر کی تالیف تھا، یا انصاری کی؟ حسنؒ کے پاس کس طرح پہنچا؟ کس کس کے قبضے میں رہا، اوراق تاریخ میں ان باتوں کا کوئی جواب نہیں، علمائے متاخرین نے ان کی روایات کی اندرونی شہادتوں سے کچھ نتیجے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔[۴]

---

[۱] ...... عن معبد بن هلال قال كنا اذا اكثرنا على انس بن مالك اخرج علينا محالا عنده فقال هذه سمعتها وقال النبیؐ فكتبتها وعرضها عليه مستدرک ۳/ ۵۷۴ [۲] دارمی ۶۸/

[۳] قال حدثنا سوار يعني الوراق عن اخيه يسار، قال قيل للحسن يا ابا سعيد عمن هذه الاحاديث النبي تحدثنا　　صحيفة وجدناها، كفايه ۳۵۴/ [۴] ترمذی کتاب العلل

حسن بصریؒ سے سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں منقول ہیں جن کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس صحیفے سے ماخوذ نہیں ہیں۔

دوسری کتاب تقریباً اسی عہد میں ایک مصری عالم یزید بن ابی حبیب کو ملی تھی جس کا تعلق خاص طور پر تاریخ یا یوں کہیے کہ سیرۃ سے تھا آنحضرتؐ نے سنہ ۶ھ میں کچھ سفیر بیرونی ممالک کو روانہ کیے تھے اور ان کو خطوط دیکر کچھ خاص خاص ہدایتیں فرمائی تھیں، اس کتاب میں سفیروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ یہ ہدایتیں بھی تفصیلی طور پر درج تھیں۔

امام زہری کے زمانے میں جب تالیف سیرت کا کام زور شور سے ہو رہا تھا اور تحقیق حالات کے سلسلے میں حکومت وقت بھی ہاتھ بٹا رہی تھی تو اس قسم کے مخطوطات کا واحد مرجع صرف زہری کی ذات ہو سکتی تھی، چنانچہ یہ کتاب دمشق بھیجی گئی اور اس تزک کے ساتھ کہ ثقات شہر کا ایک وفد بھی ساتھ تھا۔[۵]

ظاہر ہے کہ یہ کتاب آنحضرتؐ کے کسی قریبی رفیق کار کے قلم سے نکلی ہوگی، جو واقعات کو بغائر نظر مطالعہ کر رہا تھا لیکن یہ کون تھا؟ کس کے ہاتھ سے یہ تحریر نکلی تھی؟ کچھ نہیں معلوم، حتیٰ کہ اس کے مکتشف یعنی یزید بن ابی حبیب المصری بھی یہ نہ بتا سکے کہ ان کے قیاس میں یہ کس کی تالیف تھی؟

اس قسم کی معلوم نہیں کتنی اور تالیفیں ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں کے ہاتھ آئیں، اور کتنی ضایع ہو گئیں۔ کتنی کتابوں سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور کتنی زمانے کے گرداب میں بہہ گئیں؟ بہر صورت ان دونوں شہادتوں سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ خاص صحابہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دفاتر مصر، شام اور عراق کے گلی کوچوں اور گھروں میں مدتوں گردش کرتے رہے، اور کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ ان کا لکھنے والا کون تھا۔

میری رائے میں کتب سیرت کی بے شمار ایسی روایتیں جنھیں قدیم سیرت نگاروں نے بالکل بے سند بیان کیا ہے سب نہیں تو ایک قابل لحاظ حد تک انھیں گمنام مصنفین کی رہین منت ہیں۔

اور ان کے بے سند ہونے کی بنیادی وجہ غالباً ایک یہ بھی ہے کہ ابتدائی سیرت نگاروں کو ان کے اصل مصنفین کے نام نہیں مل سکے تھے، روایتی اسناد کا تذکرہ آ گیا ہے تو یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعین کا ایجاد ہے صحابہ کے عہد میں اس کا رواج بہت کم بلکہ شاذ و نادر نظر آتا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث و سیرت میں، لو عمر یا جدید الاسلام صحابہ سے بے شمار ایسے واقعات کی روایتیں موجود ہیں جن میں یہ لوگ خود شریک تھے۔ اور محض سن کر یا کسی کتاب میں پڑھ کر انھوں نے ان واقعات کو بلا کسی ادنیٰ سند کے بیان کیا ہے۔

تابعین کے عہد میں بھی روایتی سند پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ یہ روایت کسی قابل اعتماد کتاب سے ماخوذ ہوں۔ چنانچہ اکثر تابعین کی بہت سی روایتیں بے سند ملتی ہیں، مثلاً عروہ بن زبیر، زہری، قتادہ وغیرہ نے سیرت کے سلسلے میں جو روایتیں بیان کی ہیں اکثر بے سند ہیں، کفایہ میں حیوۃ بن شریح سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ انھیں یزید بن ابی حبیب نے بتایا کہ فلاں شخص میرے پاس ایک کتاب چھوڑ گیا، یا ایسا ہی کوئی کلمہ کہا، تو میں نے اس میں اعرج کی روایتیں پائیں (حیوۃ کہتے ہیں کہ یزید نے) اس کتاب میں سے بہت سی باتیں ہمارے روبرو بیان کیں، مگر کسی کے ساتھ نہ "اخبرنا" کہا نہ "حدثنا"۔[۶] (باقی آئندہ)

---

۵..... حدثنی ابن اسحق عن یزید بن ابی حبیب المصری انہ وجد کتابا فیہ تسمیۃ من بعث رسول اللہ الی ملوك الخائبین وما قال لاصحابہ حین بعثھم فبعث بہ الی ابن شھاب الزھری مع ثقۃ من اھل بلد کا فعرفہ (طبری تاریخ السنۃ السادسۃ ۸۵)

۶..... قال حدثنا حیوۃ بن شریح عن یزید بن ابی حبیب قال ادعی فلاں تشبہ ھذہ الی کتاب فوجدت فیہ عن الاعرج وقال وکان یحدثنا یا لا یقول اخبرنا ولا حدثنا..... کفایہ ۳۱

# بہار عجم کے مخطوطے پر خانِ آرزو کے حواشی

راز یزدانی (مرحوم)

تصنیف و تالیف کی دنیا بظاہر اہل قلم اور ارباب علم کی دنیا ہے۔ اگر اس دنیائے شرفائے علم و ادب میں بھی چور بازاری اور بلیک میلنگ ہونے لگے تو اخلاق و تہذیب علم و فن کا "خدا حافظ و ناصر" لیکن بعض اوقات اس دنیا میں بھی ایسی دھاندلی ہو جاتی ہے کہ توبہ۔ مجھے تو خیر کئی اردو زبان کے باباؤں اور ناخداؤں کے بہت سے ایسے واقعات معلوم ہیں کہ جن سے پردہ اٹھے تو ڈکار لیے بغیر پرایا مال ہضم کر جانے والوں کے مکروہات کا پس منظر عوام کے سامنے آجائے لیکن جب تک چھپی باتیں چھپی رہیں تو ان سے چھیڑے بغیر گزر جانا ہی بہتر ہے۔

ایسے ہی بدقسمت مولفوں میں ایک نام ٹیک چند بہار کا ہے۔ بہار عجم کا مشہور مولف ٹیک چند بہار جس کی کتاب کو سب جانتے ہیں لیکن لائبریریوں کے علاوہ وہ ہمارے سامنے آئی تو "مصطلحات بہار عجم" کے نام سے رائے اندرمن کی تالیف کا روپ بدل کر۔ اندرمن بہار عجم کے مصنف کا شاگرد عزیز تھا۔ بہار عجم میں مولف نے سات بار ترمیم و تنسیخ کی اور ہر بار اس کا نیا مسودہ تیار کیا۔ ساتویں بار ترمیم و تنسیخ کے بعد مولف کا ارادہ اس ساتویں مسودے کو بھی صاف کرنے کا تھا لیکن ضعف پیری نے اس کے ارادے کا ساتھ نہیں دیا اور بستر مرگ پر وہ اپنا یہ "مسودہ ہفتمین" اور دوسری نادر کتابیں جن میں نوادر المصادر بھی شامل تھی اپنے شاگرد عزیز اندرمن کے سپرد کر گیا۔ لیکن اس شاگرد عزیز اور تلمیذ رشید نے استاد کے مال پر جس طرح ہاتھ صاف کیا اس کے نتیجے میں اب بہار عجم کا مطبوعہ نسخہ کہیں نہیں پایا جاتا لیکن "مصطلحات بہار عجم" ہر جگہ ملتی ہے۔

"مصطلحات بہار عجم" پہلی بار ۱۸۵۳ء میں دہلی سے محب العلوم پریس نے شایع کی لیکن اسی میں اندرمن پر وہ مثل صادق آئی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہر سیر کو سوا سیر اور ہر فرعون کو موسیٰ اس دنیا میں خود بخود مل جاتا ہے "مصطلحات بہار عجم" پر خاتمۃ الطبع لکھا منشی دھرم چند نے اور اندرمن کی پول کھول کے رکھدی۔ کہتے ہیں:

"بندہ درگاہ خداوند دھرم چند ابن منشی دیپ چند خلف لالہ برج لال مرحوم دیوان مندسور ۔ مضاف صوبہ مالوہ (قوم کھتری) ساکن شہر کہنہ حضرت دہلی و مقیم حال شہر ممینت بہر دار الحکومت شاہ جہاں آباد حرسہا اللہ عن الآفات والفساد در باب شرح حال نسخہ متبرکہ بہار عجم۔ بحسب فرمودہ جناب جد معظم صاف صاف میگوید کہ منشی ٹیک چند المتخلص بہ بہار مولف نسخہ مذکور قوم کھتری ساکن نہر نواب سعادت خاں مغفور واقع شاہ جہاں آباد بہار عجم تالیف خود را بعد حک و اصلاح ہفت بار از قلم ندرت رقم خود بخط نستعلیق از سواد بر بیاض آورد۔ میخواست کہ بار ہشتم ہم صاف نماید مگر چون در تراوش ضعف پیری راہ یافت ازاں جہت غنچہ مرادش ناشگفتہ ماند۔ رائے اندرمن قوم بیس باشندہ حصار صاحب دستور الحساب تلمیذ خاص مصنف بود در وقت آخرین نسخہ مذکور یعنی مسودہ ہفتمین بہار عجم و نسخہ نوادر المصادر دستخطی و تالیفی او معہ چند کتب دیگر بطور تبرک و یادگار از استاد خود حاصل نمود۔ چون نسخہ مرحوم بالکل مسودہ لائق صاف کردن بود مولف دستور الحساب بطور خود انتخاب مسطور گردانیدہ و دیباچہ خاتمہ آں از نام خود بران کتاب فیض انتساب برنگاشت و خنجر گمنامی و بے انصافی بر گردن شہرت و ناموری استاد خود راند۔ چنانچہ بعد انتخاب نسخہ مذکور در جہان مشہور گردید ازان جاکہ دیوان پر جلال صاحب بیکنٹھ باشی جد بزرگوار این ہمہ دان میدان جہل و نادانی در علم حساب و سیاق شاگرد رشید رائے اندرمن بود جناب مجد مرحوم

اصل نسخہ مرحوم را بہ نسبت و رابطہ شاگردی و حق عوض خدمت از استاد خود یافتند و سہ بار بلا امداد و اعانت دیگرے صرف بذات خود در شہر دہلی دو در مند سور (؟) در عین کم فرصتی بسیار بکار سرکار مقابلہ و تصحیح نسخہ منتخب رائے منعم علیہ با اصل مسودہ ہفتمین منشی ٹیک چند بہار نمودہ۔ عبارت معانی و لغات و اصطلاح و ابیات و نقرات استاد فرو گذاشت را۔ داخل نسخہ منقول خود نمودند حرف حرف موافق و مطابق بلکہ بہتر از نسخہ دستخطی خاص صاحب بہارِ عجم گردانیدہ جانِ تازہ در قالب کتاب انداختند و نام مرتب بہار را بعین سعی خود زندہ جاوید ساختند در شہر و دیار و قصبہ و امصار نسخہ اندرمن پیرایہ شہرت پوشیدہ بود و ایں نسخہ کہ طابق النعل بالنعل[1] نسخہ ہفتمین اوست بجز ایں خاندانِ عالیشان جائے دیگر نبود ...... الخ ...... کاتب الحروف مستہام بندہ دولت رام کا منتہ۔"

گویا یہ نسخہ مصطلحات بہارِ عجم "حرف بحرف نقل ہے مسودۂ ہفتمین صاحب بہارِ عجم کی اور اندرمن نے اپنے استاد کی گردن پر "خنجر بے انصافی" چلایا تھا اس کی ڈھال خود اندرمن کا ایک شاگرد رشید بن گیا اسے کہتے ہیں جیسے کو تیسا۔

مصطلحات بہارِ عجم کا یہ نسخہ جو نسخۂ ہفتمین بہارِ عجم کہا جا سکتا ہے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے اس طرح کہ پہلی جلد میں ۸۱۰ صفحات اور حرف "ر" پر ختم ہوئی ہے اور دوسری جلد میں صفحات ہیں اور حرف "ی" پر ختم ہوئی ہے تاریخ طباعت ۲ جنوری ۱۸۵۴ء مطابق ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ ہے ۔۔۔ کتاب پر مصنف اصلی نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ختم تحریر پر مصنف کی عمر ۳۵ سال کی تھی اور بیس سال کی محنت سے اس نے ترمیم و توسیع کے بعد کتاب کا ساتواں مسودہ تیار کیا تھا اس کتاب کے اتمام کی تاریخ اس نے "یادگار رفیقِ حقیر بہار" سے نکالی ہے۔ جس کے اعداد ۱۱۵۲ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر ریو اور ڈاکٹر اتیھے کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کی نشان دہی عبد المقتدر صاحب کیٹلاگر کتابخانہ بانکی پور نے بھی کی ہے۔

کتاب خانہ برٹش میوزیم اور باڈلین لائبریری میں بہارِ عجم کے جو مخطوطے پائے جاتے ہیں ان میں "یادگار رفیقِ حقیر بہار مادہ سالِ تاریخ اتمام است" کے فقرے میں لفظ "مادہ" پر غلطی سے دو نقطوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور کیٹلاگر صاحبان نے اس عبارت کو اس طرح پڑھا ہے کہ "یادگار رفیقِ حقیر بہار تادہ سال۔ تاریخ اتمام است"، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یادگار رفیقِ حقیر بہار کے اعداد میں دس سال اور بڑھائے جائیں تو اصل کتاب کا صحیح سن تالیف حاصل ہو یعنی ۱۱۵۲ کی جگہ تادہ سال کی شرط پوری کر کے ۱۱۶۲ھ کو کتاب کی تالیف کے اتمام کی سال سمجھنا چاہیے۔ لیکن آج جو ں کہ مصطلحات بہارِ عجم" شایع ہو چکی ہے اور دیباچہ میں تادہ سال نہیں بلکہ "یادگار رفیقِ حقیر بہار مادہ سال تاریخ اتمام است" کے الفاظ واضح طور پر موجود ہیں اس لیے اب اس مغالطے کا کوئی امکان نہیں میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ مادہ پر تشدید کی موجودگی کو ان کیٹلاگرس نے حرف تا کے نقطے سمجھ لیا ہوگا اور "مادہ تاریخ سال اتمام است" کی عبارت "تادہ تاریخ سال اتمام است" پڑھی گئی ہوگی۔

ٹیک چند بہار کا ذکر اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا۔ ہونے کو یہ نام میر کے نکات الشعرا مرتبہ ۱۱۶۵ھ۔ سید شیخ علی الرمزی المعروف بہ گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویان مرتبہ ۱۱۶۶ھ قائم کے تذکرہ مخزن نکات مرتبہ ۱۱۶۸ھ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ چمنستانِ شعرا مرتبہ ۱۱۸۵ھ گلزار ابراہیم مرتبہ ۱۱۹۸ھ اور مصحفی کے تذکرہ ہندی گویان مرتبہ ۱۲۰۹ھ میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان تذکروں میں نکات الشعرا تذکرہ ریختہ گویان اور مخزن نکات سے علی العموم اور گردیزی سے علی الخصوص بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

میر اور قائم تو خیر نہ پورے واقعات بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں نہ اپنی حسب مطلب باتوں کے علاوہ کسی کے متعلق ضروری تفصیل میں جاتے ہیں غیر ضروری کا تو ذکر ہی کیا اور میر نے تو بعض اوقات اپنے جذبات کی رو میں غیر ضروری اور بے جا تفصیل سے داستان سرائی اور یاوہ گوئی تک سے دریغ نہیں کیا واضح رہے کہ یاوہ گوئی سے راقم الحروف کا مقصد یہ ہے کہ ایک تذکرہ کی دیانت تحریر کے لیے جو حدود مقرر کیے جا سکتے ہیں ان کی خلاف ورزی کی جائے لیکن گردیزی کے تذکرے سے شکایت کی وجہ بڑی معقول ہے کیونکہ وہ اپنے تذکرے کے دیباچہ میں اس تذکرہ کا سبب تحریر ہی یہ بیان کرتا ہے کہ حالات شعرا میں کمی اور خامی دیکھ کر اسے قلم اٹھانے کی ہمت ہوئی۔ یہ دیکھ کر توقع بندھتی ہے کہ گردیزی کے تذکرے میں ضروری معلومات کا اضافہ ملے گا۔ مگر ہماری مایوسی کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ گردیزی

---

[1] طابق النعل بالنعل۔ (جس طرح ایک جوتی دوسری ...... پر رکھی جائے۔ یعنی نقل مطابق اصل۔ (راز)

نے بھی اس عہد کی مروجہ ڈگر سے ہٹ کر کسی شاعر کے متعلق کہیں ایسی معلومات فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس کے لیے آسان تھیں اور آنے والوں کے لیے بے حد قیمتی۔

بہار کے سلسلے میں ہی اس کی تفصیل سن لیجئے۔ نکات الشعراء صفحہ ۱۳۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "با فقیر ہم آشنا است" لیکن اس "ہم آشنا است" کا مرتبہ عالیہ عطا کرنے کے باوجود میر نے نہ اپنے اس "آشنا" کی عمر لکھی نہ اس کا سن پیدائش نہ حسب و نسب نہ وطن۔ گویا ساتھ کھا کے ذات پوچھنے کی کیا ضرورت تھی بس صیغہ "آشنائی" کا اظہار کافی تھا۔ گردیزی کا معاملہ اس سے زیادہ گرفت کے لائق ہے کیوں کہ وہ لکھتا ہے (صفحہ ۲۱) ٹیک چند بہار بفقیر اخلاص می دارد و اکثر ہا ملاقات می پردازد" خلوص ملاقات کا یہ تذکرہ گردیزی کو بہار کے کمالات کے ذکر پر مجبور کر دیتا ہے یہاں تک کہ "در تحقیق لغت ہائے فارسی و موقع استعمال آن کتاب ضخیم مسمی بہ بہار عجم" تالیف نمودہ اور پھر کہتا ہے کہ ایسا باکمال شخص بہت کم نظر سے گزرا ہے "باین کمال کم بنظر در آمد" لیکن اس کے بعد وہ اپنے ملاقاتی اور یار باخلاص کے متعلق سال پیدائش، موجودہ عمر، اور حسب و نسب یہ تمام باتیں گول کر جاتا ہے جیسے ان باتوں کا بتانا اپنے یار باخلاص کی " بارگاہ مودت پناہ" میں جرم کرنے کے مترادف ہو معلوم ہوتا ہے کہ قائم کے تذکرے مخزن نکات کی تحریر یا تکمیل تک یعنی ۱۱۶۸ھ سے پہلے بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ کیوں کہ مخزن نکات صفحہ ۲۵ پر اس نے لکھا ہے کہ "از زرگر بود" لیکن صحیح تاریخ انتقال قائم نے لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ صحیح تاریخ کا معلوم کرنا اس کے لیے دشوار نہ تھا کیونکہ ۱۱۶۶ھ تک تو بہار زندہ ہی تھے ان ہی درمیانی دو سالوں کے اندر اندر ان کا انتقال ہوا ہوگا اور دو سال کے اندر اندر کی بات صحیح طور پر معلوم کر لینا کیا دشوار رہے۔ لیکن کسی "زرگر" کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت جبکہ وہ اچھے اچھے سپہ زادوں کے لیے بھی اتنی زحمت نہیں اٹھاتا۔ اور پھر لطف یہ کہ "یہ زرگر پسر" کی بات بھی سنی سنائی اور کسی یار دوست کی ہوائی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بعد کی اطلاع ہے "گلزار ابراہیم" اور تواتر کے ساتھ کہ ٹیک چند بہار کھتری تھے۔

غرض بہار کے خود نوشت حالات (جس قدر بھی ممکن ہیں) کتاب کے خاتمۃ الطبع، اور دیگر تذکروں سے آج جو اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ ان حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ کہ بہار تھے تو ضرور۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں اور کئی کتابیں ان کی پائی جاتی ہیں اس لیے شکسپیئر کی طرح بہار کوئی ایسی ہستی موہوم نہیں ہو سکتے جس کے ہونے میں شبہ کیا جا سکے ذات کے لحاظ سے وہ کھتری تھے اور دہلی مرحوم کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بہار عجم پر انھوں نے بیس سال صرف کیے۔ سات بار اس کتاب کے مسودہ پر کاٹ چھانٹ اور قطع و برید کرتے رہے جسے مصنفین اور مؤلفین کی اصطلاح میں ترمیم و تنسیخ اور اصلاح کہتے ہیں۔ آٹھویں بار وہ ضعف پیری کی بنا پر مسودہ کتاب کو صاف نہ کر سکے اور مسودہ ہفتمین اور دوسری دستخطی تالیفات کو بطور یادگار اپنے شاگرد اندرمن کے سپرد کر گئے۔ اور یہی مسودہ ہفتمین آج "مصطلحات بہار عجم" کے نام سے "موبہو" ہمارے سامنے موجود ہے۔ پہلا نولکشور المعادر ۱۲۷۲ھ میں دہلی سے اور جواہر الحروف ۱۳۲۲ھ میں کانپور سے شایع ہو چکی ہیں۔ انیس نگر نے گلزار ابراہیم کے حوالے سے ان کے سفر ایران کے بارے میں بھی لکھا ہے ممکن ہے کہ بہار نے ایران کا یہ سفر بہار عجم میں ترمیم اور اضافوں کی غرض سے کیا ہو اگر اس حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا تو کتاب اور وقیع ہو جاتی فی الحال تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بہار عجم کے ماخذ دن میں حزیں کا کلام۔ سراج اللغت۔ ملخصات برہان قاطع اور ابوالحسن فراہانی کی شرح قصائد انوری ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بہار "غریب شہر" اپنے "دشنائے گفتنی" میں بہار کی فارسی دانی کا معترف نہیں کیونکہ جو شخص حزیں کا معترف ہو اور برہان قاطع پر "قاطع برہان" لکھے

حضرات [illegible] بہار عجم کو کب خاطر میں لانے لگا تھا۔ چنانچہ حریان غالب (معاصر [illegible]) میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے:-

[illegible] ایرانی جوان کے زمانے میں وارد [illegible] صاحب نے ایک خط میں جہاں ہندوستانی فارسی گویوں کی نسبت کی [illegible] تفصیل [illegible] آرزو، قتیل اور شیدا اور بہار [illegible] ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی [illegible] واقف [illegible] قتیل [illegible] تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے [illegible] اعتراض جاتا ہے

(محمد ہندی صفحہ ۱۴۲) "وارستہ نے اپنی مصطلحات میں داور اس کا ثبوت موجود نہیں کہ وارستہ کی کوئی اور کتاب غالب کی نظر سے گزری تھی) آرزو کو کہیں سراج المحققین صفحہ ۲۹۵ اور کہیں سراج المدققین صفحہ ۲۲۲ لکھا ہے اور ان کے اشعار کی سند دینے میں تامل نہیں کیا صفحات ۲۵ و ۶۵ وغیرہ آرزو بہار وارستہ کے جو اعتراضات ہیں ان کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں صفحات ۲۱ و ۹۵ و ۲۳۵ و ۲۹۵ و ۳۹۷ — آرزو نے ہزار ہا الفاظ سے بحث کی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ داعیہ کے کل اعتراض بجا ہیں جب بھی ان کا مرتبہ کم نہیں ہوتا ہاں اغلاط بہت زیادہ نکلیں تو اور بات ہے غالب نے ایک خط میں ایک محاورے کی بحث میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک کلام اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں - جائز نہ جانئے مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا) محمد ہندی صفحہ ۱۳۳ — قاطع برہان میں غالب نے ایک حکایت بھی لکھی ہے کہ برسات کی اندھیری رات تھی ۔ مینہ برس رہا تھا ہوا تیز چل رہی تھی کہ آرزو نے ایک مصرعہ کہا ہے کشاں جرعہ کا بُرکلاہ بیا کلہ (حقا کہ اگر گویند کہ ایں زمزمہ از فغانیست یا از نظیری کسے است کہ باور نہ کند ؟) اور پیشِ مصرعہ یہ سوجھا تند یہ شور و سیہ مست زکہسار آمدہ اسی وقت مرزا مظہر کے پاس گئے مطلع سنایا اور داد لی ۔ مطلع شہر میں مشہور ہوا اور ایک سوداگر نے جو شیراز سے تازہ تازہ آیا تھا اسے سنا ۔ آرزو ایک مطلع سنانے لگے پہلا مصرعہ ان کی زبان سے نکلا تھا کہ سوداگر خوب ہنسا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ دوسرے مصرعہ میں کیا کہیں گے ۔ آرزو کو ناگوار ہوا بولے بتلایئے میں کیا کہوں گا جواب دیا "خواہی گفت کہ خرمن آمد" آرزو نے زہر خند کیا اور اپنا مصرعہ پڑھا ۔ سوداگر نے دوسرے مصرعہ کی تعریف کی اور پہلے کے بارے میں کہا کہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا —— "قطرہ افشاں بسوئے شہر زکہسار آمد ۔ غالب اپنی رائے دیتے ہیں ۔ با آنکہ میرزائے شیرازی سخنور ۔ د لیکن لطف طبع ما میرم کہ تندی و پرسوزی و سیہ مستی کہ میان ابر و خرمن مشترک است نہ پسندید و مصرعے مذکورہ از مصرعۂ استاد دلفریب تر و جو شتر و بدیہہ گفت " صاحب موید برہان کے اس خیال سے مجھے (قاضی صاحب کو) اتفاق ہے کہ آرزو کا مصرعہ بہ مراتب بہتر ہے اور اعتراض لغو انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ حکایت اختراعی ہے ۔ غالب نے تیغ تیز میں اس کا جواب نہیں دیا قاطع برہان کے علاوہ یہ حکایت اور کہیں نہیں ملتی اور اس میں شک نہیں کہ بالکل بے بنیاد ہے ۔ معاصر نمبر ا صفحہ ۵۲ و ۱۵۲)

حزیں کے ساتھ جو سلوک آرزو، بہار، وارستہ نے کیا تھا غالب اس کے متعلق اپنی اسی کتاب میں رقمطراز ہیں حاشا کہ بعد از صائب و کلیم چوں حزیں دیگرے از خاک پاک ایران برخاستہ با شدی بالیست مقدم اور اگرامی داشتن و سخنش بر ورق دل نگاشتن عزا صعف تعلق پارسی از دے فرامی گرفتند ز نگار رشک اما آئینہ دانش نبودی ارشاد دہے می زدودند .... (معاصر نمبر ا صفحہ ۱۵۴)

ظاہر ہے کہ ان خیالات کے ہوتے ہوئے اور حزیں کو اتنا بلند مرتبہ سمجھتے ہوئے غالب کے خیالات آرزو کے متعلق کیا ہوں گے بہر حال وہ بہار کی لغت دانی میں شک رکھتے ہیں اور اس شک کی تفصیل تو آگے آئے گی لیکن اس موقع پر ہم کو خود بہار سے بھی ایک شکایت ہے اور وہ شکایت پڑھتے دیباچہ لکھنے والوں میں عام ہے اس لئے نہ صرف بہار سے بلکہ اس عہد کے تمام مصنفوں سے یہ شکایت ہو سکتی ہے شکایت یہ ہے کہ دیباچہ میں جہاں تک حمد و نعت کا تعلق رہتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کا دریائے زخار ہے جو ایک بحرِ ناپیدا کنار کی طرح مصنف یا مؤلف کے قلم سے اُمڈا اچلا آتا ہے لیکن جہاں سے حمد و نعت ختم ہوتی ہے اور "می گوید فقیر حقیر ہیچمدان کج مج بیاں محرر ایں داستاں" کی منزل شروع ہوتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے یہاں تک مؤلف یا مصنف نے جس قلم سے لکھا تھا اس کا قلمدان بھولے سے کھلے آسمان کے نیچے کھلا ہوا رکھا رہ گیا اور رات بھر قلمدان میں رکھے ہوئے قلموں پر اوس پڑتی رہی ۔ نتیجہ ظاہر ہے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ مصنف یا مؤلف دوبارہ لکھنے بیٹھا تو قلمدان کے سب قلم "شبنم زدہ" ہو چکے تھے ان ٹھٹھرے ہوئے قلموں کے ہوش خود ہی بجا نہ تھے کوئی ڈھنگ کی بات مصنف یا مؤلف کے بارے میں کیا لکھتے ۔ اظہار خاکساری اور ناظرین سے استدعائے عیب پوشی کے سوا ان قلموں سے اور کیا لکھا جاتا ۔ بہار نے بھی سبب تالیف لکھتے ہوئے اتنا بتا دیا کہ لوگ دوسروں کے نوشتوں کو دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ :-

"این ترکیب درست نیست و این عبارت خلاف محاورہ است و این لفظ باین معنی مستعمل نشدہ"

گویا عوام کے بے ادبر اس قسم کے دوسرے اعتراضات سن کر بہار کو ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جو ان سب باتوں کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکے۔ لیکن بہار کون تھے۔ وہ کب پیدا ہوئے۔ ان کا مبلغ علم کیا تھا اور کب ان کا انتقال ہوا۔ آج ہم ان سوالوں کا جواب بیان کردہ حالات کی روشنی اپنے اندازوں سے ہی دے سکتے ہیں، سنیے:

۱۱۵۲ھ یعنی تکملہ بہار عجم کے وقت مولف کی عمر خود اس کے بیان کے مطابق ۵۲ سال کی تھی اس لیے یقین ہے کہ وہ ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور یہی خان آرزو کی پیدائش کا سال ہے۔ گو بہار اور وہ ایک ہی سال کی پیدائش ہیں۔ اس کے بعد میر اور گردیزی کی شہادت ہے کہ "با فقیر ہم آشنا است و اکثر با ملاقات می پردو" اس کے معنی ہیں کہ ۱۱۶۵ھ تک وہ زندہ تھے اس کے بعد قائم ۱۱۶۸ھ میں کہتا ہے کہ "درگذشت" اس کے یہ معنی ہیں کہ ۱۱۶۸ھ میں بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگر اس انتقال کو دو چار مہینے گذرے ہوتے اور قائم کے مخزن نکات لکھتے وقت بات تازہ ہوتی تو وہ ضرور ظاہر کر دیتا۔ ان تمام اندازوں سے میرا قیاس ہے کہ ہم آسانی سے ۱۱۶۷ھ کو ان کے انتقال کے لیے موزوں سمجھ سکتے ہیں۔

یہ بات کہ اتنی ضخیم کتاب میں لغات کی تشریح اور ان کے بیان میں انھوں نے حتی الوسع عربی الفاظ سے گریز کی اس بات کی ضمانت ہے کہ ان میں کتب متداولہ اور علوم مروجہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ بہار کی کتابیں نوادر المصادر ۱۲۷۲ھ میں اور جواہر الحروف ۱۲۷۰ھ میں کانپور سے شائع ہو چکی ہیں مگر اب شاید ان کی موجودگی کا کھوج "بے ستون" کو کاٹنے سے کم نہیں اسپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ بہار کا انتقال گلزار ابراہیم کی تالیف سے پہلے ہو چکا تھا اور گلزار کی تالیف ۱۱۹۶ھ کی بات ہے ظاہر ہے کہ ۱۱۹۶ھ اور ۱۱۶۵ھ میں ۳۱ برس کا فرق ہے۔

کتاب خانہ بانکی پور میں نوادر المصادر کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

کتاب خانہ رام پور میں بہار عجم کے مخطوطے کی دوسری جلد موجود ہے۔ مخطوطے کا جو نسخہ کتاب خانہ رام پور میں ہے اسے میں دوسری جلد اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ مطبوعہ جلدوں کی تقسیم اس مخطوطے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں سوائے اس کے کہ مخطوطے کے پہلے صفحہ پر "حرف ر" کے بھی دو چار لفظ آگئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک چند بہار نے کتاب کی ضخیم دیکھ کر دو جلدوں میں تقسیم کیا تھا اور تقسیم یہی رکھی تھی کہ حرف "ر" تک پہلی جلد اس کے بعد دوسری جلد مگر اس تقسیم کی پابندی صحیح صحیح نہ ہو سکی اور مخطوطے کی دوسری جلد میں "حرف ر" کے بھی کئی لفظ آگئے۔

میں سالہا میں کسی جگہ لکھ آیا ہوں کہ غالب بہار سے آزردہ معلوم ہوتے ہیں یہ آزردگی درحقیقت ایک اصولی اختلاف سے پیدا ہوئی ہے جو غالب اور خان آرزو اور ان کے متبعین میں پایا جاتا ہے خان آرزو اور ان کے متبعین کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو فارسی کو جاننے کی حد تک جانتا ہے اس زبان پر اہل زبان کی طرح مساوی حق رکھتا ہے اور غالب کا عقیدہ یہ تھا کہ جو لفظ ایرانی فصحا کے یہاں جو معنے رکھتا ہے اس معنے کے علاوہ دوسرے معنی میں اسے لکھنا اور اس کے استعمال کی اجازت دینا غلط ہے۔ اس عقیدے کی غالب نے جس شد و مد سے پیروی کی ہے وہ برہان قاطع پر قاطع برہان لکھنے اور اس کے مضامین سے ظاہر ہے ہر چند غالب نے اپنے خطوط میں کھل کر تو بہار کا نام ایک جگہ کے علاوہ کہیں نہیں لیا۔ مگر صاحب غیاث اللغات کو وہ کھل کر کہتے ہیں اور کئی جگہ (ملاحظہ ہو ادبی خطوط غالب) لیکن ٹیک چند بہار کا نام انھوں نے خلد آشیاں نواب کلب علی خاں خلف الرشید فردوس مکان نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط میں لیا ہے فرماتے ہیں:۔

"بیان نوجامع فرہنگ۔ جہانگیری۔ شیخ رشید اقم فرہنگ رشیدی مطلائے عجم میں سے نہیں ہندی کا مولد ماخذ ان کا اشعار قدما۔ ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ۔ ہندی بھی اور ہندو بھی۔

فقیر اشعار قدما کا معتقد ان لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات ان کے کلام میں ان کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں، میں ان کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں" (مکاتیب غالب صفحہ ۶۱)

ظاہر ہے کہ آج کے علمائے لسانیات کے نزدیک یہ نظریہ تنگ دلانہ ہے بہرحال اس نظریہ کی بنا پر غالب ہمارے ٹیک چند سے ناراض نظر آتے ہیں۔ بہار کے مخطوطے پر میرے بزرگ محترم مولانا عرشی نے جو شناختی کارڈ لکھا ہے اس سے بھی اور اس مخطوطے پر جو حاشیے ہیں بیشتر ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حاشیے

خان آرزو کے تحریر کردہ ہیں۔ کیوں کہ ان میں کئی جگہ دیسا آپ دیکھیں گے، حاشیہ فقیر آرزو می گوید سے شروع ہوتا ہے لیکن مصطلحات بہارِ عجم کے شناختی کارڈ پر محترم موصوف یہیں ایک دوسری بات بتاتے ہیں :

" آغا محمد حسین صاحب کشمیری کے پاس بہارِ عجم کے اصل نسخے کی دوسری جلد محفوظ ہے، اس میں جا بجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے بجز ایک دو کے سب کے سب اپنے مواقع پر نقل کر دیئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر خان آرزو کے نوٹ ہیں جو انھوں نے بہار کے مسودے پر لکھے تھے۔ آغا صاحب کے نسخے کے کاتب نے انھیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے موجودہ نسخوں میں ان کے حواشی کے پیش نظر ترمیم و تغیر نظر آتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بہار نے خان آرزو کے اکثر اعتراضوں کو قبول کر لیا ہے۔"

(امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ یکم اگست ۱۹۴۵ء)

میرے سامنے اس وقت بہارِ عجم کے مخطوطے کی وہ جلد ہے جسے میں بوجوہ بالا دوسری جلد کہتا ہوں اور مصطلحات بہارِ عجم مطبوعہ کی دوسری جلد بھی۔ میں "حرف ز" سے ابتدا کر رہا ہوں۔ میں اس مخطوطے پر خان آرزو کے حواشی کا مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کر کے یہ بھی بتاتا جاؤں گا کہ ٹھیک چند بہار نے کس کس اعتراض کو قبول کر کے متن میں داخل کر لیا ہے۔ یا در صورت قبول کیا تغیر و تبدل کیا۔ (باقی آئندہ)

# خُدا
# ایک لسانی تحقیقی جائزہ

سیّد قدرت نقوی

کائنات کا نظام حرکت پر قایم ہے۔ اسی لیے ذرّہ ذرّہ محو گردش ہے۔ اسی گردش کے نتیجہ میں چیزیں عدم سے وجود میں آتی، اور وجود سے عدم کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ وجود سے عدم تک کا فاصلہ طے کرنے میں یہ اشیاء عروج و زوال کے مراحل طے کرتی رہتی ہیں۔ ان ہی عمل تہذیب و تزئین ہوتا رہتا ہے۔ عمل تعلیم سے تہذیب و ارتقا اور عمل تنقیل سے وسعتِ اثر و رواج عامہ کی منازل طے ہوتی رہتی ہیں ایک چیز کسی مقام پر وجود پاتی ہے عمل تعلیم و تنقیل سے منازل ارتقار کہیں اور طے کرتی ہے اور اثر و رواج کا حلقہ کہیں اور قایم ہوتا ہے۔ یہ فطرت کا فیضان عام ہے۔

نسل انسانی کی تاریخ ارتقا سے پتہ چلتا ہے کہ مدنیت کا رجحان طبعی، ارتقا کا سبب تحقیقی ہے۔ ورنہ یہ بھی حیوانات ارضی کی مانند ہی رہتا۔ مدنیت کا رجحان حیات انسانی کی بدلتی ہوئی اقدار کے سبب پیدا ہوا۔ موسم کے تغیرات سے پناہ لینے کے لیے، دھوپ کی تپش بارش کے سیل، ہواؤں کے جھکڑوں سے بچاؤ کے لیے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسان کی ابتدائی تعلیم گاہ فطرت تھی۔ درختوں، جانوروں، پرندوں کے ذریعہ بہت سی باتیں حاصل ہوئیں مدنیت کے ابتدائی تصور میں جانوروں کے اعمال کا مطالعہ و مشاہدہ راہنما بنا۔ انسان کا اپنا تجربہ بھی ارتقار میں ممد معاون بنتا گیا۔ مدنیت کے اصول رسم و رواج، حرکت و عمل کے نتائج زوال و ارتقا کے شکار ہوتے رہے، اور آج ہم ترقی کی موجودہ منزل پر اسلاف کے تجربوں اور کوششوں ہی کی بدولت پہنچے ہیں۔ ہماری حیات بھی حرکت پر مبنی ہے۔ اس لیے ہماری حیات کی اقدار بھی متحرک، متغیر، متبدل اور نمو پذیر ہیں۔ ترقی و تنزل کے اسباب حقیقی بھی یہی ہیں۔ اگر اقدار حیات میں سے کوئی قدر ان مراحل سے دوچار نہیں تو وہ خود بخود اپنا وجود ختم کرکے آغوش عدم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتی ہے۔

مدنیت نے انسانی تقسیم کار کی بدولت طبقات پیدا کیے اور ضروریات حیات نے گروہ قبائل بنائے۔ یہ گروہ تلاش معاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف کوچ کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان مراحل حیات میں تجربوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان تجربات کے اظہار کے لیے ذرائع تلاش کرنے پڑے، اس طرح نئے نئے الفاظ وجود میں آنے لگے ساتھ ضروریات و نتائجِ تجربات کے اظہار کے لیے جو الفاظ تھے وہ رفتہ رفتہ ذہنِ انسانی سے یا تو ختم ہوتے چلے گئے یا نیا مفہوم اختیار کرکے مروج رہے۔ جیسے "خلیفہ" ابتدا میں جانشین رسول اکرم کے لیے استعمال ہوا۔ پھر اسلام کی مرکزی سلطنت کے حکمراں کے لیے استعمال ہونے لگا، اور بادشاہ شہنشاہ کا مترادف قرار پایا۔ یہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ زوال کا زمانہ آیا تو ابتدا میں استاد یا پیر کے نائب و جانشین کے لیے استعمال ہوتے ہوتے مطلق استاد کے معنی میں رائج ہو گیا۔ یہاں تک عزت، وقار، احترام کا کوئی نہ کوئی پہلو باقی رہا آخری منزل میں پہنچا تو کسی زندہ پیر کے کارندے، محصل اور کسی پیر کے مقبرہ کے مجاور کو خلیفہ کہا جانے لگا اور اسی کے ساتھ ساتھ حجام بھی خلیفہ کے لقب سے ملقب ہوئے اب ہر نائی خلیفہ بن گیا۔ حضرت ابوبکر کی اولاد میں سے جن کا سلسلۂ نسب حضرت محمد ابن ابی بکر سے شروع ہوتا ہے ان میں سے بعض افراد اپنے نام کے ساتھ بھی لفظ "خلیفہ" لکھتے اور کہلواتے ہیں۔ یہ اس کی نوعیت بالکل "قاضی" کی مانند ہے۔ یہ خاندانی نام ہے، صفاتی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس لفظ کی آخری حیثیت کہ کارندہ محصل مجاور اور حجام کے لیے استعمال ہوتا ہے ابھی تک باقی ہے لیکن یہ بھی رو بہ زوال ہے اور مستقبل قریب میں ان طبقوں سے بھی معدوم ہو جائے گا۔ اور صرف تاریخ تک محدود ہو کر رہ جائے گا یا اگر احیا ہوا تو مفہوم نوے کر رائج ہوگا یہ اس کی حیات کا نیا دور ہوگا یہ لفظ لغوی حیثیت کے علاوہ ان معنوی ادوار سے گزرا ہے۔ (۱) جانشین رسولؐ (۲) بادشاہ، شہنشاہ (۳) جانشین پیر و استاد (۵) پیر کا محصل، کارندہ۔ مقبرہ کا مجاور اور حجام۔ اس آخری

دور کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔

اس لفظ کی منازل عروج و زوال سے معلوم ہوا کہ الفاظ تغیر کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ان تغیری مراحل میں معنوی حیثیت کے علاوہ صوری ہیئت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بعض کی املائی اور لہجائی شکل ایسی بدل جاتی ہے کہ اپنی اصل سے اسے کوئی مناسبت ہی نہیں رہتی۔ بعض کے تبدل کی درمیانی اشکال باقی رہ جاتی ہیں اور بعض کی بالکل نابود ہو جاتی ہیں مثلاً "بہرام" (نام بادشاہ ایران) اصل میں "وِرِتْرغن" تھا یہ نام قدیم ایرانیوں میں بارش کے دیوتا کا نام تھا جو اپنے گرز سے بادلوں کو ہنکاتا اور بارش کرتا ہے۔ سنسکرت میں اس کا نام "ورترہان" تھا فارسی میں ورثرغن کی ثقافت دور ہو کر "ورہران" بنا اور ساسانیوں کے زمانے میں "وہران" "بہرام" "وبرام" بن کر بہرام کی شکل میں مروج ہوا اور اب تک ہے۔ لفظ خدا بھی اسی طرح تغیر و تبدل عروج و ارتقا کا شکار ہوا ہے۔ اس کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو مقصود ہے۔

خدا: یہ لفظ تقریباً آٹھ ہزار سال سے زبان زد خاص و عام ہے۔ حسب ذیل معنی میں سب متفق ہیں: (۱) اللہ، ذات واجب الوجود (۲) مالک، آقا، صاحب، حاکم، بادشاہ۔ یہ لفظ بحالت مفرد بجز ذات باری تعالیٰ اور کسی کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ بحالت مرکب کسی اسم کے ساتھ بحالت مضاف معنی ۲ میں استعمال ہوتا ہے جیسے کدخدا، ناخدا وغیرہ۔

جس لغت نویس نے ان معنی اور تشریح سے آگے قدم بڑھایا اس نے ٹھوکر کھائی۔ یعنی اس مفرد لفظ کو مرکب بتانے اور اجزائے ترکیبی کی تلاش میں ان حضرات کے قیاس نے لغزش کی ہے اس دور حاضر سے پہلے کے تمام قدیم لغات نویس اور ان کے متبعین نے اس لفظ کو مرکب قرار دیا کہ یہ لفظ خدا مرکب ہے۔ خود + آ (امر از آمدن) سے جس کے معنی ہیں خود آنے والا۔ صاحب غیاث اللغات نے اس ترکیب کو بحوالہ خان آرزو صاحب سراج اللغات علامہ دوانی اور علامہ فخرالدین رازی سے منسوب کیا ہے۔ صاحب فرہنگ نظام نے صاف صاف تو مرکب نہیں لکھا لیکن ان کے بیان سے مرکب ہوتا مترشح ہے وہ لکھتے ہیں:

"در عصر اوستائی ذات واجب الوجود را بغ (ب - ۹) وآہورہ (۱) ومزدہ (6 - 99) میگفتند و در عصر ساسانی آہورمزدہ و خدای (خوتای) (۳) و در فارسی اسلامی علاوہ بر الٰہ عربی خدای پہلوی ہم استعمال شد۔ ریشۂ لفظ خدا در اوستا (۳ - ۲) است یعنی بخودی خود (واجب الوجود) کہ خلق و دیگری نیست و در سنسکریت سوتہ (स्वत) بہمان معنی است سو (स्व) کہ یک حرف مرکب در سنسکریت است در اسناد فارسی بہ حرف خ تبدیل شود" (فرہنگ نظام ج ۲ صفحہ ۵۴۸)

ان دونوں بیانات پر بحث کرنے سے پیشتر ایک اور جدید تحقیق ملاحظہ فرمائیے یہ بیان بہت طویل ہے اسمیں مندرج امور کو ہم بالترتیب مختصراً پیش کرتے ہیں اس مضمون میں "خدا" کو سہ لفظی مرکب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ خلاصہ یہ ہے:

(ا) "خود" اور "خدا" کا ماخذ ایک ہے اور دونوں میں "خو" بمعنی فطرت، حقیقت، عادت، جبلت اور خصلت شامل ہے۔ سنسکرت میں اس کا مثیل یا ہم قبیل لفظ "سو" (स्व) ہے جس کے معنی خود، آپ اور روح ہیں "سو" پر "تس" اضافہ ہوا اور "سوتس" یا "سوتہ" بنا جس کے معنی خود بخود یا آپ سے آپ ہے۔ فارسی میں "خوت" تھا جس نے "خود" کی شکل اختیار کی لہذا "خود" اور "سوتہ" جس طرح یکساں ہیں اسی طرح "خو" اور "سو" بھی ہیں۔ "سوتہ" مرکب ہے سو + تہ سے اسی طرح "خود" مرکب ہے خو + د سے۔

(ب) خدا کی قدیم شکل "خودای" (پاژند)۔ قدیم تر "خوتای" (پہلوی اشکانی) "خوتاذ" (پہلوی ساسانی)، اور قدیم ترین "خودھائی" (قدیم فارسی)، "خوذای" (اوستائی) ہے۔ ارتقائی ترتیب یہ ہے: خودھای، خوتای، خودای، خدای، خدا۔ مگر "ت" کا تبادل "د" سے مسلم ہے "خوتای" کا "خودای" ہو سکتا ہے۔ "خودھای" کے "دھ" کا تبادل "ت" سے خلاف اصول ہے۔ اس لیے سہل بات یہ ہے کہ "خوتای" کو "خودھای" سے ماخوذ خیال کیا جائے۔ اور "دھ" کا تخفیف پا کر "د" ہو جانا قبول کیا جائے۔

(ج) فارسی "خود" اور سنسکرت "سوتہ" یکساں ہیں جو مرکب ہیں۔ خو + د اور سو + تہ سے "خدا": خود، سو + کسی اور دوسرے کلمے سے مرکب۔ ڈاکٹر

بلیشس یہ دوسرا کلمہ "ذات" فارسی اور "دھات" سنسکرت بتاتے ہیں پس خود، خوت + دات دخوتودات۔ اور سوتہ + دھات، سوتہ دھات یعنی وہ ہستی جو اپنی ذات سے زندہ اور پائندہ ہو۔

(د) صاحب فرہنگ نظام نے صحیح لکھا ہے کہ خدا کا اوستائی مادہ "خوتو" اور سنسکرت "سوتہ" ہے جس کے معنی واجب الوجود بخودی خود ہیں، لیکن خوتو خدا کا ایک جزو ہے دوسرا جزو "دات" ہے "خوتودات" اولاً "خوتاد" (بحذف "دو" تبدیل "ت" با "د") ہوا اس کے بعد "خوتای" (بحذف "د") ہوا یا خوتودات، خودای (بحذف "ت") ہوا اور پھر "خدای" سے "خدا" ہو گیا۔

(ﮦ) مسٹر وان نولدیکے، "خوتای" پہلوی کو سنسکرت "سوتہ + آی (عمر) سے ماخوذ بتاتے ہیں بمعنی اپنی ذات سے زندہ۔

(و) "خوتای" بمعنی حاکم، مالک، قادر (بادشاہ) مستعمل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل (اہرمزد) کے لئے استعمال ہوا۔ قدیم فارسی میں بھی بمعنی اللہ استعمال ہوا ہے، کتاب گجستک اباش (پہلوی) میں ہے۔ "لخوار ول لوین اوہرمزد خوتای مدرو ند" (باز پیش اہرمز و خدا بر ند) البتہ جدید فارسی اور اردو میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگر ان توجیہات و قیاسات کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ قدیم الایام سے چند تراکیب، اردو و فارسی میں مستعمل ہیں جن میں لفظ خدا بمعنی مالک استعمال ہوا ہے جیسے، کدخدا، دہ خدا، ناخدا وغیرہ پس ان معنی کے لیے کیا وجہ جواز ہوگی۔ اگر اللہ کی صفت، مالکیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بطور مجاز، یہ معنی تصور کیے جائیں تو خدائی نامہ بمعنی شاہنامہ موجود ہے جس میں "خدا" بمعنی بادشاہ ہے اس کی کیا توجیہ ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ قدیم فارسی میں بھی مالک، آقا بادشاہ اور بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) استعمال ہوا ہے، بمعنی اللہ نہیں ہے۔ مندرجہ بالا آرا، بوجوہ ذیل قابل قبول نہیں ہیں۔

اجزائے ترکیبی "خود + آ"، خدا بمعنی خود آنے والا، ذات واجب الوجود، خلاف قاعدہ ہیں جن کا عہد قدیم میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ قیاس کی لغزش ہے۔ "سو" سنسکرت فارسی "خ" سے تبدیل ہو سکتا ہے لیکن فارسی میں "ختو" نہیں ہے "خوتای" ہے۔ فارسی میں "و" کا تبادل "الف" سے ثابت نہیں ہے۔ خوتای کے معنی واجب الوجود، بخودی خود، قدیم فارسی میں نہیں ہیں بلکہ بادشاہ وغیرہ ہیں۔ مزید بحث آگے ہوگی کیوں کہ طویل بیان کے سلسلہ میں یہ باتیں بھی زیر بحث آجائیں گی اس بیان کے خلاصہ کی ترتیب کے مطابق امور مذکورہ پر غور کرتے ہیں۔

(ا) خود اور خدا کا ماخذ "خو" بمعنی فطرت و عادت قرار دینا قیاس مع الفارق ہے کیوں کہ "خو" بمعنی فطرت و عادت ابتدا میں "خیم" تھا پہلوی زبان کی کتابوں کے یہ نام دلیل ہیں۔ "اپژیم و خرد فرخ مرت" (در خوی و خرد مرد فرخ) "اوابادینخ خیم ہوسرواں" (در پنج خوی خسرواں) ان کے علاوہ "دژخیم" بمعنی بدخو، بد خصلت فارسی میں استعمال موجود ہے۔ پس خو جس کی ابتدائی شکل خیم ہے خود محتاج تحقیق ہے۔ خیم کی "م" ندر ساقط ہوئی اور "ی" کا تبادل "و" سے ہو کر خو بنا، خیم دور پہلوی تک تھا اس کے بعد خو کی شکل اختیار کرتا ہے پس قدیم فارسی میں خو تھا ہی نہیں تو یہ خدا اور خود کی اصل کیسے بن سکتا ہے۔ نیز خدا کی ابتدائی شکل "خوتای" میں جو "خو" ہے وہ اوستا کا ایک سفر دحرف (سے) ہے اور تلفظ میں واو معدولہ ہے حالانکہ "خو" بمعنی عادت میں واو معروف ہے۔ پس اس سے خود بنانا اور پھر خدا کا ماخذ قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ اگر خود میں اس "خو" کو اصل قرار دیں تو پھر خویش، خوش، خواب، خواہش، خوب، خور، خواہر میں بھی اس کو اصل قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ ایسا ممکن نہیں۔ خود کے معنی آپ اور اس کے ہم قبیل یا مثیل سنسکرت سوتہ کے معنی، خود بخود، آپ سے میں مطابقت کیوں کر ہو سکتی ہے۔

(ب) خدا کی قدیم ترین شکل "خودای" نہیں بلکہ "خوتای" ہے۔ فارسی باستان کا کوئی مخطوطہ نہیں جس میں اس کا سراغ مل سکے۔ چند سکوں اور کتبوں کے علاوہ فارسی قدیم کے آثار ناپید ہیں سکوں میں لاحقہ دات ملتا ہے۔ وہ یا دھات کا وجود نہیں جیسے "بغ دات" سپند دات" "مہرداتا" وغیرہ اس کے معنی عطیہ ہے۔ بغ دات، خداداد ہے۔ عہد ہخامنشی کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں "بغ" بمعنی پروردگار عالم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خوتای، خودای، خودھای نہیں ہے، فارسی قدیم، اوستا، پہلوی، ساسانی اور پہلوی اشکانی میں ذات الٰہی کے لئے بغ، اہرمزد، اہورامزدا، ایزتان، یزداں، یزد استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس معنی میں خوتای، خودای، خودھای کا وجود ہی نہیں ہے۔ خوتای بمعنی بادشاہ و بادشاہ بزرگ عہد قدیم (پہلوی) سے مستعمل ہے۔ خوتاذ بھی پہلوی اشکانی میں نہیں ہے بلکہ خوتای خوذای ہے۔ اس ضمن میں جو سہل طریقہ استعمال کیا گیا ہے اس سے زیادہ سہل طریقہ تو خود + آ یعنی خود آنے والا، اپنی ذات سے وجود میں آنے والا واجب الوجود ہے۔ ارتقائی ترتیب بھی غلط ہے۔ البتہ خوتای، خوذای، خذای، خدای، خدا ارتقائی ترتیب ہے۔

(ج) خود = خو + ت یا دا اور سوتہ = سو + تس یا تہ ، کے معنی "آپ سے یا خود بخود" معین کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کو خدا کی اصل قرار دینے کے لیے ایک اور کلمہ "دات" فارسی اور "دھات" سنسکرت کا اضافہ کرکے، خدا تک سلسلہ پہنچایا گیا ہے اور معنی اپنی ذات سے پائندہ یا زندہ کیے گئے ہیں۔ پس خو + یاد + دات میں "خو" کے معنی فطرت عادت یاد : "داد" کے معنی میں خلقت، اور دات کے معنی خلقت و عطیہ ہیں جیسے "ہن دستش" بمعنی اصل خلقت، اور "بغ دات" بمعنی عطیہ الٰہی ہے اگر ان لاحقوں کے ۔ الف خو بمعنی عادت و فطرت تسلیم کرکے معنی متعین کیے جائیں تو خلقت و عطیہ فطرت معنی بنتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے واجب الوجود کا مفہوم متعین نہیں ہو سکتا کیونکہ فطرت خود تخلیق میں خالق کی محتاج ہے۔ پھر اختلاف تلفظ خدا، خِدا، خُو دا، خدا کی حالت میں "خو" بمعنی فطرت سے کیسے مطابقت ہوگی؟

(د) صاحب فرہنگ نظام نے "خوتو" نہیں بلکہ "ختو" لکھا ہے جس کو انھوں نے پہلوی رسم الخط میں بھی "ختو" ہی ظاہر کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک "سو" (Sva) سنسکرت، فارسی "خ" سے بدل جاتا ہے۔ "خو" سے نہیں۔ نیز مؤلف فرہنگ نظام "ختو" کے معنی بخودی خود بتلاتے ہیں اور اس بیان میں "خوتو" پر دات لاحقہ کا اضافہ اور کیا گیا ہے۔ اگر ان کے معنی کیے جائیں تو لفظ مہمل بن جاتا ہے کیوں کہ فارسی میں دات = داد بمعنی عطیہ ہے جس کی مثالیں کافی ہیں لہٰذا "ختو" = بخودی خود ا "ختو دات" = عطیۂ بخودی خود یعنی چہ؟ سنسکرت سے ہر قدیم لفظ کی تطبیق ناممکن ہے۔

(ک) سوتہ + آ ی = خوت + آ ی یعنی اپنی ذات سے زندہ کی نظیر فارسی میں نہیں ملتی۔ خود + آ کی ترکیب اس سے زیادہ قرین قیاس ہو سکتی ہے حالانکہ وہ بھی غلط ہے۔

(ق) خدا، قدیم فارسی میں، مالک، آقا، بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے خالق کل کے معنی میں نہیں۔ اور ہرمزد خوتای میں "خوتای" کے معنی آقا یا بادشاہ ہی کے کیے بمعنی واجب الوجود نہیں، اور ہرمزد خوتای یعنی اورمزد آقا یا بادشاہ عہد ساسانی سے پہلے بمعنی اللہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ جبکہ اس طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے معنی واجب الوجود ہی ہیں قدیم ایرانیوں میں اللہ کے لیے واجب الوجود کا تصور ہی غیر محقق ہے تو اس کے لیے یہ لفظ بنانا یا بننا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ آخر میں خود بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اوستا اور پہلوی اشکانی میں بمعنی مالک و بادشاہ تھا اور یہ دونوں دور ساسانیوں سے مقدم ہیں۔ پس منطقی طور پہ استدلال ہی غلط ہے کہ لفظ اصل کے لحاظ سے ابتدا میں اپنے معنی میں مطابقت نہ رکھے، یہ بات بداہتہً غلط ہے کیوں کہ لفظ کی تخلیق ہی معنی کے پیش نظر ہوتی ہے۔ اگر یہ لفظ واجب الوجود یا بخودی خود کے پیش نظر وجود میں آتا تو ابتدا ہی میں یہی معنی مروج ہوتے تبدیلی بعد میں واقع ہوتی۔ پس جبکہ ابتدا میں یہ معنی ثابت نہیں تو ان معنی کا قیاس کرنا ہی غلط ہے اور اجزائے ترکیبی تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ معنی ہی کی صحت سے ترکیبی اجزا کی صحت ثابت ہو سکتی ہے۔ ابتدا میں بادشاہ، مالک، آقا کے معنی میں استعمال ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہی معنی کے لیے یہ لفظ وضع ہوا اور ان معنی سے مرکب کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ قدیم فارسی میں ذات الٰہی کے لیے کون کون سے لفظ استعمال ہوتے تھے، خدا کب سے مستعمل ہے، معنی کیا تھے، املائی اور ہجائی اشکال کیا کیا تھیں، ان امور کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فارسی قدیم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے، بَغ، مَزْدَ، اَہُورامَزْدَہ، یزتان، یزدان اور یزد، الفاظ ملتے ہیں بغ بادشاہ آئڑ کے کتبہ سارگون میں ایک ایرانی کے نام (بغ دات) کے جز کی شکل میں ملتا ہے۔ کتبۂ داریوش میں "بغ یدِ یش" خدا کی ستائش کے مہینہ کا نام ملتا ہے۔ دیگر کتبوں اور اوستا میں بھی بغ بمعنی خدا آیا ہے "بغ دات" اور "بغ کرت" دو بادشاہوں کے نام ہیں۔ "انور خوربہ بغ" یعنی آتش جلالت ایزدی ایک آتشکدہ کا نام ہے۔ ساسانی بادشاہوں کے زمانہ کے سکوں میں بھی بغ بمعنی خدا پایا جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد اس لفظ کی حالت بدلتی ہے تدریجاً زوال ہوتا ہے اور بجز چند مرکبات بالکل زبان سے نابود ہو جاتا ہے۔ کتبۂ شاہ پور ساسانی میں بھی یہ لفظ موجود ہے:

"مَزْدَیَسْن بغی شہپوہری شہان شہی ایران و انیران کی چیتر ہچ یزدان" یعنی خدا پرست خدایگان شہپور شہنشاہ ایران و غیر ایران جس کا خاندان خدا سے پیوستہ ہے۔

ساسانی سکوں پر یہ عبارت کندہ ہے جس میں مزدا، بغ، یزدان بمعنی خدا آئے ہیں "مزدیسنی بغی شہپوہری ملکان ملکا، ایران منوشتر من یزدان" یعنی خدا پرست خدایگان شاہ پور شہنشاہ ایران، جس کا خاندان خدا سے تعلق رکھتا ہے۔

خط میخی مادی میں خط میخی آشوری برچھ عاملستوں کا اضافہ ہوا ان میں دو علامتیں "اہرمزدا" اور "بغا" بھی ہیں جن کے معنی خدا اور خدا بزرگ ہیں ان دونوں لفظوں کے متعلق ملک الشعرا بہار لکھتے ہیں: "در عہد ہخامنشی و تا چند قرن بعد بغ نام پروردگار عالم بودہ است" اور "اہورمزد در اصل اہورا

مزدہ بمعنی خداوند بزرگ بودہ است و مطلق "مزد" بمعنی خدا استعمال ہوتا ہے۔ "مزدیسن" مرکب ہے مزد بمعنی خدا اور یسن بمعنی عبادت کرنیوالا خدا پرست۔ تغیر کی تدریجی ہوتا ہوا "اہورمزدہ" اسم ذات الٰہی سے بادشاہ کا نام بن گیا۔ اہورمزدہ، اومزدہ، اہرمزد، ہرمزد تغیری اشکال ہیں "یزتان" بمعنی خدا کتیبۂ اردشیر بابکان میں پایا جاتا ہے "ارتخشتری ملکان ملکا اریان منوشہرمن یزتان" (اردشیر شاہان شاہ ایران دارندۂ نژاد از خدایان) تک تبادل ہ سے ہوکر یزدان بنا اسی طرح "ایزد" یزد ہو گیا۔ "بزدکرت" یزدگرد ہے۔

خدا، دراصل "خوتای" تھا جس کے معنی بادشاہ، سردار، فرماں روا، مالک اور آقا ہیں، پہلوی زبان میں انہی معنی میں استعمال ہوا ہے اس کی املائی اشکال، خوتای، خوذای، خودای، خذای، خدای اور خدا ہیں۔ کارنامۂ اردشیر بابکان میں یہ عبارت ہے:

"لیس پیج مرگ الکسندری اود لیک ایران شترو ۲۴۰ کتک خوتای بوذ" (سکندر رومی کے مرنیکے بعد ایران میں ۲۴۰ کدخدا (سردار یا فرماں روا) تھے اسی طرح "چیزک سندریچ فرجود کیشان" میں ہے "فریو پانیہ ای کاد ہرمزد پت ہستیہ ہاک بوذیہ دانشک خوتائیہ" (راست اعتقادی یہ ہے کہ اہرمزد (اللہ) کی ہستی دائم و بادشاہی جاوید ہے) اسی طرح "شترو ہای ایران" میں لکھا ہے "انیک گجستک سکندر سوہت و اندرو دریا پفکند نیکرتی ہپت خدایان" (پس سکندر ملعون نے دینکرت ہفت خدا کو جلا کر دریا میں ڈالدیا) ہفت خدا یعنی سات بادشاہ۔ اصلاح کتب سنت پہلوی میں "ہفت خدایان" (سات بادشاہ) جم، فریدوں، منوچہر، کاؤس، کیخسرو، لہراسپ اور گشتاسپ ہیں۔ اور سہ خدائیہ: سہ خدا سے مراد اردشیر پسر اسفندیار، دارا اور دارای داریان ہیں امرا اشکانیوں کو ملطفا کنک خوتای دکدخدا کہتے تھے نہ کہ خوتای: خدا بمعنی بادشاہ بزرگ سالہ اندرہ آئین نامہ نویسی کی اس عبارت میں یزدان بمعنی اللہ اور خدا بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے "مزاز زرتشت سپتیمان ..... اپتر کرہ گوہر، پذیرہ ہتک اندر یزدان، آفریکانام اندر خدایان" (پاک جان زرتشت کے لیے تعظیم ہے...... خاصکر اس کا قبیلہ دخاندان خدا کے نزدیک مقبول اور بادشاہوں کے نزدیک صاحب عزت ہے)

پہلوی میں خوتای نامک یہ شاہنامہ اور "ایتجان کتک خدای" بر بیچان کدخدای، کتابوں کے نام ہیں۔ خوتای نامک کا ذکر جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبین میں بھی کیا ہے۔ اس کی حقیقت ملک الشعرا بہار نے جو بیان کی ہے دہ بہر طرح قابل غور ہے: "خوتای براہ معدولہ یعنی خدا کہ در قدیم بمعنی بادشاہ صاحب بودہ و بعد از اسلام تطور یافتہ معنی اہورمزد را بخود گرفت، (خوتاینامک) خدانیامہ بمانست کہ شاہنامہ شدہ"[1]

لفظ خداوند خواجہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"این ہر دو لغت (خواجہ و خداوند) ظاہرا در فارسی دری بعد از اسلام از لغت خوتای پہلوی کہ بمعنی صاحب و آقا و مدیر و گاہی ہم لقب فرشتگان چوں خدای ددیند خدای وغیرہ بودہ بود ساختہ شد، چہ خدای را در اسلام بجای اللہ در رب عربی گزاشتند بجائے شاہ و صاحب و آقا خداوند را با ضمیمہ وند کہ از ادات تشبیہ یا نسبت است ساختند کہ از ہماں ریشہ ولی عین آں نباشد"[2]

مندرجہ ذیل بیانات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آخری بیان سے تلفظ اور املا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"خدا کہ نام پادشاہ بود بعد از اسلام مختص ذات باری تعالیٰ قرار گرفت با آنکہ مشتقات آں چو خانہ خدای، کتخدای دہ خدای وکشور خدای وغیرہ بحال خود باقی ماند و معنی اصلی را کہ صاحب باشد محفوظ داشت"[3]

"خدای را کہ ما بروزن شما ادا مینمائیم در زمان فردوسی "خُوَذَای" بواو معدولہ بزبان میآوردہ اند"...... بختیاریان، خار مفتوح و طبرستانیان، خار مکسور و سائرین خار مضموم ادا سازند چوں، خُوَدا، خَدا، خِدا، خُدا"[4]

پس نتیجہ یہ نکلا کہ خوتای، خوذای، خدای، خدای سے خدا ہوا ہے اس کے معنی، بادشاہ، صاحب، مالک، اور آقا تھے۔ وہ خدا و کدخدا اور ناخدا میں بمعنی مالک اور خدائینامہ میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے۔ دیہ ند خدا، زروان کا لقب ہے جو فرشتۂ دہر (زمان و مکان) ہے اس میں

[1] سبک شناسی ص۴۲ ج ا، [2] ایضاً ص۱۸۳، [3] ایضاً ص۲۶۷، [4] ایضاً ص۱۹۳

بھی خدا کے معنی مالک یا صاحب کے ہیں ذیرند خدا: مالک دہر، صاحب زمان و مکان۔ عروج اسلام اور بالخصوص رواج تصوف کے بعد اس لفظ کو بمعنی اللہ، ذات واجب الوجود استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ قیاس کہ یہ مرکب ہے اور قدیم سے اللہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، غلط ہے۔ اوہرمزد کے ساتھ خدا کا استعمال بمعنی بادشاہ ہے۔ جبکہ پہلوی سے پہلے اس کا وجود ثابت نہیں ہے تو فارسی قدیم میں کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلوی میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے تو معنی بخودی خود یا واجب الوجود کیسے ہو سکتے ہیں۔ قدیم آثار بصورت مرکب بمعنی صاحب و مالک فرمانروا تا حال پائے جاتے ہیں جیسے دہ خدا دکھیا، نمبردار) کشور خدا (فرمانروا ملک) کدخدا (صاحب خانہ) ناخدا (ناؤ کا مالک) وغیرہ بمعنی حاکم فرماں روا طبری نے چند القاب لکھے ہیں جیسے وردان خداہ، بخارا خداہ وغیرہ یعنی فرمانروائے وردان اور بخارا۔ طبری دور اول کا مورخ ہے اس لئے یہ القاب براہ راست پہلوی کتب، خوتای نامک وغیرہ سے اخذ کیے گئے۔

لسانیات میں اس اصول سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ لفظ مادہ کے لحاظ سے جس معنی پر دلالت کرتا ہے ابتدا میں وہی معنی مروج ہوتے ہیں اضافی یا مجازی معنی بعد میں رائج ہوتے ہیں جو تغیر و تحول کے زیر اثر مراد لیے جاتے ہیں مثلاً "گلستان" بلحاظ ساخت (اجزائے ترکیبی) گلاب کے تختے یا پھولوں کے قطعے کے معنی رکھتا ہے ابتدا میں اسی معنی میں مستعمل ہوا ہوگا مجازاً باغ کے لیے بھی استعمال کیے گئے یہ ناممکن ہے کہ بلحاظ ساخت نہ گلاب یا پھولوں کے تختے کے لیے مخصوص ہے مگر ابتدا ہی میں باغ کے لیے استعمال کر لئے گئے اور دو چار صد یاں گزرنے کے بعد ہوش آیا کہ باغ کے لیے استعمال غلط ہے یہ تو تختہ گل کے معنی رکھتا ہے۔ خدا جبکہ قدیم فارسی، اوستا اور پہلوی اشکانی وساسانی میں اللہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا تو بلحاظ ساخت، دبلحاظ مادہ اس کے یہ معنی کس طرح ثابت ہو سکتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کی معنویت مطابقت معنی کی موجودگی ہی میں ثابت کی جا سکتی ہے حالانکہ لفظ خدا بمعنی اللہ ذات واجب الوجود فارسی میں عہد اسلام میں استعمال کیا گیا ورنہ پہلے بمعنی بادشاہ مالک وغیرہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ اجزائے ترکیبی کی حیثیت قیاسی موشگافی سے زیادہ نہیں ہے۔ مجمت نزدیک خدا مفرد ہے ابتدا میں اس کے معنی، بادشاہ اور مالک تھے اسلام کی اشاعت کے بعد بمعنی اللہ استعمال ہونے لگا۔

# مآثر الامرا کی تاریخی فروگذاشت

سید نقی احمد ارشاد

مولانا امتیاز علی خاں عرشی وقائع عالم شاہی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حصول اقتدار کے لئے ان طاقتوں (مرہٹے۔ روہیلے، سکھ اور انگریز) نے جو ہیم کوشش کی اس کی رودادتاریخ کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ مگر ان کے مصنف کسی نہ کسی ایسی سرکار کے متوسل تھے جو فریق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ان تصانیف کا دامن جانب داری سے بالکل پاک نہ رہ سکا۔ اس عہد کی مختلف تاریخوں کو پڑھئے اور پھر کسی ایک واقعہ کے اسباب وعلل متعین کرنے کی کوشش کیجئے بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بغیر کڑی کتہ چینی کئے آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے"

یہ ریمارک بالکل صحیح ہے اور اس اعتبار سے تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ خود مورخ کے کردار اخلاق اور تعلقات کا بھی جاننا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ آج تک یہی مشہور ہے کہ مآثر الامرا نے نہایت غیر جانبداری سے واقعات کو چھان بین کے پیش کیا مگر جب میں نے غور سے دوسری تاریخوں کے حوالے سے مطالعہ کرنا شروع کیا تو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ صرف امرائے اکبری جہانگیری و شاہجہانی کے حالات مستند تاریخوں سے جمع کئے گئے ہیں اور ان میں خامیاں نہیں ہیں مگر عہد اورنگ زیب کے بعد سے جن امرا کا حال بیان کیا گیا ہے ان میں صاف صاف جانبداری کی جھلک پائی جاتی ہے۔

مآثر الامرا بظاہر میر عبدالرزاق خاں (شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) کی تالیف ہے مگر ان کی شہادت ۱۱۷۱ ہجری کے بعد ان کے صاحبزادے میر عبدالحی نے اس تاریخ میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ خود میر عبدالحی تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد شاہ نواز خاں سے کیا۔

"ہرزے محرر ایں کلمات ظاہر نمود کہ نسخہ خوبے تہیہ یافتہ۔ اگر اتمام می پذیرفت۔ آں بزرگ بسند بال آورد کہ تو تمام خواہی کرد"

چند سطروں کے بعد "چوں راقم مامور ازفرمودۂ آں بزرگ بجا طرمی خلید ہموارہ بخیال آں سرگرمی داشت۔ تا آنکہ درسال ۱۱۸۲ ہجری شروع نمود۔ احوال تحفۂ مردم (از کتاب تاریخ فراہم آوردہ انضمام داد و تمہیدے (کہ والا مرحوم در ابتدا خود نوشتہ و محرر بر بیاضے نقل گرفتہ بود) عبد و تمہیدے از آزاد (نوشتہ) یا جہار ترجمہ (کہ آں ہم رقوم قلم میر آزاد است) نیز ثبت فرمود" شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ ہجری میں عالم قید میں قتل کر دیئے گئے۔ چنانچہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مذکور نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

رفت صمصام الدولہ زجہاں سوم ماہ شریف رمضان

سال ایں واقعہ آں سید خورد گفت ماگشتہ عبدالرحمان

عبدالرحمان مبنی سے مراد حیدر جنگ جو پانڈیچری کے فرانسیسیوں کا پروردہ آدمی نمک خوار تھا۔ میر عبدالحی (شمس الدولہ دلاور جنگ) خلف شاہ نواز خاں نے تاریخ اتمام مآثر الامرا۔ یوں پیش کی ہے ؎

دبیر عقل رقم کرد سال اتمامش زہے ادیب مصاحب مآثر الامرا

گویا شاہ نواز خاں کی موت ۱۱۷۱ھ کے ۲۳ برس بعد یہ کتاب تمام کی گئی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ میر جعفر کے بعد میر قاسم پھر میر جعفر کی دوبارہ مسند نشینی ۱۱۷۷ھ نجم الدولہ خلف میر جعفر اور سیف الدولہ تک کے حالات میرزا محمد ی (علی وردی خاں مہابت جنگ) کے حالات کے ساتھ درج ہیں۔ میر جعفر سے لے کر سیف الدولہ ناظم بنگال کے حالات شاہ نواز خاں کی وفات کے بعد کے ہیں۔ اس وقت تاریخ بنگالہ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لئے محض سنی سنائی باتوں سے کام لیا گیا ہے۔

غلام علی آزاد اپنے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"ترجمۂ قطب الملک عبداللہ خاں وزیر اعظم محمد فرخ سیر بادشاہ (کہ مصنف علیہ الرحمۃ نظم داشتہ بود) بہ معرض تلف در آمد و ترجمۂ امیر الامرا سید حسین علی خاں برادر قطب الملک از اول ناقص بدست افتاد۔ و ترجمۂ نواب آصف جاہ و خلف او نواب نظام الدولہ شہید مصنف علیہ الرحمۃ خود بہ تحریر در نیاورد و تنگی روزگار فرصت نہ داد۔ جلالت شان ایں ہر چہار امیر آفتاب نظیر ظاہر۔ اتفاقاً فقیر تراجم اربعہ را در تالیف خود سر آزاد باسمِ رقم پوشانیدہ ....."

خلاصہ یہ کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان چار امرا کے حال کا اضافہ کر دیا ہے۔ اتنی طویل عبارت سے مطلب یہ نکلا کہ در حقیقت مآثر الامرا تین اشخاص کی تالیف ہے۔ اول شاہ نواز خاں جنھوں نے ۱۱۷۱ھ کے بہت پہلے یعنی ۱۱۵۵ھ ــ ۱۱۶۰ھ کے درمیان اس کتاب کو لکھا۔ اس پانچ برس میں جب وہ صاحب نواب آصف جاہ اول تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں بعد رحلت آصف جاہ اول ان کے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ ریاست دکن پر بحال ہوئے اور شاہ نواز خاں اپنے قدیم آقا صرفی آور سرپرست سے وابستہ ہو گئے۔ مآثر الامرا کی تالیف بند ہو گئی یہاں تک کہ ۱۱۷۱ھ میں جیسا عرض کیا گیا وہ قتل کر دیئے گئے۔ میر عبدالحی قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند تھے وہ ۱۱۷۲ھ میں حراست سے باہر کیئے گئے اور ۱۱۸۲ھ میں مآثر الامرا کی از سرِ نو ترتیب و تدوین شروع کی گئی یہاں تک کہ ۱۱۹۴ھ میں غلام علی آزاد نے تتمہ و مقدمہ اور حالات کے ساتھ اس کتاب کو مکمل کیا۔ جو مزید اضافہ حالات سے خود ظاہر ہے۔

چونکہ یہ کتاب دکن (اورنگ آباد) میں تالیف و تصنیف کی گئی اور اس کے مؤلفین و مرتبین کا تعلق ریاست حیدر آباد سے رہا، اس لئے امرائے عہد شاہی و احمد شاہی میں بعض ایرانی جماعت کے امرا کا ذکر بالقصد نہایت رکیک الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نظام آصف جاہ اول کا تعلق تورانی پارٹی سے تھا جو ایرانی پارٹی کی حریف سیاست تھی۔ یہ پارٹی محمد شاہ میں زور دار رہی۔ انہیں دونوں کی سیاسی بازیگری نے حکومت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ مورخ کے کردار کا بھی جاننا ضروری ہے اور بغیر اس کے اس کی تصنیف یا تالیف پر پوری روشنی نہیں پڑ سکتی ہے اس لئے مختصراً شاہ نواز خاں کا حال درج ذیل ہے۔

شاہ نواز خاں کا اصلی نام میر عبدالرزاق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد خواف کے سادات تھے۔ ان کے جد اعلیٰ کمال الدین عہد اکبری میں خواف سے ہندوستان آئے۔ شاہ نواز خاں کے دادا میر کاظم خاں ملتان کے دیوان تھے۔ شاہ نواز خاں کے والد کا نام میر حسن علی تھا۔ یہ خاندان اورنگ آباد دکن میں رہتا تھا۔ شاہ نواز خاں کی پیدائش ۱۱۱۱ ہجری میں لاہور میں ہوئی چونکہ ان کے اقربا اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ یہ اورنگ آباد لائے گئے۔

پہلے انھوں نے نظام آصف جاہ اول کی ملازمت اختیار کی۔ ناصر جنگ خلف نظام آصف جاہ کے دربار میں رسوخ پیدا کیا اور صوبہ برار کے دیوان مقرر ہوئے۔ جب ۱۱۵۰ھ میں آصف جاہ کی طلب دہلی میں قلمدان وزارت سپرد کرانے کو ہوئی تو وہ حکومت دکن اپنے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ کے حوالے کر کے دہلی روانہ ہو گئے۔ شاہ نواز خاں نے دربار ناصر جنگ میں پورا پورا رسوخ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ جب ۱۱۵۵ھ میں نظام آصف جاہ دہلی سے واپس آئے تو حکومت دکن کے لئے باپ بیٹے میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ناصر جنگ نے حکومت دکن سے اپنے باپ آصف جاہ اول کو بے دخل کرنا چاہا۔ اس جنگ میں شاہ نواز خاں ناصر جنگ کی طرف سے میدان جنگ میں موجود تھے۔ ان کا ہاتھی ناصر جنگ کے ہاتھی کی پشت پر تھا۔

"نواب صمصام الدولہ ردیف نواب نظام الدولہ بود" اس سے یہ مطلب تھے ایک تو یہ کہ ناصر جنگ سمجھے کہ یہ میرے ساتھ ہیں۔ دوم ناصر جنگ کی پشت پر رہنے سے آصف جاہ کی آنکھیں ان پر نہ پڑیں سوم باپ بیٹے کی لڑائی میں جب بیٹے کی وجہ سے جان جانے کا خوف نہ رہے۔ چنانچہ جب اس معرکہ میں ناصر جنگ کو شکست ہوئی اور میدان جنگ سے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو عین میدان جنگ میں حافظ اللہ خاں پسر سعد اللہ خاں (وزیر شاہجہاں) نے از راہ خندگی شاہ نواز خاں سے پوچھا۔

"نظام الدولہ (ناصر جنگ) اینجا نزد پدر می رود۔ شما کجا می روید"

ناصر جنگ تو اپنے باپ کے گھر جاتا ہے تم کہاں جاؤ گے۔ اس طنز سے شاہ نواز خاں کے کردار پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ جب ۱۱۵۵ھ میں وہ معاتب آصف جاہ

ہوئے تو تو کتاب "ماثرالامرا" کی تصنیف شروع کی یہاں تک کہ ۱۱۷۰ھ میں یہ کام بند ہو گیا۔ آصف جاہ و نظام الدولہ کا حال کیوں چھوڑ دیا جیسا کہ غلام علی آزاد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ نظام الدولہ کے عہد میں وہ مختلف عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے صلابت جنگ کے زمانے میں یعنی ۱۱۶۷ھ میں شاہ نواز خاں کو ہفت ہزاری کے منصب کے علاوہ صمصام الدولہ کا خطاب بھی حکومت نظام سے ملا اور ان کا ستارہ اقبال چمکا۔ وہ وکیل حکومت دکن مقرر ہوئے ۱۱۶۹ھ میں جب بالاجی راؤ نے ساونور کے افاغنہ سردار پر حملہ کیا تو شاہ نواز خاں نے افاغنہ کے خلاف بالاجی راؤ کی پوری پوری مدد کی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی حکومت پانڈی چری کا اقتدار دربار نظام پر بڑھ رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا بڑا مؤید خود ان کا پروردہ عبدالرحمن (مخاطب بہ حیدر جنگ) تھا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ شاہ نواز خاں گرفتار کئے گئے ان کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور آخر جب نظام آصف جاہ دوم نے حیدر جنگ کو اپنے ساتھ دھوکے سے بلوا کے ذبح کرادیا تو حیدر جنگ کے ذبح ہونے کے چند گھنٹوں کے اندر فرانسیسیوں کے ملازم لچھمن نامی ایک ہندو نے قیدخانے کے اندر شاہ نواز خاں کا معہ ان کے دو صاحب زادوں کے تلوار سے کام تمام کر دیا۔ غلام علی آزاد نے کئی موثر تاریخی رباعیاں کہی ہیں۔

آزاد کی تحریر تنگ نفسی روزگار فرصت نہ داد" سے تشفی نہیں ہوتی ہے۔ شاہ نواز خاں نے نظام آصف جاہ اول اور نظام الدولہ خلف آصف جاہ کا حال غالباً اس لئے چھوڑ دیا ہوگا کہ خود اس میں ان کی تضحیک مضمر تھی جیسا کہ میں نے حمد اللہ کی کہی ہوئی عبارت میں پیش کر دیا "نظام الدولہ بجانب پدر ہی رد دشنا کجا می رود"۔

**ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ** جہاں جہاں اس کتاب میں امرائے ایرانی النسل (جن کا تعلق بہادر شاہ اول یا محمد شاہ سے تھا) کا ذکر آیا ہے تضحیک سے خالی نہیں ہے کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھدی ہے جو تاریخ کے خلاف ہو یا اگر جو باتیں تاریخ کے خلاف نہیں ہیں انھیں اس طرح توڑ موڑ کے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس امیر جلیل الشان کے خلاف سراسر ہو گئی ہیں اور اس کے ہنر کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ مثلاً نصرت جنگ وزیر بہادر شاہ کے متعلق یہ تحریر ہے "گویند نصرت جنگ بدستاں سرائی و فریب طرازی رفیع الشان و جہاں شاہ را بہ تقسیم ملک راضی ساختہ با جہاندار شاہ بیعت و یکدل گردانید و از ہر سر افراز وزارت بنام خود گرفت"

تاریخ مظفری یا سیرالمتاخرین کو دیکھ جائیے کہیں بھی یہ الفاظ "دستاں سرائی و فریب طرازی" نہ ملیں گے۔ سیرالمتاخرین کے مطابق "امیرے بہ جمیع فضائل و محاسن و اوصاف حمیدہ" ہے۔ غلام حسین خاں صاحب سیرالمتاخرین کا تعلق نہ دربار دہلی سے تھا نہ حکومت دکن سے۔ آگے چل کے تحریر کرتے ہیں "چوں مردم بہ سیرت ملوک مع طوراند ذوالفقار الدولہ خاں نیز بہ اختیار سہا جند کھتری (کہ در شرارت و بدذاتی یکتا بود) کار ہا گذاشتہ بعیش و عشرت پرداخت و در مجبت جنیں شہر آہ جہاں"۔

یہ صحیح ہے کہ جہاندار شاہ مرد لا ابالی تھا۔ وہ لال کنور کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ لال کنور کی جلوہ گری تھی جب جلوس شاہی نکلا تو بھی لال کنور بادشاہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار تھی۔ مگر جو الفاظ شاہ نواز خاں نے ذوالفقار الدولہ کی شان میں استعمال کئے ہیں اس کی تصدیق کسی اور معتبر تاریخ سے نہیں ہوتی ہے۔

ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ (محمد اسمعیل) یہ آصف الدولہ اسد خاں وزیر بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا اس کی ماں مہرالنساء بیگم آصف خاں یمین الدولہ کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ۱۰۶۷ھ میں ہوئی۔ مصرعہ تاریخ ہے سہ ز برج اسد رو نمود آفتاب

اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد میں اس نے دکن میں بڑے بڑے معرکے انجام دیئے تھے مرہٹوں کو گویا نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کے خوف سے راجہ رام خلف شیواجی بھاگا پھرتا تھا۔ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد جب اس کے چاروں لڑکوں میں سلطنت کا جھگڑا شروع ہو گیا تو اس نے عظیم الشان کے خلاف تینوں بھائیوں جہاندار رفیع الشان اور جہاں شاہ کو متفق کر دیا کیونکہ عظیم الشان (بانی عظیم آباد) صاحب ثروت و دولت و صاحب اقتدار تھا عظیم الشان کی شکست ہوئی یہ واقعہ ۱۱۲۴ھ ہجری کا ہے ذوالفقار الدولہ کی پیدائش ۱۰۶۷ ہجری میں ہوئی۔ گویا ۱۱۲۴ھ میں اس کی عمر ۵۷ سال کی تھی اب اس پر بھی اگر یہ کہا جائے کہ "بہ عیش و عشرت پرداخت" تو یہ ریمارک کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے برخلاف میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کتاب میں جہاں نظام الدولہ کا حال بیان کیا ہے۔ تعریف کا دریا بہا دیا ہے۔

**نظام الدولہ ناصر جنگ** امیرے بود دیندار و کرم گستر غیور صاحب عزم صف آرائے بزم و رزم۔ احکام شریعت غرا جہد وافی می نمود و داد فریاد رسی عاجز و نالاں بے دست و پا توجہ تام می فرمود۔ در فصاحت تقریر و ادائے لطائف سخن کوس یکتائی می نواخت غرض امیر نہ ہوئے خلیفہ وقت۔ باپ کے

خلاف تلوار اٹھانا اور بغاوت کرنا شاید احکام شریعت میں داخل نہیں ہے وہ بھی ایسے باپ کے خلاف جس نے حکومت دکن بطور امانت دولت، سلطنت ایسے نازک وقت میں سپرد کر دی ہو۔

**میر میراں امیر خاں** اسی طرح امیر خاں میر میراں صوبہ دار کابل کے متعلق صفحہ ۲۹۶ ماثر الامرا مطبوعہ کلکتہ پریس میں تحریر ہے "بالجملہ امیر خاں را از صاحب جی فرزند نہ شد (چوں او بر خاں مزبور سخت غالب بود، در کمال خفا دختولیا نگاہ داشتہ اولاد بسیار بہم رسانید" مدخولہ کے معنی ہونے داشتہ حقیقت یوں ہے کہ جب صاحب جی کے بطن سے امیر خاں کو کوئی اولاد نہیں ہوئی تو صاحب جی کی مرضی سے انھوں نے دلی کے ایک معزز خاندان میں عقد ثانی کیا۔ ان منکوحہ ثانی بیوی کے بطن سے نواب امیر خاں انجام پیدا ہوئے۔ جہاں امیر خاں انجام کا ذکر کیا گیا ہے اس بات کو قطعی فراموش کر دیا گیا۔

وہ زمانہ عالمگیر اورنگ زیب کا تھا جو سلطنت کے گوشے گوشے کی خبر رکھتا تھا۔ مرشد قلی جعفر خاں ناظم بہار و بنگال دار نے ایک دفعہ اورنگ زیب کے پاس عظیم الشان (اورنگ زیب کے پوتے) کی شکایت لکھ بھیجی اس زمانے میں عظیم الشان نائب ناظم بہار تھا نعوذ عتاب شاہی نازل ہوا کہ آئندہ سے اگر ایسی شکایت پھر سنی گئی تو پابہ جولاں دہلی لایا جائے گا اور رتبہ شہزادگی کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ خط رقعات عالمگیری میں موجود ہے جس عہد میں شاہزادوں کی ایسی حالت ہو وہاں ایک سرحد کے ایسے شورش افزا صوبہ دار کی کیا مجال تھی کہ مدخولہ رکھتا وہ بھی اس صورت میں کہ صاحب جی جیسی بیوی نہ صرف صوبہ دار پر حاوی ہو بلکہ امور حکومت پر بھی۔

چونکہ صفدر جنگ نواب اودھ اور امیر خاں انجام سے عایت درجہ کی دوستی تھی اور دونوں نے مل کے درانی پارٹی کو نیچا دکھایا تھا اسی وجہ سے صاحب ماثر الامرا نے ایک غلط روایت جوڑ دی۔ امیر خاں انجام کے متعلق خود ماثر الامرا کی تحریر ملاحظہ ہو "حسب العرض ابو صفدر جنگ ناظم اودھ (کہ باینہا ہر دو تن اخلاص بسیار متحقق بود) طلب حضور شدہ بہ داروغگی توپ خانہ اختصاص گرفتہ ہر دو متفق شدہ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) را بر سر علی محمد خاں روہیلہ بردند۔ اما بسبب نفاق اعتماد الدولہ قمر الدین خاں پیش رفت نشد۔ دریں ایام بر زبان خاص و عام بود کہ وزارت بار می شود "جب ایسا تھا تو عماد الملک (نظام آصف جاہ اول کے پوتے) نے کیوں عہدہ وزارت کو قبول کیا اور صرف وزارت حاصل کرنے کے لئے دکن سے مرہٹوں کو بلایا۔ یہاں تک کہ سکندر آباد خالصہ شاہی کو بھی ہولکر کے حوالے کر دیا۔

"ہولکر آمدہ بے منازعت تمام اثاثۂ سلطنت را غارت کرد ملکہ زمانیہ (دختر فرخ سیر بادشاہ) کہ زوجہ فردوس آرام گاہ بود و دیگر پردگیان سر ادقات پادشاہی با سر در آمدند ہولکر ایشاں را بعزت نگاہ داشت" جہاں تک حرم و مستورات کا سوال ہے تاریخوں میں یہ واضح طور سے درج ہے کہ ہولکر نے انھیں دہلی لا کر خواص پورے میں رکھ دیا تھا۔ اس بات کی شاہ نواز خاں نے پردہ پوشی کی ہے یہ وہی شاہ نواز خاں ہے جنھوں نے نظام کی فوجوں کو بالاجی راؤ کی مدد کے لئے افاغنہ سانور کے خلاف بھیجا تھا۔ مرہٹے جیسی اخیر کے سلاطین مغلیہ کی حرمت کرتے تھے وہ وقائع عالم شاہی سے ظاہر ہے۔ پردہ پوشی تو درکنار، عماد الملک کے حال میں ماثر الامرا میں یہ درج ہے کہ ہولکر نے بغیر عماد الملک کی مرضی اور اطلاع کے سکندر آباد پر حملہ کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بات تاریخ کے خلاف ہے۔

اس تاریخی فروگذاشت کا احساس خود میر عبدالحی خاں کو بھی تھا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"امید از مطالعہ کنندگان ایں کتاب آنست کہ اگر سہوے یا خطائے بہ نظر آید در اصلاح کوشند و بہ نظر عیب پوش پوشند" عیب پوشی بہترین صفت ہے مگر اس صورت میں جب کسی کی تضحیک و توہین نہ کی جائے۔ میر میراں کے حال میں "مدخولہ" کا ذکر کر دیا مگر امیر خاں انجام کے حال میں اس کو واضح نہ کیا۔ اس سے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

**سعادت علی خاں برہان الملک** یہ صفدر جنگ کے حقیقی ماموں تھے اور خسر بھی۔ چنانچہ وقائع عالم شاہی میں مولانا عرشی کی تحریر ملاحظہ ہو "ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (۱۰ مارچ ۱۷۳۹ء) میں برہان الملک کا انتقال ہوا تو محمد شاہ بادشاہ نے ان کے صغیر السن بیٹے کو صوبہ دار مقرر کر کے صفدر جنگ کو بدستور نائب اور متولی امور حکومت رکھا۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ بچہ مر گیا اور یہ بالاستقلال صوبہ دار بنا دیا گیا مگر اس عہدے کے حاصل کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے کی رشوت دینا پڑی (وقائع عالم شاہی مطبوعہ رامپور صفحہ ۱۷۳)"

مآثر الامرا صفحہ ۲۶۸ مطبوعہ کلکتہ پریس ۱۸۸۵ء میں تحریر ہے "پسرے از دا (برھان الملک) نماند صبیۂ او با ابوالمنصور خاں منسوب بود۔ مآثر الامرا کے مطابق گویا برھان الملک کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جو سراسر تاریخ کے خلاف ہے۔ مآثر الامرا کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تین شخصوں کے بعد مرزا اشرف علی پروفیسر عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس میں مزید تصحیح و تالیف کردی ہے۔ گویا بجائے تین چار مؤلف ہوگئے۔

**نواب لطف اللہ خاں صادق** مآثر الامرا کی تحریر ہے "از شیخ زادہائے انصاری۔ وطنش پانی پت است۔ وقتیکہ خلد منزل عدد بار پادشاہی آمد رفت نمود از کم رتبگی بہ پایہ عمدگی رسید۔ خلد منزل سے مراد بہادر شاہ اول اتنی سی عبارت میں ابتدائے اسلام سے زوال سلطنت مغلیہ تک کی تاریخ پوشیدہ ہے بجائے شیخ زادہائے انصاری یوں بھی تحریر کیا جاسکتا تھا کہ از اولاد حضرت ایوب انصاریؓ۔ لطف اللہ خاں صادق کے دوسرے بیٹے شاکر خاں اپنی تالیف گلشن صادق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب انصاری کے صاحب زادے حضرت ابو منصور نے جناب خلیفہ ثالثؓ کے عہد میں بڑے معرکے انجام دیئے ان کا شمار اولیائے دولت اسلامیہ میں ہے انھوں نے ہرات میں اقامت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ ابو منصور کی ساتویں پشت میں شیخ الاسلام حضرت ابو اسمعیل خواجہ عبداللہ انصاری ہوئے جنھوں نے نظام الملک طوسی کے عہد میں علوم دینیات و فقہ و فقر و غنا میں کافی نام پیدا کیا تھا۔ انھوں نے جو چند کلمات نظام الملک طوسی کو بطور نصیحت کہے تھے حسب ذیل ہیں "در رعایت دین کوش و عیب مردم بپوش دین و دنیا مفروش۔ یا نظام ہر کہ وہ خصلت شعار خود سازد در دنیا و آخرت کار خود سازد ...... وغیرہ وغیرہ"

شیخ الاسلام ابو اسمعیل کی ساتویں پشت میں محمد امیر شیخ ابو اسحاق ہوئے جو بادشاہ شیراز تھے۔ ان کا زمانہ وہی تھا جو حافظ شیرازی کا چنانچہ حافظ شیرازی ایک قصیدے میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

خدایگانِ سلاطین مغرب و مشرق — خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق
سپہر علم و حیا آفتاب جاہ و جلال — جمال دنیا و دیں شاہ ابو اسحاق

ابو اسحاق کے بعد گیارہ پشتیں ایران میں گذریں۔ آخر خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے۔ غیاث الدین بلبن نے انھیں مناسب عہدہ دیا۔ عہد شاہ جہاں میں اسی خاندان کے بزرگ خواجہ عبدالرزاق کو میر عبداللہ مشکیں رقم استاد بادشاہ نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے چار ہزاری منصب عطا کیا اور کچھ دنوں کے بعد انھیں گورکھپور کی صوبہ داری پر فائز کیا۔ خواجہ عبدالرزاق نے گورکھپور کے سرکش زمینداروں کو سر کیا اور غنیم کا قلع قمع کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں "گروہ توڑ" کا خطاب ملا۔ شاہ جہاں کے عہد میں عربی کے مناسب الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا جارہا تھا چنانچہ یہ لفظ گروہ توڑ ترجمہ ہے عربی کے لفظ "ہادم القلاع" کا۔ عبدالرزاق خاں کے تین صاحب زادے دلیر دل خاں، لطف اللہ خاں صادق اور شیر افگن خاں، سب کے سب اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔

**دلیر دل خاں** عہد عالمگیر میں دیوانی دیر سالاری و بخشی گیری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ عہد محمد شاہ میں ملتان، ٹھٹھہ اور لاہور کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے "معین الدولہ دلیر جنگ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کی ایک صاحب زادی کی شادی جمیل الدین ابن لطف اللہ خاں صادق سے ہوئی تھی (گلشن صادق)

**شیر افگن خاں** عبدالرزاق خاں کے تیسرے صاحب زادے تھے۔ عہد محمد شاہ میں ہفت ہزاری کا منصب پایا۔ مالوہ، ملتان اور کڑہ الہ آباد کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے عزت الدولہ بہادر صف شکن جنگ کا خطاب بھی دیا تھا۔ مآثر الامرا کی تحریر ہے "دلیر دل خاں برادر درست کہ ہمراہ ابرار الامرا بود منصب ۳ ہزاری رسیدہ و برادر سوم او شیر افگن خاں است کہ بہ فوجداری کڑہ مصاف الہ آباد سرافراز شدہ۔ از پسرانش (لطف اللہ خاں) عنایت خاں راسخ و شاکر خاں بقدر ترقی کردند"

نواب جعفر خاں راغب نبیرہ عنایت خاں راسخ اپنی تالیف "مکاتب جعفری" (مجموعہ خطوطِ فارسی میرزا ناخر مکین) میں تحریر فرماتے ہیں "محمد جعفر خاں المتخلص براغب ابن ہدایت اللہ خاں مرحوم نبیرہ شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق و نبیرہ عزت الدولہ شیر افگن خاں" گویا شجرہ نسب یوں ہوا۔

عبدالرزاق خاں گروہ توڑ

دلیر دل — لطف اللہ خاں صادق — شیر افگن

لطف اللہ خاں صادق: عنایت خاں راسخ، ہدایت اللہ خاں — شاکر خاں

شیر افگن: دختر — ہدایت اللہ خاں

جعفر خاں راغب

جعفر خاں راغب
مہدی علی خاں

جلال الدین علی خاں تاثیر — عارفہ بیگم
تاولد — مادر شاہ عظیم آبادی

جب محمد شاہ نے قطب الملک عبید اللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں کا کھٹ پھینکنا چاہا تو شیر افگن خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا (عام مورخ عبید اللہ خاں کا نام عبد اللہ خاں لکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ قطب الملک عبید اللہ خاں کے والد کا نام عبد اللہ خاں تھا جن کے کئی صاحب زادے تھے۔ عبید اللہ خاں۔ سید حسین علی خاں، سید نجم الدین حسین خاں، سید زین الدین حسین خاں عرف میر زنیا)

کہتے ہیں کہ عین لڑائی میں جب سید نجم الدین حسین خاں کا ہاتھی شیر افگن خاں کے ہاتھی کے سامنے آیا تو شیر افگن خاں نے ایک تیر ایسا تاک کے چلایا کہ نجم الدین حسین خاں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ شیر افگن خاں نے عین حالت اضطراب میں آگے بڑھ کے اپنا ہاتھی نجم الدین خاں کے ہاتھی سے ملا دیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کی۔ سید نجم الدین حسین خاں سے ہاتھ بڑھا دیا اور شیر افگن خاں ان کے ہاتھی پر سوار ہو کے انھیں عین میدان جنگ سے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ بادشاہ کو رحم آگیا اور انھیں شیر افگن خاں کے حوالے کر دیا۔ شاکر خاں نے تفصیل سے اس واقعہ کو گلشن صادق میں لکھا ہے گلشن صادق کا قلمی نسخہ خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں شیر افگن خاں نے بعارضہ سرسام رحلت کی۔

**لطف اللہ خاں صادق** خواجہ عبد الرزاق کے منجھلے بیٹے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد معظم شاہ بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کے اتالیق تھے اور بخشی۔ اس کے بعد شہزادے کے مدار علیہ مقرر ہوئے۔ جہاں شاہ نے یہ تحریر اپنے ہاتھوں سے لکھ دی تھی: "ارادت مند صادق خیر خواہ لائق لطف اللہ خاں صادق موفق بہ توفیقات حسنہ بود۔ بداند کہ آں سعادت مند معروض طلبیدہ کہ تمسک بہ رضا مندی خود نوشتہ دادہ شود۔ بنابراں کلمہ چند نوشتہ شود۔ یا صادق الحمد کہ او مسلم صادق است"۔

چند سطروں کے بعد شاہزادے جہاں شاہ نے یہ قطعہ لکھا ہے ؎

| | |
|---|---|
| یاد روزے کہ بعد مادن تو | ہمہ خنداں شدند و تو گریاں |
| ہم چناں زی کہ بعد مردن تو | ہمہ گریاں شوند و تو خنداں |

جب بہادر شاہ اول نے اپنے بھائیوں پر فتح پائی تو وزارت کا سوال پیدا ہوا۔ وہ منعم خاں خانخاناں کو وزارت کا عہدہ دینا چاہتا تھا مگر اسد خاں آصف الدولہ (پدر ذوالفقار الدولہ) نے اپنے حقوق کو بادشاہ پر ظاہر کر دیا۔ وہ عالمگیر کے عہد میں وزیر رہ چکا تھا۔ تذبذب کے عالم میں بادشاہ نے جہاں شاہ کے مدار علیہ لطف اللہ خاں صادق سے استفسار کیا اور لطف اللہ خاں نے اسد خاں کے حق میں رائے دی۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور اس نے ان کو خان صادق کا خطاب مرحمت کیا۔ علم و نقارہ سپرد کیا۔ اسی واقعہ کو صاحب مآثر الامرا نے یوں مختصراً لکھا ہے "در لقب او کہ لفظ صادق افزودند وجہ آں زبان زد عوام است"

بہادر شاہ اول کے مرنے کے بعد حصول اقتدار کے لئے اس کے چاروں لڑکوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ کی لاش بے گور و کفن ایک ماہ تک کس میرسی میں پڑی رہی۔ عظیم الشان متمول اور صاحب اقتدار تھا۔ وہ عظیم آباد کا بانی تھا اور دہلی ہی کی طرح اس نے اپنے عہد نظامت بہار میں پٹنہ کے محلوں کے نام نقل پر دیوان محلے گذری تبو ان شکوہ وغیرہ رکھا تھا۔ ذوالفقار الدولہ نے عظیم الشان کی قوت و ثروت دیکھ کے تینوں شاہزادوں، جہاندار شاہ رفیع الشان اور جہاں شاہ کو آپس میں ملا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عظیم الشان کی شکست ہوئی۔ لطف اللہ خاں صادق اس معرکہ میں جہاں شاہ کی طرف تھے۔ مگر جب سلطنت کے تقسیم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو جہاں دار شاہ نے ٹال دیا۔ پھر دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ جہاں شاہ نے مختصر سے لشکر سے حملہ کر دیا بقول مآثر الامرا "جہاں شاہ در عین معرکہ با قلیلے از کمرگاہ خود را بر قول معز الدین زدہ متفرق ساخت حتیٰ لال کنور معشوقہ جہاندار شاہ (کہ بے او آنے بسر نمی برد) سراگندہ نشستہ بہ لاہور گریخت و جہاندار شاہ خود را بہ پناہ ہٹر دہ کشید نقاربہائے فتح جہاں شاہ بہ نوازش درآمد۔ چنانچہ بہمیں خبر در بلاد و در دست خطبہ او خواندند کہ ناگاہ تفنگے بہ جہاں شاہ رسیدہ درگذشت۔ ذوالفقار الدولہ (کہ در مراحل جنگ توپ و تفنگ استعمال داشت) مطلع شدہ، بر فوج حق تاختہ منہزم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "۔

یہ ذوالفقار خاں کے حال میں تحریر ہے مگر اس میں لطف اللہ خاں صادق کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ اس معرکہ کا لطف اللہ خاں صادق کے حال میں تذکرہ ہے۔ ارادت خاں بن کفایت خاں جو اس معرکہ میں شریک تھے تحریر کرتے ہیں۔

"دراں روز دلیر دار خاں صادق را تو دخاقت مدار علیہ حملہ کارہائے آں شاہزادہ تہور شعار بود تا رمقے از حیات شاہزادہ باقی بود بہ ایں کہ ہمراہیان برخے مقتول و مجروح برخے متفرق شدند، خان مرحوم روا از عرصہ کارزار نہ پیچید۔"

بہادر شاہ نے کچھ سمجھ کے خان صادق کا خطاب عطا کیا تھا۔ سچے دیندار مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرخ سیر کے عہد میں ایک واقعہ اور ہوا تھا جس کا ذکر مآثر الامرا اور تاریخ مظفری دونوں میں ہے۔

"قطب الملک دیوانی خالصہ بنام او (لطف اللہ خاں) تجویز نمودہ بادشاہ دیں تعلقہ بنام چھیلا رام ناگر مقرر کردہ بود۔ بدیں تقریب ابین بادشاہ و عندیہ کدورت واقع شد۔ قطب الملک گفت کہ ہر گاہ تجویز امل وزیر پذیرا شد استقلال او معلوم۔ آخر تعلقہ مزبور بنام خان مسطور بحال یافت"

یہ واقعہ صحیح ہے کہ سید علی احمد بادشاہ کے درمیان میں کدورت کا سب سے بڑا سبب فرخ سیر کی بدزبانی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھا کم سن اور ناتجربہ کار اور آداب شاہی کے خلاف حرکتیں کر جاتا تھا چنانچہ بقول صاحب سیر المتاخرین و صاحب تاریخ مظفری فرخ سیر نے دونوں بھائیوں کو بھرے دربار میں گالیاں دیں۔ تذکرۃ الاسلاف مولفہ شاہ عظیم آبادی میں دونوں تاریخوں کے حوالے سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"امیر الامرا و قطب الملک از برائے اتمام حجت چنانکہ بارہا اتفاق افتادہ بود پیش فرخ سیر رفتہ بودند۔ در جواب نصائح سودمند نواب امیر الامرا و قطب الملک را دشنام مغلظہ بر زبان راند، امیر الامرا کہ شجاعت بے نہایت و غیرت بدرجہ غایت داشت تاب نہ آوردہ خواست کہ تادیب آں دریدہ دہن بے باک کرد پاس حرمت آل اطہر سید البشر ہم روا نداشتہ بفرماید۔ اما فرخ سیر از سر پر سلطنت گریختہ پناہ در نسوان حرم خود برد"

یہ صحیح ہے کہ جھگڑے کی ابتدا دیوانی خالصہ سے ہوئی مگر فرخ سیر کی معزولی کی وجہ درحقیقت اس کی بدزبانی تھی پھر کوئی دوسری ایسی مثال نہیں ہے کہ ان دونوں نے کسی اور بادشاہ کو تخت پر بٹھا کے اتارا ہو رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ اپنی موت سے مر گئے۔ محمد شاہ نے پارٹی سے سازش کر کے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ اس کے برخلاف عماد الملک نے جو مغل بادشاہوں کے ساتھ سلوک کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ تورانی پارٹی جب برسر اقتدار آئی تو عماد الملک کے عہد وزارت میں صاحب مآثر الامرا شاہنواز خاں کو دہلی سے دکن میں ماہی مراتب بھیجے گئے۔ بقول غلام علی آزاد:

"دریں ایام سلطان دہلی عالمگیر ثانی برائے نواب صمصام الدولہ ماہی مراتب فرستاد۔ شخصے ایں مصرعہ تاریخ یافت سہ از شاہ ہند آمد ماہی و مراتب

یہ وہ زمانہ تھا جب عماد الملک بادشاہ گر بنا ہوا تھا۔ ۱۱۶۷ھ میں اس نے احمد شاہ کو نابینا کرا دیا۔ اس کو مع اس کی ماں (رحم بائی) کے قید کیا اور آخر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے عالمگیر ثانی کو قید سے باہر کر کے تخت پر شطرنج بٹھا دیا۔ شاہزادہ عالی گوہر اس کے خوف سے بھاگ نکلا اور الہ آباد و بہار میں آوارہ پھرنے لگا۔ شاہ عالم کے اس زمانے کے حالات پر میرزا فاخر مکین کے فارسی کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔

میرزا فاخر مکین کے خطوط کا مجموعہ ان کے عزیز ترین شاگرد نواب جعفر خاں راغب نے گلزار جعفری کے نام سے مرتب کیا ہے اور اس کا اصلی مسودہ راقم الحروف کے پاس اس وقت تک محفوظ ہے چونکہ اس کے خاندان کی چیز ہے۔ اس میں زیادہ تر خطوط نواب جعفر خاں راغب (لطف اللہ خاں صادق کے پرپوتے اور عنایت خاں راسخ کے پوتے) کے نام ہیں۔ ایک خط محمد علی خاں مرحوم مصنف تاریخ جعفری و محمدی برادر نسبتی نواب جعفر خاں راغب کے نام لکھا ہے۔ فاخر کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ مظفری کا خطبہ فاخر مکین کا لکھا ہوا ہے۔

"بہ تقریب ارسال مسودہ خطبہ تالیف خطے کہ نوشتہ اند محظوظ ساخت۔ الٰہی چوں پیر سایۂ بزرگان دیگاہ بہ سلامت باشند باعث غنیمت است کہ بہ خلاف نوجوانان عصر بیکاری را باشتغال کتب صرف می کنید۔ ذرہ اوقات افسوس کہ عمر با بہ غفلت برباد داریم۔ حالانکہ نزدیک پیری رسیدیم۔ چوں بجو و نظر کشادیم ہماں آخر بارینہ کہ بودیم خود را دیدیم۔ در لیغا حسرتا ؎

عمر آخر شد و ابلکارہ آدم نشدیم        گرچہ سوداست قضا ایں ہمہ سوہاں مارا

شما کہ بقصد ذکر مہ جرائید قدر عمر و جوانی بدانید ؎

جوانان رہ طاعت امروز گیر ۔۔۔ کہ فردا جوانی نہ آید ز پیر "

چند سطروں کے بعد "مسودہ دیدہ رنجیدہ مرسل شد زیادہ شوق"

"تاریخ مظفری" کا سن تصنیف ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء ہے۔ چنانچہ فاخر مکین کا یہ خط بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ جعفر خاں راغب نے جو رباعی "گلزار جعفری" کے متعلق کہی ہے حسب ذیل ہے ؎

این نسخہ کہ رنگینیٔ اتمام گرفت ۔۔۔ صد شکر بدلخواہ سرانجام گرفت
بشگفت چوں راغب این گل باغ مراد ۔۔۔ صد رنگ ولو گلشن ایام گرفت

اسی "گلزار جعفری" میں میرزا فاخر مکین نے میرزا سودا سے ۔۔۔ اپنے جھگڑے کا ذکر نپے تلے لفظوں میں کیا ہے۔ اس مختصر سے واقعہ کو صاحب آب حیات نے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔ انشاء اللہ کبھی آئندہ اس پر تفصیل سے مقالہ پیش کیا جائے گا۔ سودا کے متعلق جو فاخر مکین نے ایک طویل غزل کہی ہے وہ ایک دو سرے خط میں موجود ہے۔ میں صرف دو شعر پیش کر دیتا ہوں ؎

نہ دید از خود فروشی دشمن اجنس بہبودی ۔ بہ بازار جہاں وار دہشت سود لئے بے سودی
ندارد گر چہ غیر از آہ محرومی دم دوری ۔۔۔ براین بے مایگی جوش خریداران ملح (پڑھا نہیں گیا)

الغرض لطف اللہ خاں صادق ایسے تھے کہ ان کی اولاد دل نے ایسی ایسی نادر کتابیں "گلشن صادق" "تاریخ مظفری" "گلزار جعفری" اور کلام شاہ عظیم آبادی چھوڑی ہیں۔ جب احمد شاہ کے عہد میں تورانی پارٹی برسر اقتدار آئی تو لطف اللہ خاں صادق نے عہدہ خان سامانی اور منصب ہفت ہزاری کو ترک کیا اور خانہ نشیں ہو گئے۔ ان کے صاحب زادے عنایت خاں راسخ نے بھی یہی کیا اور سہ ہزاری کے منصب کو ترک کیا۔

خان صادق نے ۱۱۵۵ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں اپنی حویلی جو دلی میں کشمیری دروازے کے متصل تھی قضا کی۔ حسب وصیت نعش پٹنہ لائی گئی۔ قطعہ تاریخ رحلت یہ ہے ؎

خان صادق کہ بجز چند امیران زماں ۔۔۔ بہتر از جملہ بہ توقیر دامانت آمد
بے سر وسف گبرو (فقرۂ رحلت او ۔۔۔ نائب سلطنت ہند بہ جنت آمد
۱۱۵۵ھ

خان صادق فقراء و مساکین پاس قدر بے دریغ خرچ کرتے تھے کہ ایک دفعہ فرخ سیر بادشاہ نے خود ان سے پوچھا تھا "خان صادق شما از برائے عیال ہم چیزے میگذارید یا ہمہ را خرچ مسافرین و امور خیر میکنید" گلشن صادق تذکرۃ الاسلاف۔

غرض ایسے پاکباز اور دیندار امیر کے متعلق آپ نے ماثر الامرا کی تحریر دیکھ لی۔ اس سے مولف کی تنگ نظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خان صادق کو شعر و شاعری میں بھی دخل تھا۔ چنانچہ ایک خط میں دو اشعار، جو انھوں نے برہان الملک سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کو لکھ بھیجے تھے ملاحظہ ہوں ؎

گہے چو شانہ بہ زلف سیاہ می پیچم ۔۔۔ گہے چو سرمہ بہ بلائے نگاہ می پیچم
چناں بہ دیدن روئے خوش تو شتا فتم ۔۔۔ کہ نامہ را بہ حریر نگاہ می پیچم

---

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے، پہ سجن تم بھلے گئے
سودا

# نواب مردان علی خاں رعنا

## بحیثیت شاعر اور انشا پرداز

امیر حسن نورانی

رعنا غالب کے شاگرد رشید تھے اور ان کو اس پر فخر و ناز تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں کیا ہے۔ خود غالب بھی ان کے مداح تھے۔ اسی لیے بعض تحریروں میں رعنا کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا ہے۔ جب ان کو رعنا کی بہادری اور جرأت کا ایک واقعہ معلوم ہوا تو اس کے متعلق اودھ اخبار میں ایک مختصر مضمون لکھا۔ جو ماہ اکتوبر ۱۸۶۳ء کے ایک شمارے میں شایع ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو رعنا سے خصوصی لگاؤ تھا۔[1] ایک شعر میں رعنا نے غالب کی شاگردی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

طالب اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بے واسطے ہے شیر خدا سے

رعنا کے حالات زندگی "تلامذۂ غالب" میں تفصیل سے موجود ہیں چند مضامین بھی ان کے حالات اور شاعری پر شایع ہوئے ہیں مگر ان میں کوئی ایسا اضافہ نظر نہیں آیا جو "تلامذۂ غالب" کے علاوہ ہو۔ اسی لیے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ ان کے حالات زندگی کو یہاں نقل کیا جائے۔ سطور ذیل میں رعنا کے متعلق ایسی معلومات پیش کرنا مقصود ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ عام طور پر ان کو ایک شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور چوں کہ وہ مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے اس لیے تلامذۂ غالب کے زمرہ میں شامل ہونا ہی ان کی شہرت کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رعنا صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ جو ہر قسم کے علمی ادبی، اصلاحی، سیاسی اور معاشرتی عنوانات پر قلم برداشتہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جنوری ۱۸۶۲ء سے دسمبر ۱۸۶۳ء تک ان کے تقریباً پچاس مضامین اور دس بارہ مراسلے اودھ اخبار میں شایع ہوئے۔ اس وقت اخبار مذکور ہفتہ وار شایع ہوتا تھا۔ بعض شماروں میں رعنا کے دو دو مضامین شایع ہوئے۔ ان میں کچھ تو معمولی قسم کے ہیں لیکن بعض قابل قدر ہیں اور علمی و فنی نقطۂ نظر سے اچھے خاصے معیاری ہیں۔ رعنا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ملک کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے۔ اور اکثر معاملات اور مسائل پر آزادی سے اظہار خیال کرتے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی قدر و منزلت تھی، لاہور کے ایک شاعر دیوان امرناتھ متخلص بہ اکبری سے ان کی بڑی چشمک تھی اور غالباً اس کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا تھا جب رعنا کا قیام بسلسلۂ ملازمت پنجاب میں رہا تھا۔ اکبری کی غزلیں، قصائد اور مضامین کوہ نور اخبار لاہور میں شایع ہوتے تھے۔ رعنا کا کلام بھی کوہ نور میں شایع ہوتا تھا رعنا نے اکبری کے کلام پر تنقید کی ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اور اسی طرح اکبری بھی کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ اکبری لاہور کے ایک معزز اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا علم رعنا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ اودھ اخبار میں تین نہایت طویل تنقیدی مضامین رعنا نے اکبری کے کلام پر لکھے ہیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ چند مضامین ایسے عنوانات پر ہیں جن پر کم لوگوں نے لکھا ہوگا۔ مثلاً فرقہ مخنثان کی تاریخ، ارتقا اور ان کی معاشرت پر ایک مفصل مضمون ہے۔ اس طرح ایک مضمون "انسداد فحش فرقہ ملعونہ طوائف" کے عنوان سے لکھا ہے۔ رعنا کو نجوم اور مسمریزم سے بہت دلچسپی تھی اور ان دونوں میں مہارت بھی رکھتے تھے۔ متعدد مضامین ان علوم پر بھی لکھے ہیں۔

---

[1] مرزا غالب کا یہ مضمون میں نے مختصر تعارف اور حوالوں کے ساتھ مرتب کیا تھا جو اردو ادب (علی گڑھ) میں شایع ہو چکا ہے (امیر حسن نورانی)

تنقیدی مضامین میں اچھی خاصی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔ انداز تنقید متوازن نہیں۔ کہیں کہیں شدّت جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی عامیانہ سطح پر اتر آتے ہیں کہ تنقید سراپا تنقیص بن جاتی ہے۔ تاہم ان مضامین کو اردو میں تنقید کے ابتدائی دور کی مبادیات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

رعنا کبھی کبھی مقفّیٰ، مسجّع عبارتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ "گلدستۂ رعنا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انگریزی اقتدار سے قبل ملک کی ابتری اور انتشار کا ذکر استعارہ و کنایہ میں کیا ہے اور انگریزی دور کی خوش انتظامی، امن و سکون کو سراہا ہے۔ اس مضمون کی چند سطور درج ذیل ہیں:

ایک باغ سو برس آگے تاراجِ خزاں تھا۔ نام کو باقی اس کا نام و نشان تھا۔ گروہ یارانِ طریقت کا خراماں خراماں اس پر گزر ہوا۔ اہتمام اس کا مدّنظر ہوا۔ جب عملداری اس پر معمور ہوا۔ تام ظلمتِ خزاں کا صاف کافور ہوا۔ سعیٔ باغبان سے رفتہ رفتہ رشکِ رضوان ہوا۔ خار و خس تک پھول پھول سنبلستان ہوا۔ رشکِ آب روانی نہر و آبِ جوئے کوثر و تسنیم کو پانی کیا۔ صفا و راستی نے ہر روش کو صاف خطِ کہکشانی کیا۔ خارستان سواد باغ تک سبزۂ بیگانہ ہوا۔

مرغانِ چمن طائرِ سدرہ کے ہم صفیر تھے۔ بجز بادِ صبا کے صرصر کا وہاں کام نہ تھا۔ صیاد و گلچیں کا نام نہ تھا۔ پیر باغبان نے ایک عمر چین سے بسر کی۔ یارانِ طریقت نے دن گلگشت میں کاٹا۔ رات عیش میں سحر کی۔ نہ گل کو گل چین کا خوف و بیم تھا۔ نہ کسی مرغِ چمن کا جورِ دستِ صیاد سے دل دو نیم تھا۔ پھول پھولے نہ سماتے تھے۔ شاخ پر ثمر شاخِ سدرہ کے ہمسر زمین پر بچھے جاتے تھے۔ خاک سرزمینِ چمن خاکِ شفا تھی۔ زینت میں بیر کو شکِ عرش سے بالا تھی......

عام طور سے رعنا صاف و سادہ زبان میں لکھا کرتے تھے۔ محاورات و ضرب الامثال کا برمحل استعمال ان کو خوب آتا تھا۔ طنز و مزاح کی چاشنی بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے تاہم وہ کوئی صاحبِ طرز انشا پرداز نہیں کہے جا سکتے لیکن اردو زبان کے ایک اچھے ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کا ایک مضمون ہے "تکیہ کلام" اس کی چند سطریں پڑھیے:

"تکیۂ کلام ہزاروں طرح کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جدا تکیۂ کلام ہے" جیسے، کیا نام، ہاں صاحب، سمجھے صاحب، آیا خیال، پھر لو، اس کا کیا نام ہے، صاحب میرے، محض لوگوں کا تکیۂ کلام الفاظ ثقیلہ ہو جاتے ہیں۔ اور افسوس ہے؟" (ص ۳۰)

کہ وہ لوگ کیسے بھلے مانس ہیں کہ کسی بھلے مانس کی صحبت میں بیٹھنے کے لائق نہیں۔ (اودھ اخبار ۷ مئی ۶۳)

رعنا کو چھوٹے چھوٹے نئے اور شگفتہ نام رکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ان کی عادت ہو گئی تھی کہ ہر مضمون کے خاتمے پر اپنا ایک نیا ادبی نام لکھ دیتے تھے۔ اس طرح کے متعدد نام ان کے مضامین کے آخر میں درج ہیں۔ مثلاً "راقم حق نگار"، "تجربہ کار"، "راقم جہاندیدہ"، "راقم شفا خواہ"، "حق پسند"، "طلسم شکن"، "راقم حسن ظن"، "راقم صلح کل"، "راقم احسان بے منت"، "راقم غیور"، "راقم مو شگاف"، "راقم تن بتقدیر" وغیرہ۔

اودھ اخبار کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰ فروری ۱۸۶۳ء سے ۳ اکتوبر ۱۸۶۳ء تک رعنا کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس طویل قیام کی غرض کیا تھی لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں قلمی جہاد بہت زور و شور سے جاری رکھا۔ منشی نولکشور اور غلام محمد خاں تپش ایڈیٹر اودھ اخبار رعنا کے بڑے قدر دان تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ رعنا کے بھی مضامین کے آغاز میں منشی نول کشور نے چند سطور بطور تعارف لکھی ہیں اور ان کی شعر گوئی، سخن فہمی اور ذہانت و ذکاوت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ٹاڈ کی تاریخ راجستھان کا اردو ترجمہ رعنا کی توجہ اور کوشش سے منشی نولکشور نے طبع کرایا تھا۔

رعنا کے حسب ذیل مطبوعہ مضامین میرے پاس موجود ہیں۔

## فہرست مضامین رعنا

| نمبر شمار | عنوانات | نوعیت | تاریخ و سنِ اشاعت |
|---|---|---|---|
| ۱ | زنانِ مردانہ دار ہند | اصلاح معاشرت | ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۳- | ترمیم در امور تنجیم | علم نجوم | ماہ مئی ۱۸۶۲ء |
| ۴- | تکیہ کلام | اخلاقی | " " |
| ۵- | خیالاتِ رعنا | اخلاقی | " " |
| ۶- | دورۂ ارضی | جغرافیائی | " " |
| ۷- | اطبائے ہند | اصلاحی | ماہ جون ۱۸۶۲ء |
| ۸- | نقار خانے میں طوطی کی آواز | اصلاحی | " " |
| ۹- | خیال خیر مآل رعنا بہ تبعیت مرشدنا غالب | سیاسی | " " |
| ۱۰- | حق اللہ و حق العباد | اخلاقی | " " |
| ۱۱- | خدا مہربان توکل مہربان | معاشرتی | " " |
| ۱۲- | طلسم شکن طوائفان | اصلاح معاشرت | " " |
| ۱۳- | اسباب زیرکی اہل فرنگ | سیاسی و علمی | ماہ جولائی ۱۸۶۲ء |
| ۱۴- | رواج فہرست رسائل و اخبارات مطبوعہ | صحافتی | " " |
| ۱۵- | چون کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی | اصلاحی و اخلاقی | " " |
| ۱۶- | خطاب رعنا | اصلاحی | " " |
| ۱۷- | وجود باری تعالیٰ | مذہبی | ماہ اگست ۱۸۶۲ء |
| ۱۸- | صلاح بر فلاح | اخلاقی | " " |
| ۱۹- | تعلیم علم خواب مقناطیسی (مسمریزم) | فنی | " " |
| ۲۰- | لکھنؤ کی عزاداری | تاریخی | " " |
| ۲۱- | چراغ روشن مراد حاصل | | " " |
| ۲۲- | ترتیب تاریخ ہر شہر و ضلع | تاریخی | " " |
| ۲۳- | فرقہ مہنتان کی تاریخ | تاریخ معاشرت | ماہ ستمبر " |
| ۲۴- | تہذیب و تعلیم اولاد طوائف | اصلاحی | " " |
| ۲۵- | خیالات رعنا در باب آئین ہر رواج | سیاسی | " " |
| ۲۶- | امام باڑہ حسین آباد و مقبرہ محمد علی شاہ | تاریخی | " " |
| ۲۷- | کمیٹی دافع ایذائے حیوانات | اصلاحی | " " |
| ۲۸- | حق اقبال محرم | قانونی | " " |
| ۲۹- | گلدستۂ رعنا | ادبی | " " |
| ۳۰- | گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل | ادبی و تنقیدی | اکتوبر " |
| ۳۱- | رواج باغ شاہی در ہر ضلع | اصلاحی | " " |
| ۳۲- | انسداد فحش فرقہ ملعونہ طوائف | اصلاح معاشرت | " " |
| ۳۳- | جواب اعتراض اکبری (امرناتھ اکبری) | تنقیدی | " " |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۳۴ـ | خطاب رعنا از حضرت پادریان | مذہبی و اخلاقی | ماہ ستمبر ۱۸۶۲ء |
| ۳۵ـ | تحقیق حال کافرستان | تاریخی | " " |
| ۳۶ـ | تدبیر آبادی جنگل افتادہ از طائفہ مساکین | معاشی | " " |
| ۳۷ـ | جنگ زرگری زرگراں | " | " " |
| ۳۸ـ | عادہ خلق | " | ماہ اگست " |
| ۳۹ـ | من خوب می شناسم پیران پارسا را | تنقیدی و ادبی | ماہ ستمبر " |
| ۴۰ـ | فاش می گویم | علم قیافہ | ماہ مارچ " |
| ۴۱ـ | اخبار نویسی بڑا مشکل کام ہے | صحافت | " " |
| ۴۲ـ | حلوا خوردن را روئے باید | اصلاحی | ماہ اپریل " |
| ۴۳ـ | سوال رعنا | ادبی تنقیدی | " " |
| ۴۴ـ | تتمہ مضمون طلسم شکن طرائف | اصلاح معاشرت | " " |
| ۴۵ـ | حسن تدبیر بندوبست استمراری | اقتصادی | " " |
| ۴۶ـ | احوال ملکہ وکٹوریہ | سوانح | ماہ اگست " |
| ۴۷ـ | وثیقہ داری | معاشرتی | " " |
| ۴۸ـ | تقرر مجلس عام سلطورس آف کامنس | قانونی اصلاحی | " جون " |

## رعنا کی شاعری

رعنا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تو نظر نہیں آتی البتہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ضرور تھے۔ الفاظ پر بڑی قدرت تھی۔ قصائد کے علاوہ غزلیں بھی خاصی طویل ہوتی تھیں۔ غالباً انھوں نے ہر صنف سخن پر کم و بیش طبع آزمائی کی ہوگی، لیکن میرے پیش نظر ان کے متعدد قصائد، غزلیات اور چند قطعات ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ ایک غزل کا عنوان ہے "عالم آشوب" حافظ کی مشہور غزل ع ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم" پر امرناتھ اکبری نے ایک غزل لکھی تھی" ع ایں چہ شوریست کہ در دور زحل می بینم" رعنا نے اکبری کی غزل پر غزل کہی۔

ایں چہ شوریست کہ در دور فلک می بینم | شور و شر را ز سما تا بہ سمک می بینم
شور در عالم و شر در بشر خاص و عام | سر بسر فتنہ بہ ہر جن و ملک می بینم
حیف از دہر چرا نام شفا شد کافور | دور علت ز کتک تا باتک می بینم

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کا مصرع ہے: "تحبست امردن استغنائے قاتل را جوا لبتی" اس پر رعنا کی ایک طویل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جہاں آمد بجان، جان جہانے در نقا بستی | دو عالم محو دیدار است و تو اندر نقا بستی
جہاں بحر فنا ہم رواں نقشے بر آب استی | مزن دم بر حیات خویش کہ عین حبا بستی
بقول اوستادم شوق وصلش جانشاں باشد | تحبست امردن استغنائے قاتل را جوا بستی

اسی طرح پر ایک اور غزل بھی لکھی تھی جس کا مطلع ہے۔

دل مضطر چرا مشاطہ در زلف رسا بستی | سر سودا بتو دش تا بلا اندر بلا بستی

اردو میں رعنا کی بہت سی غزلیات اور قصائد اودھ اخبار لکھنؤ اور کوہ نور لاہور میں شایع ہوئے مہاراجہ کپورتھلہ کی شان میں ایک طویل قصیدہ کوہ نور مورخہ ۸ راگست ۶۲ء اور اودھ اخبار مورخہ ۱۶ راگست ۶۲ء میں شایع ہوا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

نسیمِ گل نے کیا باغ دہر کو تسخیر
بہارِ گلشنِ عالم میں اب ہے عالمگیر

لارڈ کیننگ کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا تھا:

وہ اقبالِ مجسم تھا کیننگ آہ
کہ تھا عالم میں اس کا جابجا شور

خلیق و محسن و مونس، مربی
شجاع و عاقل و فیاض و غم خور

دلِ مغموم رعنا سے یہ سن کر
صدا آئی "بصد غم ہائے غم خور"
۱۸۶۲ء

رعنا کی متعدد غزلیں پیش نظر ہیں بطور نمونہ ایک مختصر غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ رسائی نہ کرے زلف رسا کی
الجھے دلِ دشمن بھی نہ گیسوئے دوتا سے

بگڑے ہوئے تیور رہیں خدا خیر کرے
بے وجہ مجھے وہ نظر آتے ہیں خفا سے

اللہ رے یہ گرمیٔ اختلاط محبت
بگڑا جو وہ بت مجھ سے تو بگڑا میں خدا سے

طالب اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیرِ خدا سے

رعنا بڑے ذہین اور طباع تھے۔ وہ ایک وقت میں مختلف اور گوناگوں میدانوں میں اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی ایک علم یا فن میں امتیازی خصوصیت نہ حاصل کر سکے۔ ایک طرف ان کو شعر و سخن اور انشا پردازی کا شوق تھا۔ دوسری طرف ملکی اور سیاسی معاملات و مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے ساتھ نجوم، رمل اور موسیقی سے ذوق تھا۔ اگر ان کا ذوق صرف شعر و سخن اور انشا پردازی پر اکتفا کرتا تو یقیناً وہ ایک بلند پایہ شاعر اور اچھے انشا پرداز ہوتے تاہم ان کا سرمایہ نظم و نثر قابلِ قدر ہے۔ اور اردو زبان و ادب کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔

# فورٹ ولیم کالج کی ایک ناقابل فراموش شخصیت

ڈاکٹر احراز نقوی

اردو شاعری جب اپنے پورے شباب پر تھی اس وقت کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی اور نثری اسالیب کی طرف توجہ کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ خواہ سیاسی یا سامراجی استحکام کی منصوبہ بندی ہو یا لسانی سازش بہر حال اس کی افادیت یا ادبی احتیاج سے تو انکار نہیں ہو سکتا مگر اس زمانے میں لکھنؤ اور دلی والوں کی نظر میں فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ ادبی تمیز اور اس کے سلیقے سے باہر تھا۔ ان کے نزدیک فارسی، انشاء اور شاعری ہی ادب تھا اس لئے فورٹ ولیم کالج کے رشحات درخور اعتنا نہ سمجھے گئے۔ مؤلف تذکرۂ گلشن ہند لکھتا ہے۔

"اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا کھائی ہے۔"

پھر بھلا فورٹ ولیم کالج کے دانشوروں کو کون پوچھتا؟ اور کون ان کی تاریخ لکھتا؟ یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں بھی ایسی معتبر تصنیف نہیں ملتی جو ان ارباب فن کے کوائف اور شغل و زندگی کا احاطہ کرے۔ یہی بات کہ آج ان قلم کاروں کی تحریریں تو کسی حد تک زمانے کی دستبرد سے محفوظ نظر آتی ہیں۔ مگر ان کی شخصیت اور سیرت کے خط و خال قدر ناشناسی کے غبار سے معدوم ہیں اور ادب کا ہر جدید مورخ یہاں آکر گم اور گنگ نظر آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی وہ قابل قدر ہستیاں جو آج گمنامی میں ہیں انھیں میں سے ایک بدنصیب، شیخ اکرام کا بھی نام ہے۔ شیخ اکرام کے سلسلے میں ہماری معلومات کا سرمایہ بیحد حقیر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سید محمد فورٹ ولیم کالج کا محقق لکھتا ہے۔

"مولوی اکرام علی بہت ہی گمنام شخص ہیں۔ ان کے حالات معاصرین نے بھی نہیں بیان کئے ہیں۔ مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا ذکر تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔"

ابھی کچھ عرصہ ہوا "اکرام علی اور فورٹ ولیم کالج" کے نام سے ایک کتاب نادم سیتاپوری کی طبع ہوئی ہے۔ نادم صاحب کا یہ تحقیقی کام قاضی الیاس سیتاپوری کا مرہون منت ہے۔ غالباً جہاں تک میرا علم ہے اس کی بنا پر یہ خیال ہے کہ قاضی الیاس کا مقالہ جو شیخ اکرام کے سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۳۱ء میں طبع ہوا۔ وہی موصوف کے سلسلے کا سب سے اہم ماخذ تھا اور اسی مضمون کو نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب کی اساس بنایا ہے۔ جس کا خود انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر صرف یہ ایک مضمون شیخ اکرام کے سلسلے میں جہاں ہماری تحقیق اور تجسس کی راہوں کو کھولتا ہے۔ وہاں نہ جانے کتنی اور تدقیقی استفسارات کے راستوں کو پیدا کرتا ہے۔ نادم صاحب کی کتاب واقعی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مگر مواد کی عدم فراہمی کا بھی قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ اور تحقیقی تسامحات سے بھی مبرا اس کتاب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ میرے اس مقالے کا مقصد اس کتاب کی تنقیص یا بحث مقصود نہیں ہے۔ بہت سے مقامات پر میرا اُن کا تحقیقی اختلاف ہے اور نتائج برعکس نظر آتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا مقالہ حرف آخر کا حکم رکھتا ہے مگر جہاں تک اس کی اہمیت کا سوال ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مولوی شیخ اکرام فورٹ ولیم کالج میں کئی اعتبار سے ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی پہلو دار شخصیت ایک عالم، اُستاد، حکیم، مترجم محقق اور اپنے عہد کے ایک اہم انشاء پرداز کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ اور اُن کے پُرکھے بڑے بڑے صوفی بزرگ، اللہ والے، عالم، مورخ اور حکیم گذرے ہیں۔ جن میں بابا فرید گنج شکرؒ، ہمام الدین خاوند شاہ اور شیخ یحییٰ قادری جیسے جلیل القدر بزرگ قابل ذکر ہیں۔ شیخ اکرام کا وطن سیتاپور (یو۔پی) ہے اور جس محلے کے ساکن تھے اس کا نام شیخ سرائے ہے جو اُن ہی کے

[1] [illegible] ۔ [2] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ ادارۂ فروغ اردو ۱۹۵۱ء

ں کا بسایا ہوا تھا اور آج بھی وہ اسی نام سے شہر سیتاپور میں قائم ہے۔ باپ کا نام شیخ احسان علی تھا۔

حکیم موصوف سیتاپور کے رئیس اور محلہ شیخ سرائے میں سکونت پذیر تھے۔ مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ احسان علی صاحب تھا

حکیم صاحب (شیخ اکرام) کے آباؤ اجداد ارباب تصوف میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن خدا نے دنیاوی مال و جاہ سے سرفراز کیا تھا

دربار شاہی میں مناصب جلیلہ پر ممتاز تھے۔ محمد شاہ دہلی اور لکھنؤ کے دربار سے اُن کیلئے جاگیریں اور وظائف معیّن تھے (الناظر۔ یکم نومبر ۱۹۱۹ء)

حکیم شیخ احسان علی کی شادی قصبۂ باڑی (تحصیل سدھولی) ضلع سیتاپور میں رئیس قاضی شیخ غلام رسول صدیقی کی لڑکی سے ہوئی اور شیخ احسان علی نے اپنے لڑکے شیخ اکرام علی کی شادی سبحان علی خاں کی لڑکی سے کی۔ جو سرکار اودھ کے منصب دار تھے اور شیخ سرائے تاپور میں سکونت پذیر تھے اور شہر کے عمایدین میں شمار کیئے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے شیخ اکرام علی کا ننہیال اور دادھیال دونوں نفل کا گہوارہ تھے۔ اسی ماحول میں موصوف کی علمی اور اخلاقی تربیت ہوئی۔ قاضی الیاس مرحوم کی روایت کے بموجب شیخ اکرام علی کی عمر نو برس کی تھی تو اُن کے باپ مولوی احسان پر نہ جانے کیا افتاد پڑی کہ تن تنہا گھر بار چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ وجہ اور سبب لوم ہو سکا۔ بعض لوگوں نے دماغی خلل کا جواز تراشا ہے۔ مگر یہ روایت ثقہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

بچپن میں باپ سے بچھڑ جانے کا صدمہ موصوف کی زندگی پر بہت گہرا پڑا۔ اور یہ غم کی خلش انھیں زندگی بھر رہی۔ غالباً اسی غم کے رجحان نے ،بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا۔ چنانچہ ان کی ساری توجہ کسب علم کی طرف مائل ہو گئی۔ طبّاعی اور ذہانت نے بہت جلد علم و فضل ،زلوں کو طے کرنا شروع کر دیا۔ ابتدائی اکتساب علمی کے بعد کلکتے کے "مدرسۂ عالیہ عربیہ"[۹۱] میں داخل ہو گئے قاضی الیاس اپنے قلمی نسخے میں تحریر تے ہیں۔

"آخر ایک ناصح مشفق کی نصیحت سے متأثر ہو کر ترک وطن کر کے پہلے مولوی حاجی تراب علی صاحب نامی خیرآبادی مدرس مدرسۂ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس کے ذریعہ سے سفر کی ناقابل برداشت صعوبتیں اٹھا کر کلکتے کے مدرسۂ عالیہ عربیہ میں داخل ہوئے[۹۲]"

حاجی تراب علی فرنگی محلی شیخ اکرام کے حقیقی بھائی نہیں بلکہ رشتے کے بھائی تھے اگرچہ تراب علی کی پوری زندگی ہماری لاعلمی کے اندھیر ہے مگر وسیط النحو کے مطالعے اور نتائج الافکار تذکرۂ شعرائے دکن اور گنگا پرشاد ورما کی سوانح عمری مولوی محمد کاظم[۹۳] اور ڈاکٹر صفدر کے تحقیقی

---

مدرسۂ عالیہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے مسلمانوں کی درخواست پر عربی، فارسی، اردو اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کے لئے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا اس کی نگرانی لیے ۱۸۲۹ء میں کپتان اردن کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔ میجر سو نے اپنی کتاب "تاریخ تعلیم" صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے کہ ایک سو سے زیادہ طلبا رکھ تین تین سو روپے ارکا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) وساطت سے یہ بھی تحقیق کر سکتے ہیں کہ مولوی خلیل الدین اشک بادی (مترجم داستان امیر حمزہ) کے علاوہ مولوی حفیظ الدین احمد نے بھی اسی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی "تاریخ تعلیم" خالدیار خاں کی تصنیف میں اس کالج کے ں تاریخ ۱۸۲۱ء درج ہوئی ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲ سید طفیل احمد منگلوری نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اس کے قیام کی تاریخ ۱۷۸۱ء لکھی ہے۔

قلمی نسخہ ص ۱۱ قاضی الیاس سیتاپور کے بڑے عالم بزرگ تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی تھانہ کر اور لکھ پڑھ کر گذاری آخر عمر میں کسی عزیز کی تعزیت میں (باڑی تحصیل سدھولی) پر لیگئے۔ وہاں سے تو خیریت رخصت ہوئے مگر پھر اس کے بعد آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کہاں غائب ہو گئے۔ سیتاپور میں اُن کا آج بھی کتب خانہ ہے اور قلمی نسخوں کا ذخیرہ دان کی تحریروں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مذہبی، علمی اور ادبی سنئے موجود ہیں۔ ان کے بارے میں یہی گمان اغلب ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔

سوانح عمری مولوی محمد کاظم کے مصنف نے برسبیل تذکرہ ان دونوں تذکروں سے کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ اور فرنگی محل کے علماء کی فہرست میں موصوف علم و فضل کی تصدیق ان کے معاصروں کے ساتھ یوں کی ہے "مولوی عبدالحکیم، مولوی عبدالحلیم، مولوی عبدالحئی، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعد اللہ، ی تراب علی، واحد علی نقلی اور عقلی کے جامع تھے۔ (سوانح عمری مولوی محمد کاظم صفحہ ۱۳۶)

، ڈاکٹر صفدر اپنے تحقیقی مقالے میں تراب علی کے ساتھ کچھ دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " ان سب نے مل کر (یعنی علماء فرنگی محل) صرف نحو، ادب، بیان، ادب، شعر، عروض عربی، ہیات، فقہ، اصول فقہ، کلام، عقائد، منطق، فلسفہ، طبعیات والہیات وغیرہ میں لکھنؤ کا پایہ بہت بلند کر دیا (شاہان اودھ کے دور میں زندگی اور شاعری صفحہ ۱۶۱ نسخہ غیر مطبوعہ)

مقالے (غیر مطبوعہ) سے واضح ہوتا ہے کہ تراب علی بڑے پائے کے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ عربی فارسی میں کمال حاصل تھا۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ناؔمی تخلص تھا اور ہندوستان کے فارسی شعراء میں اُن کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی مجلد تصانیف کا سراغ نہیں ملتا۔

باپ کے اچانک صدمے نے شیخ اکرام علی کی زندگی کی باگوں کو علم کی طرف موڑ دیا۔ یہی اُن کی زندگی کا نفسیاتی ردعمل تھا۔ جو انھیں کھینچ کر کلکتے لے گیا پھر اس کے بعد کلکتے سے دہلی لے آیا۔ شیخ اکرام کلکتے سے دہلی کیوں آئے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو تمام تحقیق کے بعد بھی واضح نہیں ہوتا مگر گمان یہی ہوتا ہے کہ دہلی میں اکتساب علم کی خاطر وہ آئے ہوں گے۔ تحقیق سے اتنا بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دہلی میں شیخ اکرام کے چچا مردان علی بھی سکونت پذیر تھے۔ جو دربار سے منسلک تھے مگر یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ شیخ اکرام کے دہلی آنے میں ان کے چچا کا تلطف اور رفاقت کہاں تک شامل رہی یہ بھی توجہ طلب نکتہ ہے کہ وہ اس وقت تک حیات بھی تھے یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ قاضی الیاس مرحوم بھی اس کی وضاحت نہ کر سکے اور انھوں نے یہی لکھا ہے

دہلی آئے اور بمقام جامع مسجد یہاں کے نصاب کے موافق یہاں کے علماء کو امتحان دے کر سند حاصل کی ——— (قلمی نسخہ صفحہ ۱۹)

دہلی میں تحصیل علم سے فراغت کے بعد یہ عین قرین قیاس تھا کہ وہ یہیں رہ پڑتے مگر وہاں کے ناسا عد حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دہلی کی محفلیں تو یوں بھی اجڑ رہی تھیں۔ اب رہا لکھنؤ کا معاملہ، لکھنؤ میں جس انداز کی درباری زندگی لہو ولعب کے ساتھ فروغ پا رہی تھی۔ شیخ اکرام کا طبعی میلان اور مذہبی عقائد قطعی منافی تھے۔ مناسب یہی تھا کہ شیخ اکرام اپنے بھائی تراب علی کے پاس پھر چلے جائیں۔ اس زمانے میں تراب علی کا مقام بڑی حیثیت رکھتا تھا اسی تقویت اور بھروسے پر شیخ اکرام کلکتے واپس چلے آئے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب گل کرسٹ اور لارڈ ولزلی کی کوششوں سے کلکتے میں (گل کرسٹ کا مدرسہ ختم ہو کر) فورٹ ولیم[1] کالج کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اور بڑے لکھوں کی چھٹیا کلکتے میں جمع ہو رہی تھی چنانچہ تراب علی کی سفارش اور توسل سے فورٹ ولیم کالج میں شیخ اکرام کو مسٹر براہم لاکٹ کی اردو تعلیم کے لیئے مامور کیا گیا۔ یہ موصوف کے علمی اور تبحر کا نتیجہ تھا کہ براہم لاکٹ جیسا فوجی ذہنیت کا شخص علم وادب کی طرف مائل ہو گیا اور جان گل کرسٹ کے مستعفی ہونے یعنی ۱۸۰۲ء کے بعد شعبہ تصنیف و تالیف میں براہم لاکٹ کا شمار ارباب حل و عقد میں رہنے لگا۔ براہم لاکٹ اپنے استاد کے مرتبہ سے بخوبی واقف تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھ شعبہ تصنیف و تالیف میں شیخ اکرام کو منسلک کر لیا۔ اور کتاب اخوان الصفاء کے ایک حصے کا ترجمہ کر دایا۔ قاضی الیاس اپنے تحقیقی قلمی نسخہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اخوان الصفاء کا اس حصے کا ترجمہ اردو میں شروع کیا جس میں انسان اور حیوان کا مناظرہ ہے۔ ۱۲۲۵ھ ہجری ۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہوا۔" (صفحہ ۲۲)

اخوان الصفاء ترین رسالوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف کا مسئلہ صدیوں سے آج تک تحقیق نہ ہو سکا۔ موضوعات کے لحاظ سے یہ رسالے اخلاقیات مذہبیات، معاشیات، علم تصوف اور فلسفے کا بحر بیکراں ہیں۔ جن کی تفصیل اور تجزیہ کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ اس بحث سے قطع نظر شیخ اکرام نے یہ ترجمہ[2] عربی سے کیا ہے۔ کرنل نیکنگ نے اپنے مضمون میں برسبیل تذکرہ اخوان الصفاء کے ضمن میں بجائے شیخ اکرام علی کے تراب علی ناؔمی کا نام لکھا ہے

"The Ikhwanussafa in urdu Translated from Arabic by Toorab Ali."

قاضی الیاس ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہو کر اول اول ٹائپ میں وہیں چھپا جس کے سرورق پر مترجم اکرام[93] علی حنفی درج تھا۔ (قلمی نسخہ صفحہ ۲۰)

شیخ اکرام علی کے اس ترجمہ کے بعد کسی دوسرے مطبوعہ ترجمے یا تصنیف کا سراغ نہیں ملتا تذکرۃ المصنفین کا حوالہ قاضی محمد الیاس کے نسخے میں ان الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔

---

[1] انگریزی ملازمین کے لیے ہندوستانی تعلیم اور ان کی تہذیب و معاشرت کے لازمی علم کا اعلان ۱۸۰۰ء میں کیا گیا مگر اس کی تکمیل ۱۸۰۰ء میں کی گئی جس کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ براؤن ——— (Rev. David Brown) (ملاحظہ ہو گل کرسٹ اور اس کا عہد ——— محمد عتیق صدیقی) صفحہ ۳۲ ہوئے۔

[2] اخوان الصفاء کا ترجمہ تقریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے مگر شیخ اکرام کے پیش نظر نسخہ عربی کا تھا فارسی کا نہیں۔

[3] اخوان الصفاء کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی دو نسخے ہیں پہلا ——— ۱۸۱۰ء کا جو شیخ اکرام کے پوتے منشی حسن رضا ادیب نے امیر المطابع سے شائع کیا اور دوسرا ——— ۱۹۳۰ء کا جو انجمن ترقی اردو دہلی کا ہے۔

"تذکرۃ المصنفین بھی آپ ہی کی تالیف تھی جو نہایت تحقیق سے لکھی گئی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی یہ کتاب عرصے تک آپ کے (شیخ اکرام) خاندان میں رہی اس کے بعد خاندانی لوگوں کی غفلت و بے پروائی سے یہ کتاب کسی طریقے سے سیتاپور کے سب جج عبدالسلام رامپوری کے یہاں پہونچ گئی اور یہ کتاب ہمیشہ کے لیے اس خاندان سے رخصت ہو گئی"۔ (قلمی نسخہ ص۲۲)

پھر ایک اہم بات اپنے قلمی نسخے میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کے بعد داماد سید وزیر علی اجمیر شریف جا کر آپ کے متعلقین کو سیتاپور لے آئے۔ آپ کا کل اسباب بیس لڑھیوں (گاڑیوں) پر لاد کر اجمیر شریف سے سیتاپور لایا گیا۔ جن میں نایاب کتابیں بھی تھیں اکثر نادر اور نایاب کتابیں ضائع ہوئیں"۔ (قلمی نسخہ ص۲۵)

ابھی کچھ عرصے کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ایک نسخہ قلمی سیتاپور کے قیام میں ان کے قدیمی مکان میں بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں میں "اسرار قاسمی" کا دستیاب ہوا۔ کتاب کے آخر میں نام "شیخ اکرام علی" درج ہے یہ نسخہ شیخ اکرام کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس کتاب کا مصنف ملا واعظ کاشفی ہے اور علم نجوم سے متعلق ہے۔ مگر کتاب میں ملا واعظ کاشفی کا نام القط ہے۔ بہرحال موصوف کا نام درج ہونے سے ان کی ملک کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی گمان ہو سکتا ہے کہ شیخ اکرام نے اس کتاب کو خود نقل کیا ہو اور ان دونوں باتوں سے قطع نظر ظاہر یہ فرد ہے کہ شیخ اکرام کو علم نجوم سے اسی طرح سے شغف تھا جس طرح حکیم مومن خاں مومن کو تھا اور حکمت سے بھی شیخ اکرام کو بہت گہرا ذوق تھا۔ اپنی عمر کے آخر حصے میں موصوف نے حکمت کو خلق خدا کی خدمت کا ذریعہ بنایا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ گلکرسٹ کے عہد میں کوئی ایسا کارڈ نہیں ملتا جس کے بل بوتے پر یہ ہم کہہ سکیں کہ شیخ اکرام نے بھی کسی نوعیت کا کوئی معلمانہ یا مولفانہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ بات محض قیاس کے توسط سے ہی کہی جا سکتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے آخری زمانے میں کالج کے حلقۂ ارباب میں شامل ہوئے۔ اور "اخوان الصفا" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے ہندوستانی پریس سے طبع کروایا۔ اور یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کہ ہندوستانی پریس شیخ اکرام کا قائم کردہ ہے۔ دراصل اس تحقیق کا ماخذ اختر شہنشاہی[۵۱] ہے۔ تحقیق کے اس ثانوی ماخذ کو مختلف محققوں نے برحق مانا ہے۔ قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں۔

"جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اردو کا پہلا مطبع ۱۸۰۱ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوا۔ پریس کا نام "ہندوستانی پریس" تھا اور اس کے مالک کوئی اکرام علی صاحب[۵۲] تھے"۔

اسی طرح قاضی الیاس سیتاپوری اور نادم سیتاپوری کا بھی اصرار خصوصیت کے ساتھ ہے۔ مگر عتیق صدیقی اپنے ایک تحقیقی موقف کی بنا پر اس تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔

"فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم ہوا اُس کا نام۔ ہندوستانی پریس تھا"[۵۳]

اس کے بعد اپنی دوسری کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں اپنے قول کی پوری توثیق اس طرح کرتے ہیں۔

"گل کرسٹ نے اپنے خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۰۱ء میں ہندوستانی شعبے کے لیے خود کتابیں چھاپنے کی تجویز کالج کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس کے متعلق کونسل کے کسی قطعی فیصلہ کا ہم کو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گل کرسٹ نے عملاً طباعت کا کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے سب سے پہلے ایک چھاپے خانے کا انتظام کرنا ضروری سمجھا"[۵۴]

ہندوستانی پریس کی تاریخ اول الذکر کتاب میں ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں لکھی ہے۔ اور موخر الذکر کتاب میں بغیر حوالے اور بغیر ثبوت کے تاریخ قیام ۱۸۰۲ء لکھی ہے۔ اس سے قطع نظر عتیق صاحب کی تحقیق سے بہرحال اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی پریس کی بنیاد شیخ اکرام سے نہیں بلکہ گل کرسٹ کے ہاتھوں پڑی۔ دوسرے تقدم کا شرف بھی گل کرسٹ کو ملتا ہے۔ مگر اشرف نقوی کی تحقیق کی اس سے تردید نہیں ہوتی اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ اکرام علی کی ملکیت ہندوستانی پریس نہ تھا اس سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اشرف نقوی کو اپنے زمانے میں جو ماخذ میسر تھے اسی کی بنا پر موصوف کا یہ تحقیقی استنباط

---

۵۱۔ "اختر شہنشاہی"، پر راقم الحروف کا مضمون ملاحظہ ہو ماہنامہ سب رس جولائی ۶۶ء

۵۲۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ نگار۔ لکھنؤ ۱۹۴۰ء ۔ ۵۳۔ ہندوستانی اخبار نویسی ص۴۲ ——— انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء

۵۴۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ——— ص۱۵۱ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۰ء

شیخ اکرام، اشرف نقوی کے ہم وطن ہونے کے علاوہ دونوں ایک ہی معزز برادری تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ دونوں کے زمانوں میں خاصا بُعد تھا۔ اس لیے اشرف نقوی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے یہ بات ہوا میں کہہ دی ہو۔ بہر حال ان کے پاس اس وقت یقیناً کوئی معتبر ذریعہ تھا۔ مگر یہ واضح رہے کہ اشرف نقوی نے یہ کہیں پر نہ لکھا ہے کہ ـــــ یہ ہندوستانی پریس اردو کا سب سے پہلا مطبع تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ دوسرے محققین ماخذ کی عدم موجودگی کی بنا پر اس کو اردو کا پہلا پریس مان لیں۔ عتیق صدیقی کی تحقیق سے یہ ثابت ضرور ہوگیا کہ پہلا پریس گل کرسٹ نے قائم کیا ہے مگر ہندوستانی پریس پر ملکیت کا دعویٰ غلط نہیں ہوسکتا بلکہ اس سلسلے میں یہ ضرور ذہن میں رکھنا ہوگا کہ گل کرسٹ کا مطبع سے تعلق دو سال سے زیادہ نہیں رہا یعنی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۴ء تک اور ۱۸۰۴ء میں جب وہ استعفیٰ دے کر واپس وطن جاتا ہے تو اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں کی فہرست میں چھاپے اور ٹائپ کا اندراج کرتا ہے۔ اور آخر میں یہ تحریر کے الفاظ ہیں۔

"فی الحال ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر بیک ڈاگل ـــــ (Mac dou gal) اور مے کن ٹوش فل ٹن اینڈ کمپنی (Mac Kin Tosh futon) کی مشترکہ نگرانی میں چھوڑ رہا ہوں[۵۱]"

اور اسی طرح سے ہندوستانی پریس کا کام شیخ اکرام کے ہاتھوں آیا۔ یہ عمل کس طرح سے ہوا۔ اس کے عواقب یا عوامل کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی معتبر ماخذ نہیں ہیں مگر اخترِ شاہنشاہی کے حوالے کے بعد یہ نہیں انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس پریس کے مالک نہیں ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے چاہے ہندوستانی پریس کی تاریخ اجراء میں تسامح ہو جائے۔

دوسری اس سلسلے کی تحقیقی کڑی اردو اخبار کی ہے جس کے بارے میں سید حامد حسن قادری نے داستانِ اردو تاریخ" میں لکھا ہے۔

مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی سے اردو اخبار جاری کیا۔ اردو کا یہ دوسرا اخبار تھا ـــــ پہلا اردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا[۵۲]۔

اس تحقیق کی تائید میں عبدالرزاق راشد[۵۳] اور بالخصوص ناظم سیتاپوری کا یہ اصرار ہے کہ اردو کا پہلا اخبار کلکتے سے شیخ اکرام نے نکالا۔ مگر اس تحقیق کی پائیداری میں ثبوت بہت ضعیف ملتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں کارساں دتاسی اور اشرف نقوی بھی خاموش ہیں اس کی تردید اور ثبوت میں عتیق صدیقی کے دلائل اور ثبوت زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں اور اس روشنی میں اگر اردو کا پہلا اخبار ہوسکتا ہے تو وہ "اردو اخبار" (اس اخبار کی کوئی حقیقت نہیں) نہیں بلکہ "جام جہاں نما"[۵۴] ہے جو مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے طلوع ہوا۔

شیخ اکرام کب تک فورٹ ولیم کالج سے منسلک رہے اور کتنے عرصے تک ہندوستانی پریس سے متعلق رہے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اتنا ضرور تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ابراہیم لاکٹ کی سفارش سے موصوف کا عمل دخل کالج میں رہا۔ اور تبحر علمی کی بدولت شیخ اکرام کلکتے کے صدر الصدور بھی مقرر ہوئے۔ رسالۂ الناظر میں قاضی الیاس لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو الناظر لکھنؤ نومبر ۱۹۱۵ء

"یہ عہدہ اس زمانے میں جج کے برابر ہوتا ہے۔"

مگر موصوف کی طبیعت اس پیشے سے بھی بھر گئی اور دنیاوی دھندوں اور جھمیلوں سے گھبرا کر اپنے اجداد کے روحانی اور مذہبی انداز و روش پر چل پڑے اسی نفسیاتی میلان کے باعث ۱۸۳۵ء میں موصوف نے اپنے وطن (سیتاپور) میں ایک مسجد تعمیر کروائی جو آج تک ان کے نام اور کتبے سے مشہور ہے اور انھیں کی ایماء سے اجمیر میں دارالافتاء قائم ہوا۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد Proceedings of The college of fort Wiliam ـــــ عتیق صدیقی ـــــ صفحہ ۱۵۲ op. cit. 168

۵۲۔ داستان تاریخ اردو صفحہ ـــــ حامد حسن قادری۔ ۵۳۔ ماہنامہ نگار ـــــ اگست ۱۹۳۶ء

۵۴۔ مگر اس تحقیق کو ہم عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے کیونکہ یہ بات تحقیق کی دنیا کی بڑی جانی پہچانی ہے۔ اس سے پہلے مولانا مالک رام قادر انابلوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح سے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل اور گل کرسٹ" کا تحقیقی مسئلہ جمیل نقوی کے مقالے (مشرب۔ جون ـــــ جولائی ۱۹۵۶ء) کو سامنے رکھ کر عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے اسی طرح یہ تحقیق بھی ان کی نہ سمجھی جائے گی۔

"چنانچہ آپ کا انتخاب بحیثیت مفتی اجمیر شریف کے لیے تین سو روپے ماہوار پر ہوا۔ اور آپ نے اس نازک اور اہم کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔"[۱]

اجمیر شریف شہر کلکتے سے زیادہ راس آیا، یہاں مادی اور روحانی فیوض دونوں نعمتیں میسر تھیں۔ اور سکون قلب کیلئے یہ جگہ زیادہ مناسب ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں زیادہ مواد نہیں فراہم ہو سکا۔ قاضی موصوف اپنے قلمی نسخے میں تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کو اس نزاعی عہدے اور جلیل القدر منصب کے کاموں کو ستعدی اور دیانت اور امانت سے انجام دینے کے بعد جو فرصت کا وقت آپ کو ملتا وہ طبابت میں صرف فرماتے تھے۔ اس پیشے میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ آپ کے دست شفا کی دھوم مچ گئی۔ آپ اپنے گھر کے مصارف کے لیے ہر ماہ ایک ہزار روپیہ بھیجا کرتے تھے۔ اس سے قیاس کر لینا چاہیئے کہ وہاں آپ کی کیا آمدنی ہوئی ہوگی؟[۲]

اجمیر میں شیخ اکرام کی حکمت و علم کی دھوم مچ گئی۔ حسن اتفاق سے ان کے والد (مولوی شیخ احسان علی) نے جو ایک عرصے سے مفقود الخبر تھے اپنے لائق بیٹے کا سراغ لگا لیا۔ اس زمانے میں احسان علی حیدرآباد میں تھے۔ آخر رہا نہ گیا اور خون پدری کو جوش آ ہی گیا اور اشتیاق ملاقات کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ اُدھر شیخ اکرام باپ کا خط پاتے ہی مودت پدری سے ماہی بے آب ہو گئے۔ مگر فطرت کو منظور کچھ اور ہی تھا۔ غیب سے ملنے کے اسباب مہیا ہو گئے۔ مگر جب مولوی احسان علی کے لے پالک بیٹے کو علم ہوا تو ڈرے کہ کہیں یہ مال و متاع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ چنانچہ اس حرص و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس لڑکے نے شیخ احسان علی کو زہر دے دیا اور اسی زہر نے قصہ تمام کر دیا۔ اس حادثہ کی خبر سے شیخ اکرام کو بڑا شدید صدمہ ہوا اور کچھ ہی عرصے کے بعد ۱۲۵۳ھ ہجری میں اجمیر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ موصوف کا مقبرہ اجمیر ہی میں تعمیر کیا گیا۔



۱۔ ملاحظہ ہو الناظر یکم نومبر ۱۹۱۵ء
۲۔ قا[illegible]

## احمد فراز

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

کسی کی پرسشِ احوال بھی قیامت تھی
وہ درد دل میں اٹھا جس طرح کٹاری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر ہماری لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

## ریورنڈ مبین مسیحائی

درد سے مانوس جب اپنی خودی ہو جائیگی
عالمِ امکاں کی رونق زندگی ہو جائے گی

کچھ بھی اس اندھیر نگری میں نہ آئے گا نظر
کیا خبر تھی تیز اتنی روشنی ہو جائے گی

یوں ہی میری تشنگی ساقی اگر بڑھتی رہی
بے پیے ہی ایک دن آسودگی ہو جائے گی

جو بھی چاہے بن مگر مفلس نہ بن اس دہر میں
جنسِ ہستی ورنہ داغِ نیستی ہو جائے گی

ہم کو اس ظلمت کے عالم میں بھی ہے اتنا یقیں
آپ گزریں گے جدھر سے روشنی ہو جائے گی

یہ گماں کس نے کیا تھا آدمی کو ایک دن
آدمی سے اس قدر بیگانگی ہو جائے گی

گر نہیں شیریں کلامی، تلخ گفتاری سہی
یہ زباں اک روز وقفِ خامشی ہو جائے گی

وہ بھی دن آئے گا مسیحائی کہ رندوں کے لیے
اس چمن میں جام کھل کے ہر کلی ہو جائے گی

## سعادت نظیر

ستم تو دیکھ! کرم کی کوئی کمی نہ رہی
جب آرزو مرے دل میں سکون کی نہ رہی

ترے فراق نے وہ دردِ جاوداں بخشا
کہ زندگی میں مری اب کوئی کمی نہ رہی

جنونِ شوق نے دونوں سے کر دیا آزاد
کہاں کے دیر و حرم؟ قیدِ بندگی نہ رہی

بھری بہار میں ہے بجلیوں کی زد پہ چمن
کسی بھی پھول کے چہرے پہ تازگی نہ رہی

یہ اضطراب کی دنیا ہے درد و غم کی فضا
اب، اے نشاطِ یاراں! وہ زندگی نہ رہی

ملیں جہان سے نگاہیں تو یہ ہوا محسوس
کہ اب جہاں میں کسی چیز کی کمی نہ رہی

بہار آتے ہی اٹھا دھواں نشیمن سے
یہ کیا کہ شمع جلی اور روشنی نہ رہی

فضا نکھر کے ہوئی جاذبِ نظر لیکن
وہ کیا گئے کہ کسی شے میں دلکشی نہ رہی

نہ کیوں ہو مجھ کو غمِ عشق ہی متاعِ عزیز؟
نہیں خوشی کا بھروسہ رہی رہی، نہ رہی

دیارِ غیر میں سب کچھ سہی، نظیر! مگر
وہ کوئے دوست کی پُر کیف زندگی نہ رہی

# مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

## طنز و تبسم

رضا نقوی واہی
مکتبۂ ادب روڈ نمبر ۵/۱۶ گردنی باغ پٹنہ (بہار)
صفحات ۱۵۲ قیمت ۳ روپے

"طنز و تبسم" واہی کی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ میں "واہیات" کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ان کے تخلص کے اعتبار سے یہ نام بہت ہی اچھا تھا اور اس مجموعہ کا بھی یہی نام ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پہلے مجموعے کو لوگ بھول چکے ہیں۔ "طنز و تبسم" اتنا چبھتا ہوا نام نہیں ہے نہ اس نام میں وہ کشش اور طنز ہے۔

اردو کے مزاحیہ شعرا کی موجودہ نسل میں واہی کا نام جانا پہچانا ہوا ہے۔ ان کے یہاں سید محمد جعفری کا تیکھاپن اور شاد عارفی کی نشتریت نہ سہی مگر فرقت اور دلاور فگار کی طرح عمومیت بھی نہیں ہے۔ ان کو قبول عام تو مل سکتا ہے مگر وہ مقام نہیں مل سکتا جو فکر و مسائل کے توازن اور فن کے ساتھ خلوص اور ریاضت کے ذریعے واہی نے حاصل کر لیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں ہند و پاک کے رسائل و اخبارات میں واہی کی شائع ہونے والی نظموں میں سے منتخب نظمیں شامل ہیں۔ جن میں اینٹیکول 'گویا شاعر' 'نقاد' 'محقق' 'نیڈی گرل' 'انتقال کے بعد' 'پی ایچ ڈی' 'لیڈری کا نسخہ' 'انٹرویو' 'لال فیتہ' 'انٹ گرہ' اور 'اسے میری زبر پائی' اس کتاب کی آبرو ہیں۔ 'جنرل اسپتال' 'مچھروں کا گیت' (مچھروں کا سوراج) 'بلیک مارکیٹ' 'بلیک مارکیٹیر' 'کنٹرول' 'لال فیتہ' 'لیڈری کا نسخہ' اور 'جاگیرداری' ان کے اولیں مجموعہ 'واہیات' سے 'طنز و تبسم' میں شامل کی گئی ہیں۔

مسائل اور رجحانات پر واہی کی نظر خاصی گہری ہے۔ مگر موضوعات کی تکرار ان کے یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔

طنز و تبسم کی لکھائی چھپائی اچھی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ واہی اس مجموعہ پر قابل مبارک باد ہیں۔

## تذکرۂ جگر

محمود علی خاں مرحوم جو اپنے سو شعروں والے سلسلہ انتخاب کے لیے مشہور ہیں۔ جگر مرادآبادی کے مخلصین میں تھے۔ اور ان سے بہت خلوص و یگانگت کے تعلقات رکھتے تھے۔ زیر نظر مجموعہ میں محمود علی خاں نے جگر کی زندگی اور شعر گوئی پر خود اپنے مشاہدات ترتیب دیے ہیں۔ مرتب نے جن حقوق کی بنیادوں پر یہ کام انجام دیا ہے وہ اس کتاب کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

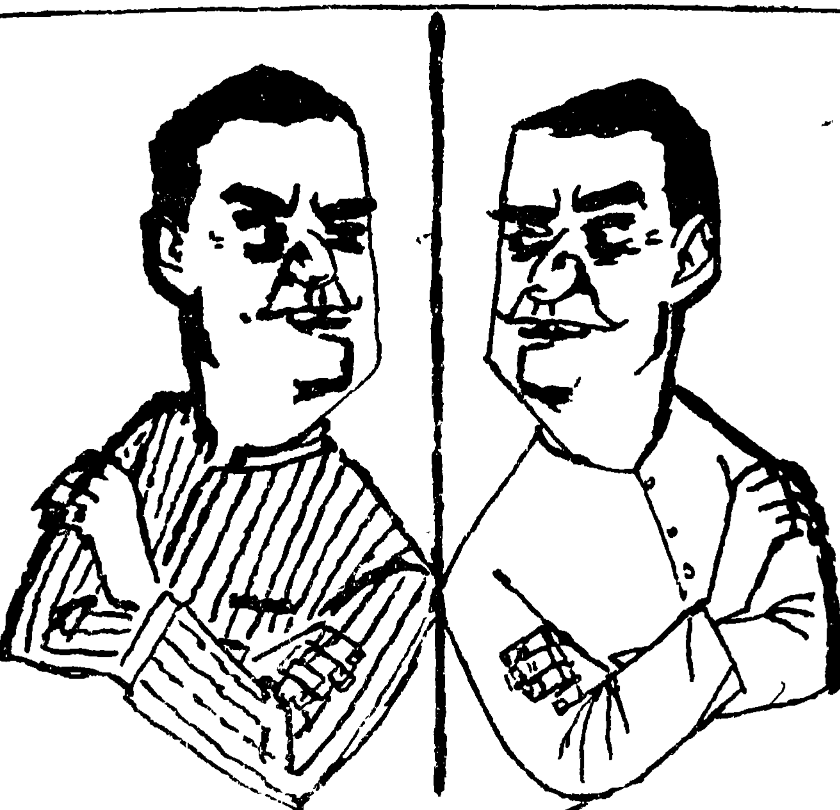
کتاب کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ جگر پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر اور عقیدت مندوں کے لیے عمومی طور پر یہ کتاب باعث کشش ثابت ہوگی۔

کتابت طباعت اور کاغذ تینوں عمدہ ہیں۔ اور کتاب مجلد ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

## فردوس گوش

داغ کے نام لیواؤں میں جوش ملسیانی کا نام ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے اور ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ وہ جدید و قدیم دونوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اس لیے اردو شاعری میں انہیں ایک مناسب مقام حاصل ہے۔ جوش اردو کے پرخلوص پرستار ہیں۔ اور پنجاب میں ان کے دم سے اس زبان کا بول بالا ہے۔

جوش ملسیانی کی شاعری کا انتخاب مرکز تصنیف و تالیف نکودر نے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت چھ روپے ہے۔ اور ناشر ہی کے پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہر اردو دوست کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔



# مقابلہ نہ کیجیے

ہمارا مقابلہ پڑوسیوں سے کیا جائے، ہم میں سے بیشتر اس بات کو پسند نہیں کرتے یہی بات میٹرک باٹوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

میٹرک باٹوں کی خوبیوں کو پہچانیئے ان کا استعمال ان کی موجودہ شکلوں ہی میں کیجئے جیسے ۱۰۰ گرام، ۲۰۰ گرام، ۵۰۰ گرام اور ۱ کیلوگرام وغیرہ۔ جبھی آپ میٹرک نظام کا پورا پورا فائدہ اٹھا پائیں گے۔

میٹرک اوزان کا جوڑ توڑ کر کے من سیر کا حساب نہ لگائیے۔
اس میں آپ کا وقت ضائع ہوگا اور لین دین میں اکثر نقصان رہے گا۔

سہولت اور واجبی لین دین کے لئے

## مکمل اکائیوں میں

# میٹرک باٹوں

کا استعمال کیجیے ....

..D.NO. A—466
..GAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
..GISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

42ND YEAR OF PUBLICATION
OCTOBER 1963

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۶۶
جموں کشمیر کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

# نگار

اپریل ۱۹۶۴ء

مدیر اعلیٰ

اکبر علی خاں

معاونین

مظفر حنفی

سلطان اشرف

زر سالانہ
دس روپے

فی پرچہ
۷۵ پیسے

نگار بک ایجنسی رامپور

داہنی طرف کا سرخ صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا۔

جلد (۴۳) | فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۴ء | شمارہ (۴)



# غالب کا الحاقی کلام

## اس موضوع پر نادم سیتاپوری ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں

## جولائی ۶۴ء کے شمارے میں یہ مکمل کتاب ملاحظہ فرمایئے

## منیجر نگار رامپور یوپی

## تاریخ نمبر جیسی اہم دستاویزی پیشکش کے بعد

### ادارہ ماہنامہ نگار رامپور۔ یوپی

## دو اور عظیم خاص نمبر پیش کر رہا ہے جنھیں نسلوں نہیں بھلایا جا سکے گا

# شاد عارفی نمبر

جو اردو کے اس منفرد تیکھے طنز گو شاعر کے انتخاب کلام خطوط اور شخصیت و فن پر مضامین کا بھرپور مجموعہ ہوگا۔ اگر آپ بھی شاد عارفی کے خطوط مہیا کر سکیں یا ان کی زندگی اور فن سے متعلق کچھ لکھنا چاہیں تو جلد از جلد نگار رامپور کو ارسال کیجئے۔

**چند لکھنے والے :۔** • پروفیسر آل احمد سرور • پروفیسر فراق گورکھپوری • پروفیسر احتشام حسین • پروفیسر مجنوں گورکھپوری • احمد ندیم قاسمی • محمد طفیل • مظفر علی سید • مولانا ماہر القادری • ظ انصاری • خلیل الرحمن اعظمی • ڈاکٹر خلیق انجم • مظفر حنفی • مسعود اشعر • گوپال متل • مخمور سعیدی • کوثر چاندپوری۔ اور بہت سے دوسرے۔

# نگار کے مندرجات کا اشاریہ نمبر

مرتبہ :۔ سعدیہ حفیظ و خالدہ عباسی

نگار کا اجرا ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا جب سے اب تک تقریباً نصف صدی کے عرصہ میں اس کے صفحات پر الٰہیات سے جنسیات تک سیکڑوں موضوع زیر بحث آئے ہیں، ملک کے سارے مشاہیر ادب نگار میں لکھتے رہے ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایک تفصیلی اشاریہ ان تمام تحریروں کا مرتب کیا جائے تاکہ اصحاب ذوق کو اپنی مفید مطلب تحریر تک رسائی میں دشواری نہ رہے ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بیحد مسرت ہے کہ نگار رامپور جلد ہی ایک مخصوص شمارہ اس مقصد کے لئے وقف کر رہا ہے۔ یہ اشاریہ صرف فہرست نہیں ہوگا بلکہ اسمیں مضامین کے مطالب کا خلاصہ بھی شامل ہوگا گویا اس نمبر کی صورت میں نگار کی نصف صدی کی تحریریں مختصر اسمٹ آئیں گی اس طرح یہ کام مفید سے مفید تر ہو گیا ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور لائبریریوں کے لئے یہ نمبر بیحد ضروری ہوگا۔

---

**مینیجر ماہنامہ نگار رامپور یوپی**

# دیوانِ ناسخ کا ایک نادر مخطوطہ

نیاز علی خاں عرشی

ابھی حال میں رضا لائبریری کے لیے شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی متوفی ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ خریدا گیا ہے۔ کلیات ناسخ (ص ۳۹۸ مطبع مولائی لکھنؤ ۱۲۰۰ھ حسب فرمائش شاہزادہ فرخندہ بخت بہادر) کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے تین دیوان ہیں۔ ان کا پہلا دیوان ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷-۱۸۱۶ء) میں مرتب ہوا تھا اور اس کا تاریخی نام "دیوان ناسخ" ہے۔ دوسرا دیوان الہ آباد کی نظر بندی کی پریشانی کے زمانے میں ترتیب گیا تھا۔ اس کا تاریخی نام "دفتر پریشاں" ہے۔ جس سے ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۳۰ء) نکلتا ہے۔ تیسرا دیوان ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹-۱۸۳۸ء) میں انجام کو پہنچا۔ اور اس کا تاریخی نام ناسخ کے شاگرد دبیر علی وسید رشک نے "دفتر شعر" تجویز کیا۔

زیر بحث مخطوطے کا ان تینوں دیوانوں سے مقابلہ کرنے پر واضح ہوا کہ یہ نسخہ ناسخ کے دوسرے دیوان کا ہے۔ جیسا کہ آئندہ بیان سے معلوم ہوگا۔ یہ مؤلف کا مسودہ ہے اس لیے ہے حد قابل تسلیم سمجھے جانے کا مستحق ہے۔

اس مخطوطے کا ناپ ۱۲×۱۷ سینٹی میٹر ہے۔ ہر صفحے میں ۱۳ سطریں ہیں۔ متن کے ورقوں کی تعداد ۱۶۷ اور شروع میں شامل فہرست اشعار کے اوراق کی تعداد ۸ ہے۔ جس کا مجموعہ ۱۷۵ اوراق ہوتا ہے۔ لیکن اس فہرست سے پتا چلتا ہے کہ اصل میں اوراق کی تعداد ۲۰۸ تھی کیونکہ ورق ۲۰۷ پر جو غزل شروع ہوئی ہے، ورق ۲۰۸ پر اس کا اختتام ہوتا ہے اور فہرست اشعار میں اس کے بعد کسی صفحے کا حوالہ نہیں ملتا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کتاب میں اس سے زائد ورق نہ تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ورق ۲۰۹ بعد پر حرف الف کی کچھ غزلیں ہوں۔[1]

چونکہ فہرست اشعار کا پہلا ورق غائب ہے۔ اس لیے ان کا حوالہ دست رس سے باہر ہے۔

دیوان کا خط صاف اور رواں نستعلیق ہے۔ روشنائی کالی استعمال کی گئی ہے۔ لیکن تخلص شنجرف سے لکھا گیا ہے۔ فہرست اشعار میں عنوان اور اوراق کے ہندسے بھی شنجرفی ہیں۔ کاغذ دیسی بانس کا ہے۔ پوری کتاب پر کرم خوردگی اور آب رسیدگی دونوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ جلد شکستہ اور ورق بے شیرازہ ہو گئے ہیں۔ ورق ۱۳ ب اور ۱۰۱ ب پر ایک ہلکی سی مہر ثبت ہے۔ جس میں بخط نستعلیق "مامن شاہ خاں" منقوش ہے۔

ورق ۹ ب سے ۶۲ الف تک ردیف وار غزلیں مندرج ہیں۔ یہ ردیفیں ا، ت، د، ذ، ر، ز، ط، ظ، ع، ن، ہ اور ی کی ہیں۔ ورق ۶۲ الف کی سطر ۱ سے آخر تک ردیفی ترتیب مفقود ہے۔ مثلاً اس صفحے پر یہ غزل مندرج ہے "باغ میں اک بار اگر وہ لالہ رو ہو جائے گا" اور اس کے مقابل یہ غزل ہے: "فامد اکبھ دیکھو اتنا ہی اس گراد سے" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخے کی جتنی غزلیں ردیف وار ہیں وہ کسی اور بیاض سے نقل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کہا گیا وہ ترتیب نظم کے مطابق لکھا جاتا رہا۔

شاہ حاتم کے دیوان زادہ اور دیوان غالب اردو کے بعد ناسخ کا دیوان دوم تیسری کتاب ہے جس کی اکثر غزلوں کو اس نسخے کی مدد سے تاریخی ترتیب پر مرتب کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا دیوان کے سادہ اوراق کی تعداد ۲۰۸ یا اس سے کچھ ہی زائد تھی۔ اس لیے جب سادہ صفحے ختم ہو گئے تو نئی غزلیں حاشیوں پر لکھی جانے لگیں۔ ناسخ کے بارے میں آزاد دہلوی نے آب حیات (ص ۳۵۵ طبع لاہور بار دوازدہم) میں لکھا ہے کہ دو تین خوشنویس ان کے ہاں ہمیشہ نوکر رہتے تھے اس لیے متن و حاشیہ دونوں کی کتابت انھیں حضرات کے قلم کی ہوگی۔

---

[1] اس نسخے میں اوراق ۲۴، ۴۰، ۴۹، ۴۴، ۵۴، ۹۳، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۰۳، ۲۰۶ کم ہیں۔

اس نسخے کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ناسخ نے اسے مرتب کرنا چاہا تو نقل کرنے والے کی سہولت کے لیے ردیف وار فہرست مرتب کر کے شروع میں لگا دی جس میں ہر غزل کا مصرعِ اول لکھ کر اس کے اوپر شجرف سے اس صفحے کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ جس پر وہ غزل مندرج ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ اس میں ہر ردیف کی غزلوں کو تاریخی ترتیب کے مطابق نقل کرایا جاتا۔ مگر ایسا عمل میں نہیں لایا گیا۔ اور کسی اور مصلحت کی بنا پر جو ہم رنگی یا ناہمواری ہو سکتی ہے، ترتیب قطعاً غیر تاریخی ہو گئی۔

بہ ظاہر نسخۂ مطبوعہ کی ترتیب غزلیات کو ہمارے مخطوطے کی ترتیب کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ناسخ یا ان کے کسی شاگرد نے اس میں کسی قدر رد و بدل کر دیا ہے جس کی وجہ سے مطبوعہ کی ترتیب، تاریخی ترتیب سے دور ہو گئی ہمارے مخطوطے کی رو سے ناسخ کے دوسرے دیوان کی غزلوں کی ردیف وار تاریخی ترتیب کیسی ہو گی۔ اس کو بتانے کے لیے صرف ردیف الواو کی غزلوں کو بہ طور نمونہ پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ پری جہاں میں نہ جنت میں حور عیں دیکھو　　ورق ۳۷ الف
۲: تشبیہ دے ہلال سے ابروئے یار کو　　ایضاً
۳: آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
۴: یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ　　ورق ۶۸ الف
۵: ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ　　ورق ۷۲ ب
۶: میرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ　　ورق ۷۳ الف
۷: خط سبز رنگ یہ گالوں پہ نہیں، دھیان کرو　　ورق ۸۱ ب
۸: دو شب تار سے تشبیہ ہمارے دن کو　　ورق ۸۴ الف
۹: بزم میں پاتا نہیں جو ساقی گلفام کو　　ورق ۸۷ الف
۱۰: مجھ کو عریانی میں کیا ہو پیرہن کی آرزو　　ورق ۹۴ ب
۱۱: بیان کیا ہو جو ہے جسم دل ربا کی بو　　ورق ۹۶ الف
۱۲: جو اس پری سے شب وصل میں رکاوٹ ہو　　ورق ۱۰۱ الف
۱۳: خود بنتے ہو اغیار سے سنواتے ہو مجھکو　　ورق [illegible] الف
۱۴: چھڑ گئے جو میرے نالوں کے شرارے رات کو　　ورق [illegible] الف
۱۵: فزائے گلرنگ ہے فلک ہم کو　　ورق [illegible] ب
۱۶: چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو　　ورق ۱۱۲ الف
۱۷: ملتے ہو جب نہ تب میرے دل بے تاب کو　　ورق ۱۴۳ الف
۱۸: کس قدر نفرت ہے اس کے توسن چالاک کو　　ورق ۱۴۳ ب

مطبوعہ نسخے میں ان کی ترتیب حسب ذیل ہے،

۱-۲، ۴، ۵، ۶، ۴، ۷، ۸، ۱۰، ۹، ۱۱، ۱۳، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷۔

دوسری ردیفوں میں ان دونوں نسخوں کی ترتیب اور بھی زائد مختلف ہے۔

اس مخطوطے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اپنے دیوان میں کیا رد و بدل کیا ہے۔ کون سے شعر مطبوعہ نسخے میں دانستہ یا نادانستہ شامل نہیں کیے گئے۔ اور کون کون سے شعر یا غزلیں حاشیوں میں بڑھائی گئی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند باتوں کا تذکرہ کیا جا رہا

سلہ یہ غزلیں مخطوطے میں بوجہ نقصان اوراق موجود نہیں فہرست اشعار سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علی الترتیب مخطوطے کے ان اوراق میں مندرج تھیں ۵۰، ۵۱
[illegible]

## الف اصلاح و ترمیم

۱: ورق ۱۱ب کا ایک شعر پہلے تھا:

تو نے جو پانی پیا ہے اے بتِ شیریں دہن    آبخورے میں مزا ہے کوزۂ فصّاد کا

اس کے دوسرے مصرع میں اصلاح کی ہے "آبخورے میں ہے عالم"۔ مطبوعہ میں یہی مرقوم مصرع چھپا ہے۔

۲: اسی صفحے پر متن میں ایک شعر ہے۔

تمام عمر بسر ہوگئی یونہی میری    شبِ فراق گئی پر دو انتظار آیا

اس کے پہلے مصرع پر سُرخ روشنائی سے لفظ "بدلہ" لکھ کر ترمیم کی: "تمام عمر یونہی ہوگئی لب اپنی"۔ مطبوعہ میں اصلاح کے مطابق مصرع چھپا ہے۔

۳: ورق ۲۶ الف پر ایک شعر متن میں ہے:

مر کے جاؤں جو خلد میں بالفرض    ہو سفر کا عذاب اے قاصد

"بالفرض" پر نسخے کا "ن" لکھ کر حاشیے میں "بشکِ" کر دیا ہے۔ جو مطبوعہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

۴: ورق ۲۶ب پر متن میں ہے:

اضطراب سے انتظار کہتا    ہے تو ہی مر گیا ہو قاصد

حاشیے میں انتظار کی جگہ "اضطراب" لکھا ہے اور یہی مطبوعہ میں ہے۔

۵: ورق ۳۴ الف پر ایک شعر ہے:

تشنۂ دیدار ہوں تو سمجھتا ہے مجھے    کر رہا ہے قتل قاتل خنجرِ آب سے

متن اور حاشیے میں "ن" لکھ کر قتل کی جگہ "ذبح" بنایا گیا ہے یہی قرأت مطبوعہ میں بھی ہے۔

۶: ورق ۴۶ب پر ہے:

مرے کمر نظر نہیں آتا تو کیا کروں    تعریف وہ نہ کی ہے تو سے بال بال کی

حاشیے میں پہلے مصرع میں نسخہ یوں لکھا ہے۔ "تیرے کمر نظر ہی نہ آئے تو کیا کروں" مطبوعہ میں مصرع کی یہی شکل ملتی ہے۔

۷: ورق ۶۵ب پر ایک شعر ہے:

دیکھے گا اے حنیف تاثیرِ ایام بہار    کم نہیں گلگشت جو جنگل میں شگفتہ ہوا ہے

مصرع اول کے لفظ "دیکھے گا" پر نسخہ لکھا ہے "دیکھنا" مطبوعہ میں یہی لفظ ملتا ہے۔

۸: ورق ۱۲۲ الف میں مقطع سے پہلے یہ شعر تھا:

کنکری پہنے گلے میں کافر کے    دیکھیے جب ہے تان ہونٹوں پر

اسے قلمزد کر کے حاشیے میں لفظ "قطعہ" کے تحت یہ شعر اضافہ کیا:

دانتوں پر ہے بہار مستی کی    رنگ لایا ہے پان ہونٹوں پر

اس عمل سے مقطع قطع بند ہوگیا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس شعر کو قلمزد شعر سے پہلے لکھا گیا اور اسے تین بر فرد رکھا گیا ہے۔

۹: ورق ۱۴۱ الف پر ایک شعر متن میں یوں تھا۔

تم چھپر کھٹ میں ہم جنازے پر    سیکھے ہیں خوب ڈھنگ سونے کا

حاشیے میں دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ یوں بدل دیے ہیں۔ کیا نکالا ہے رنگ۔ مطبوعہ میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں۔

۱۰: ورق ۱۴۹ پر ایک شعر ہے:

حیراں ہوں کیوں ہاتھ ترے بن گئے شعلے  کہتے ہیں کہ تاثیر ہی ہوتی ہے حنا سرد

حاشیے میں دوسرے مصرع کو بہ طور نسخہ یوں لکھا ہے: "کہتے ہیں اطبا کہ ہے تاثیر حنا سرد"۔ یہ اصلاح مطبوعہ میں شامل نہیں، اس لیے قابل قدر ہے۔

۱۱: ورق ۱۵۶ الف پر ایک شعر ہے:

آپ اگر اپنی عبادت کرتے ہیں اے خود پرست  سر جھکا مینار مسجد کا نہ کیوں محراب میں

حاشیے میں مصرع ثانی کا نسخہ تجویز کیا ہے: کیوں نہ مسجد کا منارا خم ہوا محراب میں۔

مطبوعہ میں دوسرا مصرع اصلاحی شکل میں ہے۔ نیز اس میں "خود پرست" ہے۔

## ب: تشریحات الفاظ

۱: اس مخطوطے کے حاشیے میں کچھ دلچسپ تشریحیں بھی مندرج ہیں۔ چنانچہ ورق ۷ ب پر ایک شعر ہے:

عہد طفلی میں بھی تھا غم ہی تفکر اپنا  مانگتا تھا کوئی ادھا نہ کبھی یاری کا

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر یہ تشریح مندرج ہے:

"ادھا نام بازیست کہ ہرگاہ طفلے چیزے خورد، دیگر طفل کہ ادھا بستر است بگوید کہ ادھا بدہ، پس آں را واجب شد کہ ازاں چیز نصف بحریف خود بدہد و چوں آں طفل کہ چیز میخورد اولاً بحریف خود گوید کہ — ادھا کھاؤں دا دھا نہ دوں۔ پس چیز بحریف نمی دہد و تمام میخورد ۱۲۔"

دیوان مطبوعہ میں یہ شعر اور تشریح دونوں شامل نہیں، اس لیے دلچسپ بھی ہیں اور اہل لغت کے لیے بھی مفید۔

۲: ورق ۹۵ الف پر ایک شعر ہے:

پھوٹ نکلی ہے سویدا کی جو رنگت اے چشم  صاف آتا ہے نظر بایاں ترا پہلو سیاہ

حاشیے میں لکھا ہے "یعنی پہلوی چپ"۔

۳: ورق ۱۱۰ الف کا پہلا شعر ہے:

جائے دنداں لب سوفار ہوئے اے قاتل  دہن زخم سے ہوگا نہ ترا تیر جدا

اس موقع پر "جائے دنداں" کے لیے حاشیے میں لکھا ہے "درعرف ہند مسوڑہ گویند"۔

۴: ورق ۱۱۱ الف پر یہ شعر ہے:

تیرے سر پر جس طرح ہے ابر کا سایہ مدام  میرے سر پر ہو یوں ہی سایہ تری دیوار کا

اس شعر کے لفظ "تیرے" پر سرخ روشنائی سے ایک کا ہندسہ لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے: یعنی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

## ج: اضافہ اشعار

مخطوطے کے حاشیوں میں جو شعر بڑھائے گئے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:-

۱: ورق ۱ ب کے حاشیے میں یہ شعر بڑھایا ہے:

یہ صفائی یہ لطافت جسم میں ہوتی نہیں  تم نے جو دل میں چھپایا آشکارا ہو گیا

مطبوعہ میں اس کا دوسرا مصرع یوں ہے۔ تم نے جو دل میں لیا وہ آشکارا ہو گیا۔

۲: ورق ۸۲ الف کے حاشیے میں یہ شعر لکھا ہے:

نامۂ جاناں کے پڑھنے سے جو دیکھا خوش مجھے    نامہ بر بولا کہ ہو پروانگی انعام کی

متن میں جو علامتِ سقوط لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرِ مذکورہ کا اضافہ اس شعر کے پہلے ہونا چاہیئے؛

لکھوں سر نامے پہ اپنا نام اگر میں قاصدا    خط ہی گم ہو ایسی ہے تاثیر میرے نام کی

مطبوعہ نسخے میں ایک تو حاشیے کا شعر شامل نہیں کیا گیا، دوسرے "لکھوں سر نامہ پہ الخ" کا دوسرا مصرع یوں مندرج ہے:

"خط بھی گم ہو ایسی ہے تاثیر میرے نام کی۔"

۳: ورق ۸۸ ب پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

اے سحر اب اپنی نورانی دکھا صورت ہمیں    کیسی کالا منہ دکھائی ہے شبِ فرقت ہمیں

اس مطلع کے بعد علامت سقوط لکھ کر حاشیے میں یہ تین شعر درج کیے گئے ہیں:

ہجر میں اپنی نظر آئی عجب صورت ہمیں    آئنے کو دیکھتے ہی ہوگئی حیرت ہمیں

ہجر میں کٹ کر کلیجہ گر پڑے گا منہ کی راہ    زہر کا ہے گھونٹ[1]، ساقی، بادۂ عشرت ہمیں

قد جھکا جاتا ہے اپنا مثلِ طوق اے فاختہ    یاد رہتا ہے جو وہ سرو سہی قامت ہمیں

یہ تینوں شعر باوجود اس کے کہ غزل کے اچھے شعروں کی ٹکرے ہیں، مطبوعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے اس لیے حد قابلِ قدر ہیں

۴: ورق ۹۱ الف کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے:

جیتے جی آئے ہمارے ہاتھ ہے امرِ محال    کم نہیں مکتوبِ جاناں نامۂ اعمال سے

مطبوعہ سے یہ شعر بھی خارج ہے۔

۵: ورق ۹۴ ب کے حاشیے میں ایک شعر یوں لکھا ہے:

گنبدِ مدفن مرے شکلوں میں یوں ہے بعد مرگ    بلبلے پڑتے نظر آتے ہیں جیسے آب پر

مطبوعہ میں بجائے "پڑتے" کے "ترتے" ہے، جو بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔

۶: ورق ۹۵ ب کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے:

سبزہ ہے، گل ہیں گھڑی ہے دونوں پر کافی گھٹا    رنگ خط ہے سبز، چہرہ سرخ ہے، گیسو سیاہ

مطبوعہ میں پہلے مصرعے کے اندر بجائے گھڑی کے کھڑی ہے جو بظاہر گھڑی معلوم ہوتا ہے۔

۷: ورق ۱۰۰ الف کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے:

گور میں سونے کو ہوتا ہوں جو کہتا ہے کوئی    آج میرے خواب میں آئے وہ بارے رات کو

مطبوعہ میں یہ شعر بھی نہیں ہے۔

۸: ورق ۱۱۰ الف کے حاشیے میں یہ شعر ہے:

جب جدائی کے مضامین مجھے سوجھتے ہیں    حرف سے حرف ہوا ہے دمِ تحریر جدا

مطبوعہ میں "سوجھے" ہے جو بالفحیح ہے یا اصلاح ہے۔

۹: ورق ..... کے حاشیے میں یہ دو شعر درج ہیں:

جو چنتے ہیں پیشانی پر آپ افشاں    یہ صفحہ مطلاّ ہوا چاہتا ہے

نظارہ کیا ہے یعقوب کو عشقِ یوسف    کنواں بھی تو اندھا ہوا چاہتا ہے

مطبوعہ میں علاوہ ترتیب کے اختلاف کے دوسرا شعر موجود نہیں۔

---

[1] اصل میں "گونٹ" لکھا ہوا ہے

۱۰: ورق ۱۲۷ الف کے حاشیے میں یہ شعر ملتا ہے:

کیا بہار آئی ہے؟ جو موج ہوا کے بدلے　　تار اڑتے نظر آتے ہیں گریبانوں کے

شعر خوب تھا، مگر کسی وجہ سے شامل دیوان مطبوعہ نہیں کیا گیا۔

۱۱: ورق ۱۲۸ الف، ۱۳۰ ب، ۱۳۲ الف، ۱۳۸ الف، ۱۵۳ الف، ۱۵۵ ب، ۱۵۸ الف، ۱۶۰ الف کے حاشیوں میں علی الترتیب یہ شعر مندرج ہیں، اور سب کے سب مطبوعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں:-

یاد ہر دم ہے وہی کاکل خم دار مجھے　　کیوں نہ ہو جائے بھلا موج نفس مار مجھے

سوکھا میں غم سے باغ میں آیا نظر جو خار　　بیمار ہوں میں، نرگس بیمار دیکھ کر

تو دیکھ کے خوش ہو تو ابھی لخت جگر سے　　ہر ایک مژہ کو کرے پھولوں کی چھڑی آنکھ

تجھے تو ہول ہے کا فر تجھے دھولنڈی ہے　　غبار دشت جدا ہے، تراگلال جدا

تو سرخ ہے خوں سے، پر نہ شیریں　　غم سے ہوئی ہائے، کوہکن، زرد

فرقت محبوب میں جس شب اچٹ جاتی ہے نیند　　آتے ہیں کیا کیا خیال اپنے دل بیتاب میں

یوں تصور ترے پلکوں کا دل روشن میں ہے　　جیسے ہوں تار شعاعی مہر عالمتاب میں

کروں میں ذکر نہ کیوں بار بار مچھلی کا　　نہیں وہ کھیل رہے تھے شکار مچھلی کا

جڑاؤ مچھلی تری یاد آگئی مجھ کو　　کیا شکار اگر نفس دار مچھلی کا

قہر ہو دہ بت نازک جو کرے بادہ کشی　　بوسے انگور سے ہوتا ہے وہ اکثر بیہوش

د: **اضافۂ غزلیات** مخطوطے میں حسب ذیل غزلیں حاشیوں میں اضافہ کی گئی ہیں:

۱: کیا گزر اس کے دہان تنگ سے ہو بات کا　　(ورق ۱۳ الف)

اس کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع مخطوطے میں یوں ہے: "یاد آیا لطف، اے گل مجھ کو تیری بات کا" مطبوعہ میں اسے بدل دیا گیا ہے: "مجھ کو اے گل، لطف تیری بات کا"

مخطوطے میں تیسرا شعر ہے:

روتے روتے ہم ذرا تڑپے تھے بالائے زمیں　　کہتے ہیں سب قہر تھا یہ زلزلہ برسات کا

مطبوعہ میں "یا زلزلہ" چھپا ہے:

مخطوطے کا ایک شعر ہے:

ہڈیاں میری سگ جاناں کو پہنچا دے کوئی　　بعد مرُدن بھی ہے ظالم بھیجنا سوغات کا

مطبوعہ میں بجائے "ظالم" کے "لازم" ہے۔

مخطوطے میں مقطع اس طرح ہے:

نفی اپنی کو لے اول بعد اثبات حبیب　　ہے عبث یہ شغل ناسخ نفی اور اثبات کا

مطبوعہ میں بجائے "اول" کے "پہلے" ہے۔

۲: ورق ۱۵ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے جس کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے:

"تیرے گیسو میں تے مکھے جوشش سودا ہو گیا۔" اس غزل کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کے الفاظ مخطوطے میں یہ ہیں

"شاہ جنات الیسار دیا شاہ دریا ہو گیا"

مطبوعہ میں "شاہ جنہ" مندرج ہے

مخطوطے میں ایک شعر ہے

نقش ہیں تسخیر دل کے واسطے نقش قدم — سایہ تیرا اے پری جادو کا پتلا ہو گیا

مطبوعہ میں تسخیر دل کی جگہ "تسخیر دان" ہے۔

۳، ورق ۲۴ ب کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، جس کا ایک شعر مخطوطے میں یوں ہے۔

رہ گیا میں مسوس کر دل میں — کب میسر مجھے مساس ہوا

مطبوعہ میں "دل کو" ہے۔

۴: ورق ۵۰ الف کے حاشیے میں جو غزل ملتی ہے، اس کا ایک شعر ہے:

بے شبہ پڑ گیا ہے، دلا، عکس موئے سر — آئینہ جبیں میں یہ چین و شکن نہیں

مطبوعہ میں "پیچ و شکن" چھپا ہے۔

دوسرا شعر ہے:

کیوں ہو گیا ہے روز جدائی مجھے پہاڑ؟ — عاشق تو ہوں ضرور دلے کوہکن نہیں

مطبوعہ میں "دلے" کی جگہ "مگر" ہے

۵: ورق ۷۶ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، اس کا شعر ہے:

طفلی سے ہے یہ شوق شراب آب کی مانند — گھٹی مری پیری میں بھی زنہار نہ چھوٹی

مطبوعہ میں پہلا مصرع یوں ہے "طفلی سے ہی ہے شوق شراب"

اسی غزل کا ایک شعر ہے،

نبضیں بھی مری چھوٹ گئیں منتظری میں — مہندی ترے پاؤں کی مگر یار نہ چھوٹی

یہاں "انتظار" کی جگہ "منتظری" کا استعمال اہل لغت کے لیے دلچسپ ہے۔

۶: ورق ۱۰۴ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، اس کا مطلع ہے:

فرقت ساقی میں کیا مینا و ساغر توڑیے — خشت پائے خم سے اپنا کاسۂ سر توڑیے

مطبوعہ میں "خشت ہائے خم" ہے۔

اس کا ساتواں شعر مخطوطے میں یوں ہے:

انتظار صبح میں مر مر کے کاٹی ہم نے رات — اشتیاق شام میں اب جان دن بھر توڑیے

مطبوعہ میں "ہم نے" کی جگہ "میں نے" ہے۔

مخطوطے میں گیارھواں شعر ہے:

عکس جاناں کا ادب ہے، ورنہ تیرا آہ سے — آئینہ کیسا؟ ابھی سد سکندر توڑیے

مطبوعہ میں "کیا ہے" ہے۔

۷: ورق ۱۱۳ الف کے حاشیے میں جو غزل درج ہے، اس کا دوسرا شعر ہے:

بے گداز دل نہیں ممکن کہ ہو سیر و سلوک — دیکھا زاہد، روانی آب آہن میں نہیں

مطبوعہ میں "سبز سلوک" ہے
ایک اور شعر ہے:

کس کو یاں تیرے سوا پہنچا سکے کوئی گزند  کون ہے وہ اے اجل جو تیرے جوشن میں نہیں

مطبوعہ میں پہلا مصرع یوں ہے:

کس کو یاں پہنچا سکے تیرے سوا کوئی گزند

۸: ورق ۱۳۰ الف پر جو غزل ہے اس کا دوسرا مطلع ہے:

کیا ہے پرواجلے، یا عالم رہے  تو ہے جب تک ساتھ تیرے دم رہے

مطبوعہ میں دوسرا مصرع ہے:

تو ہے جب تک ساتھ تیرے ہم رہے

۹: ورق ۱۶۶ الف کے حاشیے میں ایک غزل ہے اس کا مطلع ہے:

کیسے شب وصل آئے مرے شام و سحر ساتھ  گھڑیالیوں نے دونوں بجائے ہیں گجر ساتھ

مطبوعہ میں مطلع اس طرح ہے:

کیسے شب وصل آئے نظر شام و سحر ساتھ  گھڑیالیوں نے دو دو بجائے ہیں گجر ساتھ

ایک اور شعر ہے:

منہ آئینے میں اس نے جو دیکھا تو میں بولا  کیا حسن ہے؟ طالع جو ہوئے شمس و قمر ساتھ

مطبوعہ میں بجائے "میں بولا" کے "وہ بولا" ہے
ایک اور شعر ہے:

وہ سرو جو ہوتا ہے خراماں روشوں پر  سائے کی طرح پھرتے ہیں گلشن میں شجر ساتھ

مطبوعہ میں "گلشن کے شجر" ہے۔

اس نسخہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے، تو اور بھی بحث کے گوشے نکلیں گے، جو ناسخ اور کلام ناسخ کے سلسلے میں دلچسپ اور مفید نتائج کے حامل ہوں گے۔

# سودا کے شہر آشوب

ڈاکٹر خلیق انجم

شہر آشوب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے کسی عہد میں کوئی پابندی نہیں رہی۔ رباعی، مخمس، مثنوی اور مسدس [ہیئتو]ں میں شہر آشوب ملتے ہیں۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے ہم شہر آشوب کا تعین کر سکتے ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں نے جو شہر آشوب [لکھے] ہیں ان میں مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی کا بیان ہے۔ کسی سیاسی حادثے کا ذکر کیا گیا ہے یا ماضی کی خوش حالی، عیش و عشرت، آسودگی اور ذہنی سکون کا ماتم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شہر آشوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "دراصل کسی نظم کا شہر آشوب [کی ص]نف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف یا شرائط موجود ہوں۔ اولین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر [یا] ملک کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو۔ علی الخصوص کاریگروں اور پیشہ وروں کا ذکر۔ دوسری صفت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال [ک]ی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجلسی پریشانی کا ذکر ہو۔ ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی مگر بعد میں دوسری صفت [بھی] شہر آشوب کے ساتھ لازم سی ہوگئی۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیان کی ہوئی یہ تعریف جامع نہیں ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد بہت سے شہر آشوب ایسے لکھے گئے ہیں۔ جن میں سیاسی [و] مجلسی پریشانی کی بجائے خود حادثے کا بیان کیا گیا ہے۔ پھر سودا کا قصیدہ تضحیک روزگار جو ایک گھوڑے کی ہجو ہے کسی طرح بھی شہر آشوب [س]ے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال فولادی خاں کی ہجو کا ہے۔

میرے خیال سے شہر آشوب کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ نظم جس میں کسی سیاسی حادثے کی تفصیل بیان کی جائے یا اقتصادی بدحالی کا ذکر [کیا] جائے۔ یا سیاسی ابتری اور فساد نظم کے فقدان کا ماتم کیا جائے یا اس زمانے کا ماتم کیا جائے جب خوش حالی تھی ہر طبقے کی مالی حالت اچھی تھی۔ [ہر ط]رف خوشی و انبساط کے ترانے گونجتے تھے۔ زندگی عیش و عشرت میں گزرتی تھی۔ ملک کے انتظام میں ضبط و نظم تھا۔ شرفا اور مزدوروں پر [بہ]ت بھاری نہیں تھی اور ذہن فکر غم دوراں سے آزاد تھے۔ ابتدائی عہد کے شہر آشوبوں میں اقتصادی بدحالی کا ذکر پیش ور کیا گیا ہے۔ [بع]د میں یہ قید بھی نہیں رہی۔ بلکہ اسی زمانے میں بھی شہر آشوب ایسے لکھے گئے جو اس قید سے آزاد تھے۔

سودا کے معاصرین میں شاہ حاتم، شاکر ناجی، میر خاں کمترین، میر تقی میر، قیام الدین قائم، رنگین اور لچھمی نراین شفیق وغیرہ نے شہر آشوب [لکھے ہی]ں۔ سودا کی چار نظمیں شہر آشوب کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔ (۱) قصیدہ شہر آشوب (۲) مخمس شہر آشوب (۳) قصیدہ تضحیک روزگار (۴) مثنوی [در ہجو] شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد۔

[اور]نگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت میں جو زوال پیدا ہوا تھا اس نے قوم کی زندگی کو بے رونق کر دیا تھا۔ یہ شہر آشوب انہی حالات کی [عک]اسی کرتے ہیں۔ پہلے شہر آشوب میں سودا نے مختلف [illegible] کی ہے۔ [illegible] سودا کو [illegible] چاہیے جس میں آمدنی کی صورت ہو۔ سپاہ گری معزز ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس عہد میں [illegible] کہ بہت برا حال تھا۔ اگر [ک]سی گھوڑے لے کر کسی کا ملازم بھی ہو جائے تو گھوڑے کے [illegible]

گھوڑے لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

امرا کی خود مالی حالت خراب ہے۔ وہ تنخواہ دیں تو کیسے؟ لیکن جن ملازمین کے جسم میں جان ہے وہ دھونس دیتے ہیں۔ آقا کی بے غرضی کرتے ہیں اور مختلف حربے استعمال کرکے اپنی تنخواہ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن کمزور بے چاروں کی کوئی نہیں سنتا۔ اگر انسان کسی کی مصاحبت کرے تو اور مصیبت ہے۔ وہ امیر اگر رات بھر جاگے تو مصاحب کو بھی جاگنا پڑتا ہے۔ نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ طبابت کے پیشے میں کچھ اور پریشانیاں ہیں۔ نواب جو چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہونے پر طبیب مورد الزام ہوتا ہے۔ اگر نواب کو چھینک آ جائے تو اس کی ذمہ داری بھی طبیب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ گویا ان امرا کے طبیب علاج کرنے والے نہیں بلکہ موت سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔ انسان اگر سوداگری کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکن میں بکے وہ جو خرید صفاہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیئے تو عجب طرز بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے

غرض بڑی مشکل سے سودا طے ہوتا ہے امیر ایک پروانہ عامل کے نام لکھ کر دے دیتا ہے مگر ان کے خزانے میں پیسے ہی کہاں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز واپس ملتی ہے اور نہ پیسہ۔ اگر کھیتی باڑی شروع کی جائے تو ہر وقت بارش نہ ہونے کا ڈر اور قرقی کا خوف کھائے جاتا ہے۔ مختلف پیشوں کی تباہی کے ذکر کے بعد سودا شاعروں کا حال بیان کرتے ہیں

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال — دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات امیروں کا کس و ناکس — ملنا انھیں اُن سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جاکے دوگانہ — نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سُنے نطفۂ خاں ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

شہر آشوب کے آخر میں سودا کہتے ہیں کہ انسان اگر بالفرض ہفت ہزاری بھی ہو جائے تو ذہنی آسودگی اور سکون ممکن نہیں۔ بلکہ دنیا کیا عقبیٰ میں بھی آسودگی نہیں مل سکتی

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
یہ شکل بھی سمجھو تو راحت جاں ہے
ملک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال
جاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام

عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سودا سو یہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

دوسرے شہر آشوب میں سودا نے مغل حکومت، اس کے بادشاہ، شہزادے، امرا و رؤسا کی زبوں حالی کا مرثیہ کہا ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے کھو جانے کا، جھوٹی عزت و وقار اور اقتصادی بدحالی کا ماتم کیا ہے۔ سودا زندگی بھر جاگیردار طبقے سے متوسل رہے اس لیے ان کی ہمدردیاں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس طبقے کی بربادی کا بہت صدمہ ہے۔ انھوں نے مختلف افراد و اشیا کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اور اپنے طنز کے تیز نشتر ایک ایک ناسور پر چلائے ہیں۔ سودا خود کو اس طبقے کا ایک فرد سمجھتے ہیں اس لیے یہ ناسور خود ان کی زندگی کے ناسور ہیں۔

مخمس کے پہلے بند میں سودا بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں اگر انسان گھوڑا خرید بھی لے تو ملازمت کس کی کرے۔ نوکری ڈھیر بولا یا تول تو بکتی نہیں۔ جو بازار جا کر خرید لی جائے۔ پہلے امیر دولت مند نوکر رکھتے تھے اب جاگیر سے ان کی آمد بند ہو چکی ہے۔ مدتوں سے ملک میں سرکشوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پہلے جو ایک شخص پانچ سو گھوڑوں کا مالک تھا اب وہ کول (علی گڈھ) کا فوجدار بھی نہیں رہا۔ کئی بند میں سودا نے جاگیرداروں کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ طبقہ جو صاحب حل و عقد تھا۔ جن کے دم سے ملک کی سیاست چلتی تھی۔ سیاست سے بیزار ہو گیا اور بقول سودا۔

جو کوئی ملنے کو ان کے گھر آیا
سو یہ اس سے کہ اپنا دماغ خوش پایا
یہ ذکر سلطنت اس نے وہ درمیاں لایا
انھوں نے پھیر کے دہرتے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

مغل زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑا تھا۔ وہ سپاہی جن کے کارنامے سنہرے لفظوں سے لکھے گئے تھے اب تلوار بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سودا نے سپاہیوں کی بزدلی کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے تھے بھری لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

مغل خزانہ خالی پڑا تھا۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ خالصہ بہت مختصر تھا۔ اور جو تھا اس سے آمدنی بالکل نہیں تھی۔

نہ صرف خاصہ میں آمد نہ خالصہ جاری — سپاہی تا منصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا لکھوں خواری — سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے بنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنول

شہزادے قلعہ معلٰے میں فاقوں مر رہے تھے لیکن کوئی ان کی چیخ و پکار سننے والا نہ تھا۔ قلعہ کا خزانہ خالی تھا۔ قیمتی اشیاء نادرشاہ اور ابدالی کی نذر ہو چکی تھیں۔ اور مغل شہنشاہ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ شہزادوں کو صرف ایک وقت بھی کھانا کھلا سکتا۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دہاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی زرلبیٹے پہ آدے دمے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم لیبے میں چھالی ہے گی پہاڑ
تو چاہتے ہیں کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

دہلی جو عالم میں انتخاب شہر تھا۔ اُجڑا پڑا تھا۔ جہاں کبھی عیش و عشرت کی محفلیں سجتی تھیں اب وہاں گیدڑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جس کی شہر کی حسین و خوبصورت عمارتوں پر جنت کو بھی رشک آتا تھا۔ جہاں ایک ایک گھر چمن اور سبزہ زار تھا آج وہاں گھر گھر گھاس ہے عمارتیں شکستہ پڑی ہیں۔ کہیں کسی مکان کا ستون نظر آتا ہے۔ کہیں مرغول جس شہر کے چراغاں کو دیکھ کر آسمان کے مہ و انجم حسد سے جلے مرتے تھے آج وہاں کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش جغد پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں بجز چراغ غول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نجانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم
مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

یہ حالات تھے جن سے تنگ آکر فن کار اور اہل ہنر نے ترک وطن کیا۔

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا　　　کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گھوڑا دراصل فوجی نشان ہے۔ کیونکہ اس عہد میں فوج دشکست و فتح کا بہت زیادہ دارومدار گھوڑے پر تھا۔ آنوری نے فارسی میں گھوڑے کی ہجو کہی ہے۔ یہ ہجو گھوڑے کی نہیں بلکہ مغل حکومت کے فوجی نظام کی ہے جو افسانوی انداز میں کہی گئی ہے۔ سودا کے ایک دوست تھے جو سو روپے کے ملازم تھے۔ چونکہ ایمان دار تھے اس لیے اوپر کی آمدنی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ چونکہ گھوڑے کو دانہ اور گھاس نہیں ملتی تھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
ایک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزہ ہے خط سیاہ و سپید سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

سودا نے چالیس اشعار میں طرح طرح سے گھوڑے کی حالت بیان کی ہے۔ اور اس کی کمزوری اور لاغری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس تعریف کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک دن نقیب نے سودا سے آکر کہا۔ مرہٹے دہلی تک آ پہنچے اور تم ابھی آرام سے بیٹھے ہو۔ سودا کو بہت شرم آئی انھوں نے فوراً میدان کارزار کی تیاری کی تمام ہتھیار سے لیس ہوئے اور اسی گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہاں اس کے بیان کرنے میں سودا نے کمال دکھایا ہے۔ وہ صرف اپنے زور تخیل سے ایک واقعہ پیدا کرتے ہیں اور بہت ہی ظریفانہ انداز میں اس واقعے کی تفصیلات سناتے ہیں۔ اس ظرافت میں ملتر کے نشتر چھپے ہوئے ہیں جو ہمارے ناسوروں پر کام کرتے ہیں۔ سودا نے گھوڑے کے پردے میں اس فوج کا مذاق اڑایا ہے جو دہلی کو حملہ آوروں کے ہاتھوں لٹتے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی نادر شاہ ابدالی روہیلے جاٹ اور سکھ دہلی کو لوٹ رہے تھے۔ قتل وغارت گری کر رہے تھے۔ تمام مال و دولت جمع کرکے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ مگر مغل فوج بے بس اور لاچار بنی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ سودا نے اس قصیدہ کا نام تضحیک روزگار رکھا ہے۔

سودا نے جب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا ہے نام اس قصیدہ کا تضحیک روزگار

اب سوداؔ کے میدان جنگ میں جانے کا قصّہ سُنیے :-

ناچار ہوکے تب تو بندھایا میں اوس پہ زیں
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جیسا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا لکھوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے باشنے تھے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑا اُسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب بلکے تھا لاٹھی سے مار مار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگا دو کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

بہرحال خدا خدا کر کے میدان جنگ پہنچے وہاں جو حال ہوا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعدِ جنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا ایک لاغر و پست و ضعیف و تنگ
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اپنے حریف کو
دوڑ دل تھا اپنے پاؤں پہ جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں ہیچ میں ہے کل
لے برچھیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے پڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

اس سلسلے کی چوتھی ہجو سیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہے جس میں سوداؔ نے دہلی کی بد انتظامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان بد انتظامیوں کا ذمہ دار فولاد خاں ہے جو چوروں اچکوں سے ملا ہوا ہے۔

فولاد خاں[1] اور اس کے دولڑکے ڈاکہ اندازی میں خود حصّہ لیتے تھے۔ جس شہر کے کوتوال کا یہ حال ہو تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بد انتظامی اور کوتوال کی دیدہ دلیری مغل بادشاہ کی کمزوری اور لاچاری کی وجہ سے تھی۔ سوداؔ نے حسب عادت ان واقعات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سوداؔ ان دنوں کو یاد کرتے رہے۔ جب شہر میں نظم و نسق تھا۔ لیموں کے چور کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ جب کوتوال کو رشوت سے کوئی سروکار

[1] حاشیہ صفحہ آئندہ پر

نہ تھا۔ اس سبب سے شہر میں چور اچکے نہیں ہوتے تھے۔ اور اب تو یہ حال ہے۔

دیکھی جو ہم نے راہ جاؤڑی کی
ہے رہزنی تلاوڑی کی

فولاد خاں جب سے کوتوال ہوا ہے امن و امان مفقود ہو گیا ہے۔

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال
شیدی فولاد اب جو ہے کوتوال
چور کب اس کا ڈر مانتے ہے
کالا بال اپنا اس کو جانتے ہے
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے
اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بعضوں کا سفد ون کے نزد ہے یہ
چور کا بھائی گھٹی چور ہے یہ

شہر کے تمام چور فولاد خاں سے ملے ہوئے ہیں اور صبح کو تمام چور اس کا حصہ بھیج دیتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس ہے۔ لوگوں نے رات کو سونا بند کر دیا ہے۔ محفل عیش و طرب ہو کر میخانہ۔ عبادت گاہ ہو یا بزم ہاؤ ہو ہر جگہ لوگ ہوشیار بیٹھے رہتے ہیں۔

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں

---

(۱)۔ فولاد خاں دہلی کا کوتوال تھا۔ ۴ ربیع الثانی کو فولاد خاں کسی سبب سے گرفتار کیا گیا۔ اور وزیر الممالک (عماد الملک) کے دیوان خانہ میں محبوس ہوا۔ کوتوالی اس کی جگہ سیدی بلال کو ملی۔ اسی ماہ کی ساتویں کو تشدد بسیار کے بعد بند زنداں سے نجات پائی۔ اور پچاس ہزار روپے بطور مال امان مقرر ہوئے لیکن "موکلان وزیر الممالک" کی کشاکش سے نہ چھوٹا تھا کہ تیرھویں شعبان کو راہیٔ عدم ہوا۔ فولاد خاں نے ۱۱۷ سال کی عمر پائی لیکن دیکھنے میں پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ سلک دنداں باہم چناں منظم بود کہ مسلا احتیاج بہ خلال نیفتاد۔ روشنیٔ چشم بدستور خواب و خورش بے فتور و قوت رجویت برقرار بشیتن با ئیں جاناں نوخواستہ استوار بود ایں خوارق روزگار است (خان مذکور حبش کا رہنے والا تھا اس نے سات بار حج کیا) چندے بامر تجارت اشتغال ورزیدہ پس ازآنکہ وارد ہندوستان شدہ۔ در سلک ملازمان .... محمد شاہ .... منتظم گشتہ پیوستہ بر خاہ و زراعت اوقات بسری برد۔ مدت سی و چار سال بخدمت کوتوالی رکاب سعادت نیام ورزیدہ۔ نظم و نسق شائستہ بہ پدیہ آورد۔ تاریخ شاہ عالم گیر ثانی (مصنف نامعلوم۔ قلمی) بحوالہ معاصر حصہ ۲ صفحہ/ ۱۱۶۔

قاضی عبدالودود نے ایک قلمی تاریخ سے فولاد خاں کا حال نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ مجہول الاسم ہے۔ "دریں ولا ما چی فولاد خاں بہ گفت کسے بطور خود زاہد بیگ و صالح بیگ خلاں را کہ سرخیل ڈاکہ اندوزاں بودند قابو دیدہ دستگیر کردہ آوردہ در چبوترہ بہ حبس سخت محبوس نمودہ حکم بادشاہ حاصل نمودہ گشت۔ چوں وقت نجمے می گذرد در نقلے او بہ وزیر الممالک عرض کردند کہ دریں شہر مگر ہمیں دو کس ڈاکہ اندازی می کردند دیگرے نیست ...... فولاد خاں خود ڈاکہ ما می زند۔ و ہر دو پسر آتش آنچہ انحاء غارتیدن از ڈاکہ اندازی و زرا فشاری ذخیرہ دارند در ہمہ عالم ظاہر است ازیں معنی وزیر الممالک مردم خود بکثرت نزد فولاد خاں فرستادکہ بیارند۔ سوم ربیع الاول بچہ پاس گذشتہ بدست تمام پیادہ پابدستور گنہ گاراں کشیدہ بردند۔ اس کا بڑا بیٹا رفیع اللہ خاں بھی گرفتار ہوا۔ مگر چھوٹا اس طرح بھاگا کہ بالکل پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔ معاصر حصہ ۲ صفحہ/ ۱۱۷

شام سے صبح تک یہی ہے شور
دوڑیو گھڑی ہے چلا ہے چور
بے خطر شہر سے اب کوئی نہ رہا
اہل میخانہ ہیں بھی ہے ہو رہا
نہ عبادت کو جاگتے ہے شیخ
ڈر یہی چور آ نہ مار لے میخ

لطف یہ ہے کہ ان چوروں نے خود فولاد خاں کا بھی یہی حال کر رکھا ہے۔

خلق جب دیکھ کر کے یہ بیداد
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار
گرم ہے چوٹ کا اب بازار
کرتے ہیں تجھ سے اب بجا کر ڈھول
میری پگڑی کا میرے سر پہ مول



# پلیگ

تصنیف:- البیر کامو
ترجمہ و تلخیص:- سید محمود رضوی

الجیریا کے ساحل پر اوران نام کا ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ اوران کی اس سرزمین پر باغات نہیں ہیں۔ پھول نہیں ہیں' درخت اور ہریالی نہیں ہے۔ موسم کی تبدیلی کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں ہی ختم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ بہار کے آنے کا پتہ اس شہر میں صرف ان پھولوں سے چلتا ہے جو آس پاس کے مضافات سے فروخت کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں آفتاب کی شدید تمازت ہر شے کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ اور شہر کے در و دیوار تپ کر رہ جاتے ہیں۔ خزاں میں ہر جانب طوفان اور آگ کے بگولے اٹھتے رہتے ہیں۔ مکانوں' دیواروں اور سڑکوں پر بھوری اور باریک دھول کی تہیں کی تہیں جم جاتی ہیں لیکن موسم سرما کے دوران ضرور اس گرمی اور حدت سے کچھ پناہ سی مل جاتی ہے۔

اوران کے لوگ ایک گہری اکتاہٹ کا شکار ہیں۔ اور اس سے فرار پانے کے لیے وہ نئے نئے عیش و نشاط کے سامان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دولت پیدا کرنے کا عام رجحان غالباً اس اکتا جانے یا پھر اس سے نجات حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔ تمام دن کسی نہ کسی طرح وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند بننے میں صرف کرتے ہیں۔ اور رات کی تاریکی میں ان کی شدید آرزوئیں کسی غیر معروف اور انجانے لاشعوری جذبے سے مخمور ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں کی تفریحات بھی دنیا کے دوسرے عام نوجوانوں کی طرح فطری طور پر تیز اور مختصر ہوتی ہیں۔ اور طویل عمر کے لوگوں کے فرصت کے اوقات کلبوں اور دعوتوں میں صرف ہوتے ہیں۔ تاش کے پتوں پر سیکڑوں' ہزاروں کی بازی لگانا ان کی زندگی کا سب سے زیادہ ہمت کا کام ہوتا ہے۔ اوران کے لوگ ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ محض اس وجہ سے رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس وقت کم ہے اور سوچنے کی فرصت نہیں۔

اسی لیے ۱۹۴۷ء میں اوران پر جو خطرناک اور بھیانک تباہی آئی اس کے بارے میں وہاں کے باشندوں کو تعجب ہی ہوا۔ دراصل ان کی سادی اور یکرنگی سے بسر ہونے والی زندگی میں اس تباہی اور وبا کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یکایک جب وہ حادثہ ظہور پذیر ہوا تو وہ لوگ یقیناً اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

۱۶ اپریل کو صبح کو ڈاکٹر ریو جب اپنے دواخانے سے نکل رہے تھے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ملائم سی چیز ان کے پیر کے نیچے دب گئی ہے۔ ایک مرا ہوا چوہا تھا' جو سیڑھی کے بالکل بیچ میں تھا۔ ڈاکٹر ریو نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور اسے جوتے سے ہٹا کر وہ نیچے اترنے لگے۔ باہر نکلتے وقت جب انھوں نے دربان ماٹیکل کو دیکھا تو مرے ہوئے چوہے کا دھیان پھر آیا۔ آخر سیڑھی پر اس کے اس طرح پڑے ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔۔؟؟ پر اعتماد لہجہ میں ماٹیکل نے کہا کہ مکان میں چوہوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اور یہ یقیناً آس پاس کے شیطان لڑکوں کی حرکت ہے۔ ماٹیکل (                    ) سے چوہا ہٹا دینے کے لیے کہتے ہوئے ڈاکٹر ریو چلے گئے۔

اسی شام کا واقعہ ہے: ڈاکٹر ریو ([illegible]) اپنے مکان کے دروازے پر کھڑے کواڑ کھول رہے تھے' انھوں نے دیکھا کہ سامنے تاریکی میں سے نکل کر ایک بڑا سا چوہا ان کی جانب آرہا ہے۔ چوہے کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اور اس کی گہری بھورے رنگ کی کھال بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھی۔ یکایک وہ رک گیا جیسے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ تھوڑا سا بڑھا' دوبارہ رکا اور پھر "چیں"

کی ایک ہلکی آواز کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور اس میں سے خون کی پتلی چھینٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر ریو متعجب ہو کر ایک لمحہ اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر اوپر چلے گئے۔

مرے ہوئے چوہے کے منہ سے بہتی خون کی دھار نے اس خیال کو پھر تازہ کر دیا۔ جو آج تمام دن ڈاکٹر کے دل پر بار بنا رہا تھا۔ ریو کمرے میں داخل ہوئے تو مریض بیوی کی مسکراہٹ نے خیر مقدم کیا۔ مسز ریو سال بھر سے بیمار تھیں۔

"آپ جانتے ہیں بہت اچھی رہی میری طبیعت آج دن بھر" وہ بولیں۔ اس کے چہرے پر طویل بیماری کی نشانیاں اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں پھر بھی ڈاکٹر نے سوچا کتنی فطری جوانی اور کس قدر تازگی ہے اس چہرے پر۔ شاید مسکراہٹ نے اس لمحہ مرض کے خوفناک پن کو مکمل طور پر ہٹا دیا تھا۔

"اب سو جاؤ نرس کل گیارہ بجے آ رہی ہے۔ اور تمہیں دوپہر بارہ بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

مسز ریو تندرست ہونے کے لیے اوران سے باہر ایک سینی ٹوریم میں جانے والی تھیں۔

بیوی کی ٹھنڈی پسینے سے تر پیشانی پر ایک نازک سا بوسہ دے کر ریو کمرے سے باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح جب ڈاکٹر ریو نکل رہے تھے تو مائیکل نے انہیں روک لیا۔ اور کہا "میں نے کہا تھا نا صاحب۔ ان نالائق لڑکوں نے تین مرے ہوئے چوہے ہال میں بھی ڈال دیے تھے۔ شاید انہیں بہت نوکیلے چوہے دان سے پکڑا ہوگا کیونکہ ان کے جسم سے بے تحاشہ خون نکل رہا تھا۔" ریو مائیکل کی بات سن کر چلے گئے لیکن مائیکل کا شبہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

مائیکل نے دن بھر مکان کی سخت نگرانی کی لیکن بے کار، پتہ نہیں کس کی حرکت تھی کہ مرے ہوئے چوہے مکان میں پھر بھی پائے گئے اور چور کا کہیں پتہ نہیں چل سکا۔

"لیکن میں بھی ان بدمعاشوں کو پکڑ کر ہی دم لوں گا۔ آخر بچ کر کہاں جائیں گے۔" مائیکل نے پھر اسی خود اعتمادی کے ساتھ ڈاکٹر کے سامنے دعوے کیا۔

ڈاکٹر ریو مریضوں کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر جا رہے تھے۔ کار ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ ریو نے دیکھا سڑک کے کنارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس مرے ہوئے چوہے پڑے ہیں۔ نہ جانے کن شدید بدمعاش لڑکوں کی کرتوت تھی۔ ایک ہی گلی میں ڈاکٹر نے بارہ چوہے گنے۔

ریو کا پہلا مریض ان کا ایک پرانا مریض تھا، ایک بوڑھا اسپینی۔ اتنی طویل بیماری کے باوجود چہرے پر ایک مردانہ سختی تھی۔ اس کے پاس ہی دو برتن رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سوکھی مٹر تھی۔ جب ڈاکٹر ریو کمرے میں داخل ہوئے تو مریض پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور گردن دوہری کر رہا تھا اور اکھڑی ہوئی لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مریض کی بیوی پیالہ میں پانی لے آئی۔ ڈاکٹر ریو انجکشن تیار کرنے لگے دفعتاً مریض بولا "دیکھا ڈاکٹر دیکھا۔ کتنے زور شور سے نکل رہے ہیں۔ وہ!"

ان کا مطلب چوہوں سے ہے۔ پڑوس کے ایک شخص کو اپنی دہلیز پر تین چوہے مرے ہوئے ملے" بیوی نے بات صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ بوڑھے مریض کے چہرے پر عجیب سی دہشت ناک چمک تھی۔ کوڑے کے ڈھیر میں درجنوں مل سکتے ہیں۔ یہ ان کی بھوک ہے جو کم بختوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہی ہے۔

مریضوں کو دیکھنے کے بعد ریو جب گھر واپس پہنچے تو انہوں نے مائیکل سے پہلا سوال چوہوں کے بارے میں کیا۔

"جی نہیں اب کوئی چوہا نہیں ہے۔ میں سخت نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ بدمعاش چھو کرے سمجھ گئے ہیں کہ میں نے ان کی حرکت پکڑ لی ہے۔ اب وہ دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

پھر مائیکل نے ان کے نام کا ایک تار ان کو دیا۔ تار میں لکھا تھا کہ ریو کی والدہ اگلے روز آ رہی ہیں۔ بیوی کی عدم موجودگی میں وہ بیٹے کی

نگہداشت کریں گی۔

مسز ریو سفر کے لیے بالکل تیار تھیں۔ نرس بھی آچکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ یکایک ریو کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کو اپنی بیوی کی دیکھ بھال اور زیادہ اچھی طرح کرنا چاہیے تھی۔ تیمارداری میں کچھ کمی رہ گئی۔ ذرا سے توقف کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن تم جب لوٹ کر آؤ گی تو سب کچھ پہلے سے زیادہ اچھا ہو جائے گا۔ ہم تم پھر سے نئی اور پرسکون خوشی کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ ان کی آواز سے آرزو، حسرت، فکر، تقاضہ سب ہی کچھ نمایاں تھا۔

مسز ریو خوشی سے کھل اٹھیں "ہاں .... ہاں .... بالکل نئی اور اچھی۔

اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوتے وقت بیوی کی آنسوؤں سے جھلملاتی آنکھوں میں ایک ایسی پرنور چمک اور مسکراہٹ تھی جو گاڑی چلے جانے کے بعد ریو کے ذہن سے نہ ہٹ سکی۔ کبھی کبھی آنکھوں کی زبان بھی کس قدر قابل فہم ہوتی ہے۔

ریو جب واپس جانے کے لیے مڑے تو انھوں نے سامنے سے پولیس مجسٹریٹ موسیو ادتھون کو آتے دیکھا۔ "ہلو، کہیے اسٹیشن کیسے آنا ہوا؟ ریو نے سوال کیا۔

"مادام ادتھون واپس آرہی ہیں انہیں لینے آیا ہوں ........ یہ چوہوں کا معاملہ۔ موسیو ادتھون نے کہا۔ اتنے ہی میں کسی انجن نے سیٹی دی۔ "چوہے ....... کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ......! اسی وقت ریلوے کا ایک نوکر مرے ہوئے چوہوں کی ایک ٹوکری اٹھائے ان کے قریب سے نکل کر گیا۔ مادام ادتھون کی گاڑی آگئی تھی۔ ریو ان سے رخصت لیکر چلے گئے۔

اسی روز سہ پہر کو ایک فرانسیسی نوجوان ان سے ملنے دواخانہ میں آیا۔ اس کا نام ریمنڈ رابرٹ (                ) تھا۔ کپڑوں سے وہ ایک لاابالی نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کے اطوار کچھ اس قسم کے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ پیرس کے ایک اخبار کا نمائندہ تھا۔ اور اخبار کی طرف سے اس کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ اس شہر کے عرب لوگوں کی زندگی اور خاص طور سے ان کی حفظان صحت کے اصولوں پر ایک مضمون لکھے۔

ڈاکٹر ریو نے اسے بتایا کہ لوگوں کی صحت عام طور سے اچھی نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی کیا کہ کیا وہ اخبار کی نمائندہ ہونے کے ناطے اپنے مضمون میں اس بارے میں سچائی پر سے مکمل پردہ اٹھا سکے گا۔؟

رابرٹ نے جواب دیا "کافی حد تک۔ میرا مطلب ہے ........

تو ہم لوگوں کا پھر اس بارے میں گفتگو کرنا بے کار ہے۔ ریو نے کہا۔

ایک لمحہ کے لیے رابرٹ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا پھر وہ بولا "میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کا وقت خراب کیا۔"

ڈاکٹر ریو کے اتنے روکھے پن کے باوجود بھی جدا ہوتے وقت رابرٹ کے دل میں ان کے لیے ایک احترام سا تھا۔

پانچ بجے کے قریب ریو پھر اپنے شہر میں رہنے والے مریضوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ جین تارو (                ) میٹر ھیوں پر کھڑا فلسفیانہ انداز میں سگریٹ پی رہا ہے۔ اور ایک مرتے ہوئے چوہے کی آخری چیخ پکار بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ تارو نے ڈاکٹر کی جانب دیکھ کر کہا "بہت تعجب کی بات۔ اتنے سارے چوہے بلوں سے نکل نکل کر باہر مر رہے ہیں۔"

"ہاں عجیب گھبراہٹ سی ہوتی ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ریو نیچے اترے تو مائیکل کو دیکھا وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اور بہت تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سرخ صحت مند چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ مائیکل نے کہا۔ جب ریو نے اسے اور بھی مرے ہوئے چوہوں کے بارے میں بتایا "ان کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اور یہی بات دوسرے مکانوں میں بھی ہے۔" مائیکل کو ان نامعلوم لڑکوں کے سامنے ہار مان لینا ہی پڑی تھی۔ اس احساس شکست سے

مائیکل کی طبیعت کافی خراب تھی۔ حالانکہ اس وقت اس نے یہ بات نہیں مانی۔

دوسرے روز جب ریو کی والدہ آئیں تو مرے ہوئے چوہوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ بالائی منزل سے نیچے تک چوہے ہی چوہے تھے اور آس پاس کے مکانوں اور سڑکوں پر بھی یہی حال تھا۔ مائیکل کی حالت اس روز اور بھی زیادہ خراب تھی۔

لیکن ان چوہوں کی وجہ سے اس خوشی میں کوئی فرق نہیں آ سکتا جو مجھے تمہارے پاس آنے میں حاصل ہوئی ہے۔ ریو کی ماں ریو سے کہہ رہی تھیں۔

ریو نے میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے چیرمین کو فون کیا۔ اور پوچھا کہ وہ چوہوں کے اس قدر زیادہ تعداد میں مرنے کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔؟ چیرمین بھی اس بات سے کافی فکر مند تھا۔ اس نے کہا کہ اگر حالت اور زیادہ خراب ہوئی تو وہ لوگ سخت سے سخت کارروائی کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

اور شہر میں مرتے ہوئے چوہوں کا خوفناک سیلاب سا آگیا۔ دس سے بیس اور بیس سے سو اور سو سے ہزاروں تک بات جلد ہی پہنچ گئی۔ ایک طرف میونسپلٹی کی گاڑیاں مرے چوہے لاد کر جلانے کے لیے لے جاتیں اور دوسری جانب پھر اسی تعداد میں مرے ہوئے چوہوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ چوتھے روز تک چوہوں کے گروہ کے گروہ باہر نکل کر ادھر ادھر مرنے لگے۔

رات کی انتہائی تاریکی میں مکانوں اور گلیوں میں سڑکوں اور راستوں پر مرتے ہوئے چوہوں کی باریک چیخیں گونج جاتیں۔ اور پھر ایک پرہول سناٹا چھا جاتا۔ اور ان کے منہ سے نکلا ہوا خون گندے لال سپولوں کی طرح ادھر ادھر پھیلا پڑا رہتا۔ ہر جگہ ان بھیانک ننھی ننھی لاشوں کے ڈھیر لگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس سرزمین پر خوشحالی اور تہذیب کے ایوان کھڑے تھے اس کی کوکھ میں ازل سے سڑا ہوا مواد اب پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہا ہے۔ اور اس کی روک تھام انسان کے بس کی بات نہیں۔

۲۸ اپریل کو ریڈک خبر رساں ایجنسی نے اعلان کیا کہ دن بھر میں آٹھ ہزار مرے ہوئے چوہے اکٹھے کیے گئے۔ لیکن دوسرے روز سے ہی اچانک چوہوں کا مرنا تیزی سے کم ہونا شروع ہوگیا۔ اور پریشان حال شہریوں نے طمینان کا

یہ ایک دل ہلا دینے والی کہانی ہے۔ جب فرانسیسی الجیریا میں آدرن نام کے شہر پر دفعتاً پلیگ کی خوفناک بیماری آئی۔ دولت اور عیاشی میں ڈوبے ہوئے باشندوں کا شیرازہ اس تباہی سے منتشر ہونے لگا۔ سارا شہر درد۔ تکلیف، آنسوؤں اور آہوں سے بھر گیا۔ اور اس حقیقت سے ان کی روح کرب کے عالم میں تڑپنے لگی۔ آرزوئیں دفن ہوگئیں۔ لیکن............ مجرم کوٹارڈ جیل خانے کے خوف سے یہی چاہتا رہا کہ پلیگ کبھی ختم نہ ہو۔ اور اس کے برخلاف جین تاروے جو موت کے خلاف زندگی بھر جہاد کرتا رہا اور آخر کار پلیگ کے سبب از وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہوا شہید ہوگیا۔ ذہن اور لسان انسانیت ڈاکٹر ریو ہے۔ جس نے پلیگ سے جنگ کی۔ اس میں وہ مفتوح ہوا لیکن پھر بھی ڈٹا رہا۔ اور ایک دن عقیدہ کے بل پر فتح حاصل کر ہی لی۔ اور اس پلیگ سے صرف اورن کے باشندوں کو ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کو ایک عبرت ناک سبق ملا۔

سانس لیا۔ جس روز چوہوں کے مرنے میں کمی ہوئی اسی روز ریو کو معلوم ہوا کہ مائیکل کی طبیعت کافی خراب ہوگئی ہے۔ اس کی گردن، بغل اور کمر میں درد تھا۔ اور گردن کے نیچے ایک بڑی سی گلٹی نکل آئی تھی۔ ریو دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے مائیکل سے کہا۔

"تم فوراً گھر جاؤ اور تھرما میٹر سے بخار دیکھتے رہو۔ میں واپس آتے وقت تمہیں دیکھوں گا۔"

ریو ہسپتال میں کام کر رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میونسپلٹی کا ایک کلرک جوزف گرینڈ ( ) بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کا علاج ایک بار پہلے کر چکے تھے۔

اس بار ایک اور شخص کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میرے پڑوسی کو ایک حادثہ پیش آگیا ہے۔ اگر آپ آ سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جوزف نے کہا۔

"میں فوراً ہی آرہا ہوں"۔ ریو نے جواب دیا۔ انھوں نے سوچا مائیکل کو لوٹ کر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک تنگ بدبودار مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ گرینڈ نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ پچاس سال کا منحنی لمبا قد کا ایک آدمی تھا۔

پتہ چلا کہ گرینڈ کے پڑوسی کوٹارڈ (                ) نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ جو ناکام ہو گئی۔ ریو اور گرینڈ جب کمرے میں داخل ہوئے تو کوٹارڈ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ مگر اس کے چہرے پر کسی اندرونی کرب کے آثار تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ لیکن اب وہ زندہ تھا۔ اس پر اسے رنج تو نہیں تھا۔ ایک جھجھک سی ضرور تھی۔

کوٹارڈ کو انجکشن دے کر اور گرینڈ سے اس کی نگہداشت کرنے کے لیے کہہ کر ریو چلے گئے۔

گرینڈ نے بڑے جوش سے کہا "ہاں ..... ہاں ضرور۔ آخر ہمارے پڑوسیوں کی خدمت کرنا ہی تو ہمارا فرض ہے"۔ اس وقت ریو نے اس کے سنتے ہوئے چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک دیکھی۔

لوٹتے وقت ریو مائیکل کو دیکھنے کے لیے رکے۔ مائیکل درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں تھیں اور پیاس بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ مائیکل کی بیوی کو ضروری ہدایات بتا کر چلے گئے۔

اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر سے انھوں نے ٹیلیفون پر پوچھا کہ اس طرح کے بخار کا کوئی کیس ان کے پاس کبھی آیا یا نہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "نہیں" پھر جلد ہی جیسے اسے کچھ یاد آگیا اور وہ دوبارہ بولا "ہاں ..... ہاں دو کیس میرے پاس آئے ہیں۔"

رات میں مائیکل کی طبیعت اور بھی خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر ریو مائیکل کو دیکھنے پھر آئے۔ وہ یہ بھی کہہ گئے کہ جب ضرورت ہو فوراً فون کر کے ان کو بلا لیا جائے۔

دوسرے روز مطلع غبار آلود سا تھا۔ اور ہلکی ہلکی گرم ہوا چل رہی تھی۔ ریو کے دماغ پر سے بھی بار کم ہو گیا تھا۔ اور ناامیدی و یاس کے چھائے بادل چھٹنے لگے تھے۔ بوڑھے مائیکل کا بخار بھی کم ہو گیا تھا۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔

مائیکل کی بیوی کے سوال کرنے پر ڈاکٹر نے کہا "ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

دوپہر کو مائیکل کا بخار دفعتاً پھر تیز ہو گیا۔ اسے قے بھی ہونے لگی اور پھر سرسامی کیفیت طاری ہو گئی۔ گردن کی گلٹی کا درد بھی اور شدت اختیار کر گیا۔ اور آخر کار مائیکل کو اسپتال پہنچانا پڑا۔ ایمبولینس میں پڑے راستہ بھر وہ بے ہوشی کے عالم میں یہی بڑبڑاتا رہا "یہ چوہے ..... کمبخت چوہے ......" اس کا چہرہ بدرنگ ہو گیا تھا۔ ہونٹوں کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ سانس بھی رک رک کر آ رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی وزنی بوجھ کے نیچے دب کر اس کا دم نکلا جا رہا ہو۔ مائیکل کی بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔ ...!

کیا کوئی امید نہیں ماسٹر صاحب ..... ؟ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے پوچھا۔

ریو نے کچھ انداز سے سر ہلایا کہ اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ مائیکل مر چکا تھا۔

اور اس طرح مائیکل کی موت کے ساتھ ایک باب ختم ہوا۔ خوف ناک اندازوں کا باب۔ اور دوسرے باب کا آغاز ہوا جس میں وہ اندازے اور گراں ٹھوس اور تلخ حقیقت کی شکل میں سامنے آنے لگتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ مرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی شروع میں کسی نے کوئی خاص خیال نہیں کیا۔ اور جب خیال ہوا بھی تو کافی دنوں تک سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مرض کیا ہے ..... ؟ ریو کو اس بات کا خیال تھا کہ معاملہ پیچیدہ (سنجیدہ) ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے دوسرے ڈاکٹروں کی رائے بھی اس بارے میں معلوم کرنا چاہی کہیں کوئی بھی یقین کیساتھ کچھ نہ کہہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہولناک سایہ چاروں طرف سے سمٹ کر پورے شہر کو اپنے خطرناک پنجوں میں دبوچے کیسے آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ سے اور اس کے خلاف متحد ہونے کے لیے شہر کے باشندوں میں ایک جوش سا جاگنے لگا۔

ریو کی فکر برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ زیادہ تر مریضوں میں وہی نشانیاں پائی گئیں جو مائیکل میں تھیں۔ ریو نے دوا کی ایک دوکان پر یہ معلوم کرنے کے لیے فون کیا کہ اس طرح کی بیماری کا علاج کرنے کے لیے "سیرم" ان کے پاس کتنی تعداد میں ہے۔ جواب ملا کہ اس کی کمی ہے

اب صرف ایک ہی چارہ تھا۔ ریو نے گلٹیوں کو چاقو سے کاٹنا شروع کر دیا۔ ان میں سے خون اور مواد نکلنے لگا۔ مریض اپنے اعضا کو درد کی شدت سے دور تک پھیلاتے۔ خون اور مواد بہتا رہتا، زیادہ تر مریض اسی تڑاند اور گندگی سے مر بھی جاتے۔

حکام شہر بھی فکر مند ہونے لگے۔ ڈاکٹروں کی میٹنگ بلائی گئی کافی بحث ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب کے ہونٹوں پر ایک ہی لفظ ہو لیکن جسے منہ سے باہر نکالنے پر سب ہی خوف زدہ ہیں۔

ڈاکٹر ریو اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے، سڑکوں پر زندگی کا نہ ہی رقص، لا متناہی قطاریں۔ کھڑکی میں کھڑے ریو کو پلیگ کے تمام تاریخی واقعات یاد آنے لگے۔ جن کے بارے میں انہوں نے پڑھا تھا۔ لندن کی طاعون کی تباہی، پیرس کے پلیگ کی وبا۔ اور قسطنطنیہ کا پلیگ۔ جن میں مکمل آبادیاں کی آبادیاں ختم ہو چکی تھیں۔ کتنی وسیع تھی وہ تباہی!! کیا ایسا ہی یہاں پر بھی ہوگا۔۔؟؟ وہ لرز گئے۔

اس وقت صرف سچائی کو قبول کرنے کی صورت میں ہی تباہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر یہی سوچ رہے تھے کہ گرینڈ کمرے میں آیا۔ وہ دفتر سے ہی آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں گیارہ آدمی مر چکے ہیں۔

ریو نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا اور پھر بولے کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم اس بیماری کے بارے میں ایک متفقہ فیصلہ کر کے اسے اس کی صحیح شکل میں [illegible] کی پوزیشن اور ڈسپلن اچھی نہیں۔ میں تجربہ گاہ جا رہا ہوں، چلو گے میرے ساتھ۔؟

آپ [illegible] ہیں۔ میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شئے کو اس کے صحیح نام سے پکارا جائے۔۔۔۔ لیکن آپ کے خیال میں یہ بیماری [illegible] گرینڈ نے سوال کیا۔

"یہ تو میں نہیں بتاؤں گا ......... اور پھر معلوم کر کے تم کون سا کچھ کیا ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

گرینڈ مسکرا دیا اور بولا "تو پھر دیکھئے نا...... سچ بات کہہ دینا اتنا آسان بھی تو نہیں۔"

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے گرینڈ نے کہا وہ تجربہ گاہ نہیں جا سکے گا۔ کیونکہ اسے گھر پر کافی کام ہے۔ اور جو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ اور بغیر بتائے کہ وہ کام کیا ہے۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے روز ڈاکٹر ریو نے میونسپلٹی کے چیرمین پر زور ڈال کر ڈاکٹروں کی ایک اور میٹنگ کروائی۔ تقریباً سب ہی ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ اس قدر ناامیدی اور پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں، سب کچھ جلد ہی آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور جلد بازی میں کوئی بھی قدم اٹھانا مناسب نہیں رہے گا۔ لیکن ڈاکٹر ریو اس بات پر زور دے رہے تھے کہ معاملے کی پیچیدگی پر غور کر کے اور بیماری کی ایک خاص شکل قائم کر کے [illegible] کے بہتر سے بہتر ذرائع اور سخت سے سخت کارروائی پر ڈالا جائے۔ ورنہ تقریباً نصف سے بھی زیادہ آبادی کا ناس [illegible] بھی کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

[illegible] سچائی کی حقیقت پر پردہ تو نہیں ڈالا جا سکتا۔ چند ہی روز میں مرنے والوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ [illegible] تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔

ریو نے پھر چیرمین کو فون کیا۔ اب تک ان کے ہاتھ پاؤں بھی پھول چلے تھے۔ لیکن اپنی ذات پر کوئی آنچ نہ آنے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ وہ مرکزی حکومت کو تمام باتوں سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی ہدایت کا انتظار کریں گے۔ اس بات چیت کے کچھ ہی گھنٹوں بعد چیرمین نے ریو کو اپنے دفتر بلا کر ایک تار پڑھنے کو دیا۔ جو مرکزی حکومت کی جانب سے تھا۔ تار میں تھا۔

"پلیگ کا اعلان کر دو اور شہر کے دروازے بند کر دو۔"

شہر کے خاص دروازے بند کر دیئے گئے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ کسی کا باہر جانا یا شہر کی حدود میں داخل ہونا منع قرار دے دیا گیا۔ شہر کے لوگوں پر اس کا عجیب اثر پڑا۔ وہ اس بات کے لیے بالکل تیار نہ تھے پھر بھی وہ یہی سوچتے رہے کہ یہ بات عارضی ہے۔ ابھی جن لوگوں سے ملنے کو منع کر دیا گیا ہے۔ ان سے وہ جلد ہی پھر مل سکیں گے۔ لیکن اچانک ہی بغیر کسی اطلاع کے جب ایک غیر متعین عرصہ کے لیے

انہیں اپنے پرانے شناساؤں سے، تمام دنیا سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تو وہ کھلا اسٹے ملاقات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

جب اس بات کو کافی دن گذر گئے تو لوگوں نے چیرمین کے دفتر کے آگے بھیڑ لگا کر اس بات پر اصرار شروع کر دیا کہ ان میں سے ہر ایک کی بات کو ذاتی طور پر اہم سمجھ کر انہیں شہر سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ آخر ان کی بیوی یا محبوبہ، شوہر یا محبوب، والدین یا اولاد ان سے دور تھے۔ اور یہ ان کے جذبات کی توہین تھی۔ موت تھی۔ اگر اس طرح انہیں یہاں بند کر کے رکھا جائے۔ لیکن سچائی کے سامنے ہمیشہ جذبات نے ہتھیار ڈالے ہیں۔ اور یہاں بھی اس سے کوئی مختلف بات نہیں ہوئی۔ چیرمین کے حکم کے سامنے ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

آغاز پلیگ کے دنوں میں زندگی کی عام رفتار بالکل مدھم پڑ گئی تھی۔ ایک شدید بے بسی نے لوگوں کو جکڑ لیا تھا کیونکہ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی کہ وبا ہی کب تک جاری رہے گی۔ اس لیے پٹرول وغیرہ پر کنٹرول کر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ضروری اشیا پر بھی سڑکیں سنسان نظر آتی تھیں۔ موٹروں کا تانتا اور آدمیوں کا رش ختم ہو گیا تھا۔ اور صرف ٹراموں کی گھڑگھڑاہٹ یا مریضوں اور لاشوں کو لے جانے والی ایمبولینس گاڑیوں کی آواز ہی سنی جاسکتی تھی۔

جلد ہی چیرمین نے کنٹرول اور سخت کر دیا شہر پناہ کے دروازوں پر پہرہ اور بڑھا دیا گیا کیونکہ یہ خبر ملی تھی کہ کچھ لوگوں نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ آخر کار موت کی ہولناک تباہی کے سائے میں اور ناامیدی نے اس کے احساسات کو سینے میں دبکا دیئے۔ لوگ ایک ایک لمحہ کو ایک ایک صدی مان کر جینے کی امنگ میں مست ہو گئے۔ سینما ہالوں میں لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی ہوٹلوں اور کیفیوں میں لوگ زیادہ دیر تک اور دلچسپی کے ساتھ بیٹھنے لگے۔ شراب نوشی پھر بڑھنے لگی اور اکثر یہ دیکھا جانے لگا کہ ان کے دو دو بجے اور تین تین بجے شراب کے نشے میں دھت لوگ ہوٹلوں سے لڑکھڑاتے ہوئے نکل کر سنسان اور ویران سڑکوں پر زور زور سے پرامید نعرے لگا رہے ہیں۔ دوکان دار مال بچا بچا کر رکھ رہے تھے تاکہ وہ اس کو گراں سے گراں قیمت پر فروخت کر سکیں۔

اور ان رفتہ رفتہ ایک وسیع گورستان بنتا جا رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے ایمبولینس ادھر سے ادھر بھاگتی دکھائی دیتیں۔ یا تو مریضوں کو ان کے گھروں سے اسپتال لیجانے کے لیے یا پھر ...... لاتعداد مردوں کو قبرستان میں دفن کرنے کے لیے۔ ڈاکٹر رکو دن رات مشغول تھے۔ صبح سے شام تک مریض ان کے پاس لائے جاتے اور وہ ان کا علاج کرنے کی ناکام کوشش کرتے اور اس کے بعد ..... مردوں کو دفنانے کے لیے بھیج دیا جاتا۔

ریو کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اور لوگ بھی مشغول ہوتے جا رہے تھے، ان میں سے جوزف گرینڈ بھی ایک تھا۔ مریضوں اور مرنے والوں کے اعداد و شمار جمع کرنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ وقت لگنے لگا۔ صرف کوٹارڈ ہی ایک ایسا شخص تھا جو تباہی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ خوش رہنے لگا تھا۔ اور پینے بھی لگا تھا۔

ان دنوں کوٹارڈ اتنا خوش معلوم ہوتا تھا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسری جانب بوڑھے کا پہلے ہی سے تھکا ماندہ جسم تکان سے اور اتنا زیادہ چور ہو جاتا کہ اسے وہ اپنا شام والا مزدوری کا کام کرنے میں بھی دقت ہوتی۔ لیکن اس کے پاس کبھی الفاظ نہیں رہتے تھے۔ اپنی بات ظاہر کرنے کے لیے اور اس سے وہ اب بھی خاموش تھا۔ اور اس وقت بھی اس پر خاموشی ہی طاری رہی تھی۔ جب اس کی بیوی برسوں تک باہمی زندگی گذارنے کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیونکہ گرینڈ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ محبت کا انجام شادی ہونے کے بعد اس بندھن کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

یہ امنگ اور یہ جوش ابھی رابرٹ میں باقی تھا۔ اور پلیگ کے سبب اس شہر میں قید ہو جانے پر وہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس سے سیکڑوں میل پیرس میں اس کی محبوبہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اور رابرٹ کا اس سے ملنے جانا نہایت ضروری تھا۔ لیکن ضمیر کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ کیا اخباری نمائندہ ہونے کے ناطے اس شہر میں رہ کر حالات کا جائزہ لے کر اس کے لیے ضروری نہیں ہے ..... ؟؟ رمیں۔ نمائندگی زندگی کی دوسرے درجے کی ذمہ داری اور اس کی پہلی ذمہ داری اپنی محبوبہ کے لیے ہے۔ دل نے ضمیر کو للکارا۔ اور آخر دل جیت گیا۔ رابرٹ نے تمام حکام سے یہ بات کہی کہ اسے شہر چھوڑ کر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن کسی نے اسے ٹال دیا۔ اور کسی نے سختی سے منع کر دیا۔ آخر کار وہ ڈاکٹر ریو کے پاس

آیا کر وہاں سے یہ سرٹیفکٹ دے دیں کہ وہ بالکل اچھا ہے۔

"لیکن میں تمہیں نہ سرٹیفکٹ دے سکتا ہوں اور نہ دوں گا۔" ریو نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ میرا اپنی محبوبہ سے ملنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر سے، یہاں کے لوگوں اور ان کی مصیبتوں سے میرا کیا تعلق؟ میں بیرونی باشندہ ہوں........"

اس وقت کوئی باہر سے آیا ہوا نہیں ہے۔ پلیگ نے ہر شخص کو ایک ہی رشتہ میں باندھ دیا ہے اور تم چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ریو نے رابرٹ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

رابرٹ کو غصہ آگیا۔ وہ بولا آپ کے دل میں جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔ اور صرف جذبات ہی ایک ایسی سچائی ہے جس سے آپ کوسوں دور ہیں۔ نباوٹی اور مصنوعی اصولوں نے آپ کو اندھا کر دیا ہے۔"

رابرٹ کو یہ بات کب معلوم تھی کہ ریو کی بیوی جسے وہ بیحد چاہتے ہیں میلوں ان سے دور ہے لیکن پھر بھی وہ ذاتی مرض کے لیے عام ذمہ داری کی قربانی نہیں دے سکتے تھے۔

صبح ریو کے منہ سے اچانک ہی نکلا۔"

جی ہاں۔ اور مجھے یہاں سے جانے میں کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس نے ایک عزم سے جواب دیا۔ خدا تمہاری آرزو پوری کرے۔

ریو نے کہا۔ رابرٹ چلا گیا۔ اور ریو اسپتال میں داخل ہوئے۔

آنے والے دن اپنے ساتھ تباہی پر خوفناک سود بڑھاتے گئے بچاؤ کی ساری تراکیب کے باوجود دبا پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ ریو گرینڈ اور ان سب لوگوں کو دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی جو پلیگ کے خلاف جنگ آزما تھے۔ ایک ہفتہ کے اندر پانچ سو سے زیادہ اموات کا اوسط تھا۔ اور سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ جس شہر میں اس کے باشندوں کے رہنے کے لیے کافی جگہ تھی اسی میں اس شہر کے مردوں کے لیے جگہ کی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں لوگ نہایت مناسب تابوت ایک ساتھ ہی دفنائے جانے لگے۔ اور پھر سارے قبرستان بھرنے لگے۔ چار پانچ پانچ تابوت ایک ساتھ ہی دفنائے جانے لگے۔ اور آخر ایک وقت ایسا آیا کہ پادری کی آخری رسوم ادا کرنے کی ذمہ داری کو بھی ختم کر دینا پڑا اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ سرکاری حکم کے بموجب مرنے والوں کے رشتہ داروں کے وہاں آنے پر پابندی لگ گئی۔ منتشر لاشیں درجنوں کی تعداد میں لا کر تاریکی اور گمنامی میں دفن کی جانے لگیں۔ اور انسان اپنی بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا۔ انسانی دماغ چیخنے لگا۔ اور دل شکستہ ہو گیا۔

ڈاکٹر ان المناک دنوں میں تین شفاخانوں کا کام سنبھالے رہتے تھے۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک ایمبولینس گاڑیاں تانتا توڑے بغیر مریضوں کو درجنوں کی تعداد میں لاتی رہتیں۔ اور پھر تمام علاج، تمام کے باوجود اسی طرح لاشوں کو بھر کر اس جگہ لے جاتیں جہاں اب دفنانے کی جگہ مہربانی نہیں بچی تھی اور لاشوں کی ایک بڑی تعداد ایک ساتھ ہی جلا دی جاتی۔ ریو اس غیر معمولی تکان اور اس شدید شکست کا کوئی احساس یہ تھا سیکڑوں لوگوں کے ایک ساتھ مرنے پر اس بات کو محسوس کرنے کے لیے فرصت ہی نہیں تھی۔ صرف اس روز جب شام کو ان کی والدہ نے ان کی بیوی کا تار ان کو دیا تو تار پکڑتے ہوئے ڈاکٹر ریو کے ہاتھوں میں رعشہ کی کیفیت طاری تھی۔ ماں نے جب اس متعلق معلوم کرنا چاہا تو ریو نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں، آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی تو سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جو زندہ ہے اسے موت کی عادت پڑنے میں وقت تو درکار ہوگا ہی۔"

ریو کو رابرٹ کی وہ بحث یاد آگئی۔ رابرٹ نے تکلیف اور درد، رنج، غم، الم اور موت کی توہین کر کے خوشی اور ہمدردی پریم اور زندگی کی

---

ڈاکٹر کیسٹل کی بنائی ہوئی نئی دوا "سیرم" پہلی بار پلیگ کے خلاف آزمائی گئی۔ لیکن وہ زندگی میں چند لمحوں کے ساتھ اضافے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔

پلیگ کا ماتم شہر کے ہر گلی کوچوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اور جب اس کا سایہ ہٹا تو تارو بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اب ریو کے لیے یہ دنیا بالکل سنسان تھی۔ اس طرح طاعون کی اس خوفناک تباہی کا خاتمہ تو ہوا، لیکن ریو......... اس کے لیے اب اس زندگی اور دنیا میں کیا رہ گیا تھا.......؟؟!

خواہش کی تھی۔ اور یہ انتخاب محض مندانہ رجحانات رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے فطری تھا۔

جب ہر طرف مصائب و آلام اور رنج و غم کے بھیانک سائے ہوں تو مذہب لوگوں کے لیے ایک بار پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ تکلیف اور تباہی کے گھٹے ہوئے ماحول سے بچنے کے لیے انہیں مذہب کی خوشگوار روحانیت پر دھوپ چاہیئے۔ گہری تاریکی میں اطمینان بخش روشنی پھیلانے کے لیے مذہب کے چراغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر ان پر آئی ہوئی اس خوفناک تباہی کو دور کرنے کے لیے بھی دعائیں ہونے لگیں۔ پادری پینی لو نے سب لوگوں کو جمع کر کے وعظ کہنا شروع کیا۔

"میرے بھائیو! یہ مصیبت جو تمہارے اوپر آئی ہے، ایک طرح تم اس کے حق دار بھی تھے۔ خدا تعالیٰ کی مرضی اور احکام کے خلاف جو کام ہوئے ہیں اس کی سزا ملنا ضروری ہے۔ توبہ کے آنسوؤں سے ہی گناہ کے دھبے مٹائے جا سکتے ہیں۔ اور توبہ کرنے کی جرأت اور صلاحیت آج تم میں نہیں۔ اسی لیے قدرت تم کو یہ سزا دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ گناہ، ناانصافی اور ظلم کا مکمل دنیا سے ضروری ہو گیا۔ رسی اس سے زیادہ اور دراز نہیں کی جا سکتی۔ یہ مصیبت اور تباہی جو آج تمہارے اوپر آئی ہے وہ صرف عذاب خداوندی ہی نہیں بلکہ گناہ اور ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے ایک تباہ کن ہتھیار بھی ہے۔ جو جتنا ہی گنہگار ہے، مکار ہے وہ اس تباہی کی آگ سے نہیں بچ سکتا۔ وہ اس میں جل جائے گا تاکہ سچائی اور پاکیزگی زندہ رہ سکے اور نکھر سکے ........"

فادر پینی لو کی بات کچھ لوگوں کی سمجھ میں آ گئی اور کچھ لوگوں نے اس کا کوئی خاص خیال نہیں کیا۔ لوگوں میں عجب رنج و دہشت کا مظاہرہ کیونکہ فادر پینی لو کی باتیں مکمل سچائی پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ریو نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

لیکن رابرٹ اپنے خیالات کے بارے میں بہت پریشان رہتے ہوئے تھا۔ بار بار وہ اپنے آپ سے خاطب ہو کر کہتا۔ "میرا فیصلہ اٹل ہے" اور جیسے جیسے وہ یہ بات دہراتا جاتا اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ اور اس اضطراب کا نتیجہ ایک کمزور ارادہ اور خود غرضی اختیار کرتا جاتا۔ تاریکی میں بار بار اس کی محبوبہ کا نگین اور حسین چہرہ ابھرتا اور وہ اس کو اپنی بانہوں میں بھر لینے کے لیے بیتاب ہو جاتا۔ اسے اپنی زندگی سے دور رہنا اس پر قدرت رکھنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہ ظلم ہے، سراسر ناانصافی ہے۔ رابرٹ کی روح میں فریاد کا ایک طوفان اٹھتا۔ لیکن شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ کسی بھی چیز کے آخری تحلیل میں سچائی کی نوس حقیقت کو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس نے ساتھ کسی بھی جذبے کی قربانی کیوں سچائی بہرحال سچائی ہے۔ خواہ وہ انصاف کے بارے میں ہو یا ناانصافی کے بارے میں، محبت کے لیے ہو یا نفرت کے لیے، موت سے متعلق ہو یا زندگی سے۔ ان دنوں راتوں میں رابرٹ کی محبوبہ اس کے خوابوں میں ہوتی اور دن میں جب آنکھ کھلتی تو سینے میں اس کا دل گھٹ کر رہ جاتا۔ اور دل کی گھٹن، خدا کی پناہ ......!! دن میں سنسان سڑکوں سے بچ کر نکلتا ہوا اسٹیشن تک جاتا جہاں اب کوئی ریل گاڑی نہیں آتی تھی اور نہ جاتی تھی۔

آفتاب کی تپش و حدت اور اس وبائی ہیبت ناک تباہی نے شہر کی ساری سڑکیں جلا کر خاک کر دی تھیں۔ ساری ہی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد اب شہر کے لوگ بھی اپنی اس تباہ و برباد اور خوفناک حالت کے عادی ہو چکے تھے۔ اسلیے اب ان کے دلوں میں خوف کی جگہ پلیگ کے شکست خوردہ لوگوں جیسی اداسی آ گئی تھی۔ تارو نے اپنی ڈائری میں لکھا "شہر کے باشندے اب پلیگ کے عادی ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص بھی ہنستا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ بے شک کہ اس نے حدت سے سوالی نہیں ہوا اور زیادہ تر لوگوں کے لیے تو یہ سارے مصائب و تکالیف اور حتیٰ کہ موت تک بھی معمولی باتیں بن چکی ہیں۔"

پلیگ کا آغاز ہوئے تین ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر ریو نے صرف اس دن تارو ان سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ گھر میں ریو اور ان کی والدہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ضعیف ماں کی پوری توجہ اس مصیبت اور تباہی کے دوران ڈاکٹر ریو پر مرکوز ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی کا آرزوؤں اور تمناؤں کا غرض کہ ہر چیز کا انحصار ڈاکٹر ریو پر تھا۔ اور دنیا کی کوئی بھی شے ان کو اس طرف سے نہ ہٹا سکتی تھی۔ ڈاکٹر ریو بھی ماں کے ساتھ اطمینان بخش سنجیدہ اور شفقت آمیز چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اور اس سے انہیں بہت سکون حاصل ہو رہا تھا۔ بیاں کچھ مال

نے سوال کیا "کوئی اطلاع آئی بہو کے پاس سے ؟"

ہاں ابھی حال ہی میں جو تار آیا تھا اس کے مطابق وہ اب پہلے سے بہت اچھی ہیں۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں یہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ میں فکر مند نہ ہوں۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور فوراً ہی لمبا چوڑا تارو کمرے میں داخل ہوا۔ تارو یہ تجویز لے کر آیا تھا کہ پلیگ بہت پھیل چکا ہے۔ اور کام نپٹانے کے لیے رضا کاروں کی بھرتی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

مجھے اس بات سے سخت نفرت ہے کہ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں موت کے حوالے کر دیا..... اور اسی لیے میں یہ رضا کاروں کی پارٹی بنانا چاہتا ہوں۔ تارو نے کہا۔"

ریو نے تارو کے پُرعزم اور تقریباً جذبات سے عاری چہرے کو ایک لمحہ کے لیے دیکھا۔ اور پھر بولے "آپ نے یہ سوچ لیا ہے کہ ایسا کرنے میں ذاتی طور سے آپ کو کتنا خطرہ ہے ؟"

بیمن دارو کو سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کبھی بچپن میں اس نے اپنی والد کی کچہری میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جسے سزائے موت دی جا رہی تھی۔ ننھے تارو کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ آیا اس مجرم نے واقعی یہ جرم کیا ہے یا نہیں۔ اس کے ذہن پر تو صرف اس مجرم کا سہما ہوا اور خوف زدہ چہرے ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا اور اس نے اسی وقت سے یہ طے کر لیا تھا کہ جرم خواہ کچھ بھی ہو کسی شخص کو سزائے موت دینا ناانصافی ہے۔ چاہے منصف انسان ہو یا خدا۔ اور اس کی ساری زندگی اس ناانصافی کے خلاف جدوجہد میں ہی صرف ہوئی تھی لیکن آج تک اسے یہ اطمینان نہیں ہوا کہ عمل حقیقی معنوں میں ہو رہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہر قدم پر ناانصافی انسان کے بھیس میں تھی۔ اور مختلف اصولوں کے نام پر انسان کو موت کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہ کیسا اندھیرا ہے۔ یہ تاریکی کیوں چھائی رہی ہے۔ ضمیر کی شمعیں بجھ گئیں۔ دل کے چراغ ٹھنڈے ہو گئے۔ کوئی شعلہ طور سے ہی رہبری کر دے۔ اس لیے فادر پینی لو کے کہنے کے مطابق اوران کے لوگوں پر جو یہ عذاب خداوندی نازل ہوا تھا اس کے خلاف بھی تارو جدوجہد کر رہا تھا۔ اور پلیگ سے لڑائی لڑنے اور اس پر فتحمندی حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گذرنے کو تیار تھے۔

اس وبا نے مجھے صرف ایک ہی بات سکھائی ہے۔" تارو نے کہا "اور وہ یہ کہ ہمیں اس کا خاتمہ کرنے کے لیے اچھی طور پر کام کرنا ہے۔ ہم سب کے اندر پلیگ کا دیو موجود ہے۔ ہم سب مریض ہیں اور ساری دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس بیماری سے الگ ہو اس لیے متحد ہو کر اس کا مقابلہ کرنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ ڈاکٹر ریو اور تارو نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اس بات کا وعدہ کیا اور رضا کاروں کا گروہ بنانے کی بات پکی ہو گئی۔

رضا کاروں کی پارٹی میں اور لوگوں کے ساتھ ہی مسٹر جوزف گرینڈ بھی شامل ہو گیا۔ گرینڈ کی اپنی کوئی سماجی پوزیشن نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھکا ماندہ شخص ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کو سینے میں چھپائے اس بات چیت کے سمندر میں خاموشی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہ اپنے لکھنے کے میں بیٹھا نہ جانے کب سے اس ناول کی پہلی ہی سطر بار بار لکھ رہا تھا۔ جس میں اس کے اندرونی کرب کو ایک خاموش زبان مل گئی تھی۔

تارو رابرٹ سے بھی اس پارٹی میں شامل ہونے کے لیے اصرار کر رہا تھا لیکن رابرٹ نے جواب دیا کہ اس شہر کے مصائب سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور اس کے علاوہ وہ یہاں سے جانے والا بھی ہے۔ ریو نے جب رابرٹ کے جانے کی بات سنی تو انہوں نے رابرٹ کو نیک خواہشات کا تحفہ دیا۔ رابرٹ کو اس بات پر بہت تعجب ہوا۔ اس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میرا یہاں سے جانا یا نہ جانا کی کوشش کرنا غیر قانونی ہے پھر بھی آپ روکنے یا روکانے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ نیک خواہشات کا اظہار ہی کرتے ہو۔

ڈاکٹر ریو زیر لب مسکراتے ہوئے بولے "تم نے خوشی کا انتخاب کیا ہے اور ایک انسان ہونے کے ناطے یہ تمہارا حق بھی ہے اس لیے یہ کسی بھی طرح غیر قانونی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔

رابرٹ کے ذہن میں ریو کی بات جگر لگاتی رہی لیکن پھر بھی کسی قیمت پر اوران سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ سے قریب ترین ہو جانے کی خواہش

میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور ان ہی کوششوں میں وہ مصروف بھی رہا۔ اس نے حکام کو پھر درخواستیں دیں لیکن پھر پہلے ہی کی طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک روز اس کی ملاقات کوٹارڈ سے ہو گئی۔ اس نے رابرٹ سے کہا وہ نکلنے کا راستہ بتا سکتا ہے اس کے لیے یہ بات کہہ دینا ممکن بھی تھا کیونکہ کوٹارڈ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں پلیگ سے فائدہ ہی ہوا تھا۔ اس کے ایک ایسے جرم پر پردہ پڑا تھا کہ پولیس اسے کسی وقت بھی وہ راز معلوم ہو جانے پر گرفتار کر سکتی تھی۔ کوٹارڈ پلیگ سے زیادہ گرفتاری سے خوف زدہ تھا لیکن حکام شہر کو پلیگ کی وجہ سے کوٹارڈ اور اس کے جرم کا ذرا بھی احساس نہ رہ گیا تھا۔ اس لیے اس کی آزادی برقرار تھی۔ دوسرے اس وقت شہر میں عام استعمال کی اشیا کی کمی پڑ گئی تھی اور کوٹارڈ اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو مال چوری چھپے شہر میں برآمد کیا کرتا (لایا کرتا تھا) اس میں اسے خاصا مالی منافع بھی ہو رہا تھا۔ اور اس کے اندر خوف کی جگہ ایک نئی خود اعتمادی نے لے لی تھی۔

اس وجہ سے جب کوٹارڈ نے رابرٹ کو اشارتاً سمجھایا کہ اس کے چھپ کر اوران سے باہر جانے کا انتظام ہو سکتا ہے تو اس کو بہت تعجب ہوا اور اس نے پوچھا کیا سچ مچ یہ ممکن ہے؟ تمہیں پورا یقین ہے۔؟؟

"بالکل ...... اور ایک دوست ہونے کے ناطے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ آخر جذبات کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ چلو، میرے ساتھ"

اور رابرٹ نے محسوس کیا کہ اس دوزخ میں اس کی بات سمجھنے والا کم از کم ایک آدمی تو ہے۔ وہ کوٹارڈ کے ساتھ ہو لیا۔ وقت دوپہر کا تھا اور سورج کی تمازت بہت تیز تھی۔ سڑکیں تقریباً خالی تھیں جیسا پلیگ کے دنوں ایک عام قاعدہ سا ہو گیا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد کوٹارڈ اور رابرٹ ایک ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہ جگہ بندرگاہ سے کافی قریب تھی۔ ریسٹوران کی تقریباً سب ہی میزیں خالی تھیں اندر کی گرم خاموشی میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گندک کے رنگ کے پنجرے میں ایک مریل سا طوطا تھا جو ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی زور زور سے چلانے لگا۔ ریسٹوران کا مالک چیخ رہا تھا۔ آواز سن کر اٹھا۔ وہ کوٹارڈ سے واقف تھا وہ قریب آیا تو کوٹارڈ نے پوچھا "ہے"؟

"کہہ نہیں سکتا" ریسٹوران مالک کا مختصر جواب تھا۔

"ہوں ...... میں اپنے ان دوست کو ملانا چاہتا تھا۔"

"تو یہ بھی دھندے کے آدمی ہیں!!"

"ہاں!"

اچھا شام کو آئیے گا۔"

شام کو رابرٹ اور کوٹارڈ پھر آئے اس وقت کچھ لوگ ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے رابرٹ کی جانب غور سے دیکھا۔ اتنے میں ہی ایک تگڑا مضبوط سا آدمی کرسی سے اٹھ کر کوٹارڈ سے مخاطب ہوا۔ "ہلو!! چلو بار کی طرف چلا جائے۔" تینوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر اسی شخص نے جس کا نام گرسیو تھا کہا چلو پھر باہر چلا جائے۔ تینوں باہر آ گئے۔ یہاں آ کر کوٹارڈ نے گرسیو کو رابرٹ کی مشکل سے آگاہ کیا۔ اور پھر یہ طے پایا کہ دس ہزار میں رابرٹ کا کام ہو جائے گا اور روپیہ جانے کے وقت دیا جا سکتا ہے۔ گرسیو نے رابرٹ کی ملاقات ایک اور شخص گونزالز سے کرائی۔ گونزالز نے رابرٹ کو دو اسپینی نوجوانوں سے ملایا۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے اور شہر کے ایک دروازے پر پہرہ دار تھے۔ انہوں نے رابرٹ کو بتایا کہ ان کے پہرے کی باری ایک ہفتے بعد آئے گی اور وہ انہیں اس سے ایک روز پہلے پرانے اسکول کے پاس ملے۔ رابرٹ نہایت خوشی کے ساتھ ان سے رخصت ہوا۔

ان سب باتوں میں تین چار روز لگ گئے۔ جب رابرٹ نے گونزالز سے کہا دیر ہو رہی ہے تو گونزالز نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا "ایسے کاموں میں دیر تو لگتی ہی ہے۔"

رابرٹ نے کام کو منع نہ کیا جانے کی وجہ سے جلدی سے کہا "ہاں ہاں! یہ تو ضرور لگتی ہوگی!"

جب رابرٹ واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا تارڈ اور ڈاکٹر ریکار میں آ رہے ہیں۔ وہ خود خوشی سے اتنا مست تھا کہ اسے کسی سواری کا خیال بھی نہ آیا۔ اور وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔ تارڈ نے کار روک لی اور اس سے کار میں بیٹھنے کو کہا۔ راستے میں تارڈ نے اس سے پھر کہا کہ وہ رضاکاروں کے اس گروہ میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا؟

رابرٹ نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اور اس کا پارٹی میں شامل ہونا ناممکن ہے۔ وہ اپنی اس نئی خوشی میں ان لوگوں سے جلد ہی رخصت ہو کر چلا گیا۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے اس خوشی کو پورے طور سے منانے کے لیے مے نوشی کی اور محبوبہ سے ملنے کی مسرت اور شراب کے نشے میں مست وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ اپنی محبوبہ سے تصور میں ہی ملتا رہا اور دل ہی دل میں روٹھی محبوبہ کو منانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ جب وہ اس سے اتنے دن دور رہنے کی شکایت کرے گی تو اسے بانہوں میں کس کر اتنا پیار کروں گا اتنا پیار کروں گا کہ وہ بوسوں کی شدت اور گرمی میں اپنی شکایت بھول جائے گی .....

> دبا کی تباہی سے وہ سارا شہر چلا اٹھا ..... اور رابرٹ نے دیکھا کہ اس وارڈ کے اندر ایک دم گھونٹ دینے والا دھندلکا ہے۔ مریض چار پائیوں پر پڑے چیخ رہے ہیں۔ تمام جگہ دوزخ کی طرح ہو رہی ہے۔ اور ان کے درمیان صرف ڈاکٹر ریوکیزا باندھے دیکھ بھال اور علاج کرتے پھر رہے ہیں۔ بسسلتی اور دم توڑتی زندگی کو بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں ..... ایسے وقت .....

لیکن یکایک اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی محبوبہ کا چہرہ بھول گیا ہے جیسے اچانک کسی آدمی کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ اور اس کے لیے دنیا کی ہر چیز پر اندھیرا چھا جائے۔ اس نے چہرے کو یاد کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن سب بے سود ہر بار کوشش کرنے پر اس کے تخیل میں ایک دھندلا دھندلا سا سایہ ہی ابھرتا رہا اور اس کے ساتھ اس کی جھنجھلاہٹ بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ اس بے بسی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں تمام رات بے خوابی میں گذر گئی۔

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب اسے ان دونوں بھائیوں سے پرانے اسکول کے پاس ملنا تھا۔ بڑی آرزو اور مسرت کے ساتھ وہ وہاں پہنچا۔ لیکن طے شدہ وقت سے کافی دیر بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں آیا۔ جھنجھلایا ہوا اور فکر مند رابرٹ وہاں سے واپس لوٹ آیا۔ اب تک کی ساری کوششیں رائیگاں ہو گئیں۔ اسے دوبارہ وہ کام پھر اسی ترتیب سے انجام دینا ہوگا۔ بڑی کوششوں کے بعد دوبارہ ان بھائیوں سے ملاقات ہو پائی۔ اور پھر ایک خاص روز طے پایا۔ ایک ہفتہ بعد۔

اس دوران انتظار رابرٹ کی شراب نوشی بڑھتی ہی گئی وہ اپنی محبوبہ کے چہرے کو لاشعور میں تلاش کرنے کی بہت کوشش کرتا لیکن اس کے تصور میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے بھی رنج و تکلیف چیخ و پکار جنازے اور موت کے نظارے ناچتے رہتے۔ انہیں الجھنوں میں اس کی ملاقات تارڈ یا ڈاکٹر ریو سے ہو جاتی تو رابرٹ بڑی خود اعتمادی سے کہتا "ایسے کاموں میں دیر لگتی ہی ہے۔ بس ایک ہفتے کے اندر اندر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں ایک کھوکھلا سا آ جاتا گویا وہ ان کو نہیں اپنے آپ کو یقین دلانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

طے شدہ وقت پھر آ گیا لیکن معلوم ہوا کہ فرار ہونے کے لیے وہ رات خطرناک ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ بعد پھر کوشش کی جائے گی۔ اور وہ ہفتہ بھی اسی طرح کی الجھنوں میں بسر ہوا۔ اور دن گذرنے کے ساتھ ہی ساتھ رابرٹ کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔ وہ ایک روز قبل ہی ان دونوں نوجوانوں کے مکان میں جا کر ٹھہر گیا۔ جیسے جیسے اس کے جانے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہی اس کی بے بسی اپنی محبوبہ کا چہرہ یاد کرنے کے لیے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شام کو ان دونوں میں سے ایک نے آ کر بتایا کہ رات کے گیارہ بجے مناسب وقت ہوگا۔

"تو اب میں جا ہی رہا ہوں" اس نے نہایت مسرت کے عالم میں یہ بات سوچنا شروع کی۔ لیکن اس خیال سے اسے کسی خوشی کے جذبہ کا احساس نہ ہو سکا۔ کتنی بڑی انسانی بے بسی ہے اگر ہم خوشی کے حالات میں خوش ہونا چاہیں لیکن نہ ہو سکیں۔ پھر رابرٹ نے دوبارہ یہ بات نہیں سوچی۔ اس نے طے کیا کہ اس وقت جاکر اسے تارد اور ڈاکٹر ریو سے الوداع کہنی چاہیئے۔

رابرٹ اسپتال میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تارد کام میں بے طرح مشغول ہے۔ نئے آنے والے مریضوں کے کارڈ بن رہے تھے اور اسی تیزی سے ان پر ان کی موت کا وقت اور تاریخ ڈالی جا رہی تھی۔ انسانی زندگی ...... صرف چند کارڈ ..... اور بس!

"دیکھ رہے ہو میرا کام تو حساب کتاب رکھنے والے منشی جیسا ہو گیا ہے۔ ارے ہاں! کہو تمہارے جانے کا کیا ہوا؟" تارد نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آج رات کو جا رہا ہوں" رابرٹ کو یہ جواب دیتے وقت ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بات اس نے پہلی دفعہ کسی اور سے کہی ہو۔ "جانے سے قبل تم سے اور ڈاکٹر ریو سے ملنے آیا تھا...... کہاں ہیں ڈاکٹر؟"

"اندر۔ آپریشن روم میں۔ ان کا باہر آنا ناممکن ہے۔ لوگ اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی تیزی سے آ رہے ہیں کہ بیچارے ڈاکٹر کو دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔" تارد نے کہا۔

"لیکن تارد میرا ان سے ملنا ضروری ہے۔" رابرٹ کی آواز سے بے قراری جھلک رہی تھی۔

"اندر جانا انتہائی خطرناک ہے اور پھر منظر اتنا ہولناک ہے اتنا بھیانک ہے کہ شاید تم برداشت نہ کر سکو گے۔" تارد نے اسے بتایا۔

لیکن رابرٹ کا شدید اصرار تھا اس لئے وہ اسے اندر لے گیا۔ دونوں منھ پر کپڑا باندھ کر وارڈ کے اندر داخل ہوئے۔

رابرٹ نے دیکھا وارڈ کے اندر دم گھونٹ دینے والا دھواں نکل رہا ہے۔ ایک بدبو دار بھاپ اٹھ رہی ہے۔ چارپائیوں پر پڑے مریض چلا رہے ہیں۔ درد سے چیخ رہے ہیں۔ پورا کمرہ دوزخ کا نمونہ معلوم ہو رہا ہے۔ اور ان سب کے درمیان صرف ڈاکٹر ریو منہ پر کپڑا لگائے علاج اور دیکھ بھال کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ سسکتی دم توڑتی زندگی کو بچانے میں مصروف ہیں۔ تباہی و بربادی کے اس ماحول میں تعمیر کی ایک کوشش۔ کافی دیر بعد ڈاکٹر ریو، تارد اور رابرٹ کی طرف متوجہ ہو سکے۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا رابرٹ" ریو نے کہا۔ منہ پر بندھے کپڑے کے اوپر جھانکتی آنکھوں میں تکان کا احساس تھا۔

"میں ...... میں یہ کہنے آیا ہوں کہ بیماروں کی نگہبانی اور تیمارداری کے اس گروہ میں میں شامل ہونا چاہتا ہوں" رابرٹ ایک دم ہی یہ بات کہہ گیا۔

ریو اور تارد کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ریو نے ایک منٹ توقف کے بعد کہا "جذبات کی رو میں بہہ کر کچھ بھی کرنا مناسب نہیں ہوتا رابرٹ، تمہارا اپنی محبوبہ سے ملنا ہی ٹھیک ہے۔ کسی خاص طرح کی آلام و مصائب اور درد و تکلیف میں پرستش در اصل علامات ہوتے ہیں۔ لیکن خوشی کی آرزو کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں۔"

"لیکن جس خوشی اور مسرت میں صرف خود غرضی شامل ہو وہ شرم کی بات ضرور ہے" رابرٹ نے کہا۔ آج اس کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔ لہجہ میں ایک نیا یقین تھا۔ صرف اور دکھی لوگوں کا احساس ہی جھلک رہا تھا۔ اور اس کے بعد کسی بھی بحث کی کچھ بھی مزید کہنا غیر ضروری تھا۔

رابرٹ تارد کی پارٹی میں شامل ہو کر کام کرنے لگا۔

پلیگ کی تباہی برابر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ریو، تارد، گرینڈ اور رابرٹ کی مصروفیات کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مرنے والوں کی تعداد میں تو اضافہ ہو ہی رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ پلیگ نے اور بھی سیاہ کن اور پیچیدہ شکل اختیار کر لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی انسانی کوشش اس عذاب خداوندی کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ لیکن انسان کے اندر ایسا گہرا یقین ہے نجانے کونسی ایسی طاقت ہے جس کے بل بوتہ پر وہ اس آفت سے لگاتار جد و جہد کر رہا تھا۔ ناکامی کے تھپیڑے اس کے قدم لڑکھڑا نے لگتے لیکن اس کی کوشش میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور

پلیگ کے خلاف جنگ کرنیوالوں میں ضرور تبدیلی ایسی سچائی، کوئی ایسی خود اعتمادی تھی کہ قدرتی کام میں کوئی خاص مصلحت کے اصولوں پر یقین کرنے والے فادر پینی لو بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ حالانکہ ان کا خیال غالباً اب بھی یہی تھا کہ پلیگ خدا کا عذاب ہے جس کے ذریعہ وہ گناہگاروں کا، ناانصافی اور ظلم کرنے والوں کا ستیاناس کر رہا ہے۔

اسی عرصہ میں ڈاکٹر کیسٹل کی پلیگ کے خلاف بنائی گئی نئی دوا "سیرم" پہلی بار آزمائی گئی اور جس پر تجربہ کیا گیا وہ مجسٹریٹ اوتھون کا چھوٹا سا لڑکا جس کو یکایک پلیگ نے آدبوچا تھا۔ بچے کو فوراً ہی شفاخانے بھیج دیا گیا۔ اور مسز اوتھون اور مادام اوتھون کو اس کیمپ میں، جو شہر سے باہر ان لوگوں کو علیحدہ رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا جن کے خاندان میں کسی کو پلیگ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ریو نے مسٹر اوتھان کو تسلی دی اور دلایا تھا کہ وہ بچے کا ہر ممکن خیال رکھیں گے۔ بچے کے شفاخانے جاتے وقت اوتھون نے شاید پہلی بار اپنے اندرونی جذبات کو باہر آنے کی اجازت دی۔ "میرے بچے کی جان بچانے کی کوشش کرو" ریو!"

اور ریو نے ہر امکانی کوشش کی لیکن پلیگ کے خطرناک اور ہیبت ناک ظلم کے سامنے کچھ کام نہ آیا اور پہلی مرتبہ ریو کو اپنی ساری کوششوں کی ناکامی کا سخت تلخ احساس ہوا۔ بچے کی حالت تیزی سے خراب ہوتی جا رہی تھی اور یہ بات ریو کے لیے بالکل ظاہر تھی کہ اب اس کے بچنے کی بالکل امید نہیں ہے۔ اس حالت میں انہوں نے اس پر ڈاکٹر کیسٹل کی نئی سیرم کا استعمال کرنا طے کیا۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا کیونکہ سیرم کامیابی یا ناکامی پر پورے شہر کی امید یا ناامیدی کا انحصار تھا۔ بچے کو انجکشن دیا گیا۔ ریو، تارو، گرینڈ، ڈاکٹر کیسٹل اور فادر پینی لو سب انتظار میں بیٹھ گئے کہ شاید اس نئے علاج کا بچے پر اچھا اثر پڑے اور وہ ٹھیک ہو جائے۔

دن اور رات ...... رات اور دن حیات و موت کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ یہ آدمی بیٹھے ہوئے اس بچے کی تکلیف دیکھتے رہے اور ........ صرف دیکھتے ہی رہے ..... لیکن انسان کو اپنی عاجزی کا احساس شاید ہی کبھی ہوتا ہو ..... مگر سب بے کار ہے۔ ناکامی کا دیو منہ پھیلائے کھڑا تھا۔ دوا ناکام ہو رہی تھی۔ تارو سے بچے کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اور اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ رابرٹ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مسوس کر رکھ دیا ہو۔ فادر پینی لو نے دعا کی "خدایا اس بچے کی جان بچا لے"۔ خاموش طبیعت گرینڈ کی خاموشی اور شدید ہو گئی۔ ڈاکٹر کیسٹل کے دل کو بچے کی تکلیف کا احساس نامرادی کے اندھیرے میں ڈھکیل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بنائی ہوئی سیرم کا اثر بھی دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ریو کا نظریہ وہی تھا جو ڈاکٹر دل کا ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی شدید [illegible] اور غصہ کا تلخ اور گہرا احساس بھی تھا۔ بچے کی ناقابل برداشت تکلیف دیکھ کر ان کی روح [illegible] بے چین ہوئی جا رہی تھی۔

بچے کی موت [illegible] تک جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن آخرکار شکست کھا گیا۔ اس کا دبلا پتلا جسم آخری تکلیف سے بے جان ہو کر بے دم ہو گیا۔ ڈاکٹر ریو نے نہایت غصہ کے عالم میں فادر پینی لو سے چلا کر کہا "آپ کہتے تھے کہ پلیگ عذاب خداوندی ہے گناہگاروں اور ظالموں کو سزا دینے کے لیے۔ لیکن اس بچے کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ یہ بچہ بے گناہ تھا۔ بالکل معصوم"۔

فادر پینی لو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد جیسے ان کے زندگی بھر کے پختہ عقائد میں دراڑ سی پڑ گئی۔ حالانکہ ان کا دل اس بات کا مخالف تھا لیکن دماغ کے سکون میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ذہن کی پرسکون سطح متلاطم ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کا برتاؤ بھی کچھ عجیب قسم کا ہو گیا۔ چند روز بعد وہ بھی بیمار پڑے لیکن انہیں اپنے اس فیصلے پر کہ وہ اپنے آپ کو کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کریں گے ایک اطمینان سا تھا۔ پرسکون طور پر اپنے آخری وقت کی جسمانی تکلیف برداشت کرنے کے بعد فادر پینی لو کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے عقیدے پر شہید ہو گئے۔ لیکن شاید اس شہادت سے بھی ان کا اپنا سوال حل نہ ہوا تھا۔ اور آخری وقت ان کو اپنے پختہ عقائد کا سہارا ملا یا نہیں یہ بھی ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔

فادر پینی لو کا انتقال موسم سرما کے آغاز میں ہوا تھا۔ جاڑے کا موسم آنے پر لوگوں کو یہ امید تھی کہ پلیگ ختم ہو جائے گا لیکن اس امید

کے پورے ہونے کا اب بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مرنے والوں کی تعداد اب تک بہت بڑھ چکی تھی۔ اور لوگ اب بھی برابر پلیگ کا شکار ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر کاسٹیل کی سیرم استعمال میں لائی جا رہی تھی۔ کیونکہ اوتھون کے لڑکے کی بیماری میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس دوا کی وجہ سے مریض موت سے دیر تک جدوجہد کر سکتا ہے۔ لیکن کسی کی جان بچانے میں یہ دوا بھی ناکام ثابت ہوئی تھی۔

مسلسل ناکامی اور شکست کے سبب ریو کو شدید تکان کا احساس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی بیوی کی حالت کے بارے میں تار آتا جس میں ہمیشہ یہی ایک جملہ لکھا ہوتا "اب طبیعت پہلے سے اچھی ہے" لیکن ریو کو معلوم تھا کہ یہ جملے محض اور صرف تسلی دینے کے لیے لکھا گیا ہے۔ لیکن کام اب بھی اتنا زیادہ تھا کہ ریو کو اپنے نجی حالات میں مصروف ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ تارو بہت تھک چکا تھا۔ ذہنی اور جسمانی اور دونوں اعتبار سے۔ لیکن صرف اس کے علاوہ کہ اس کی ڈائری میں سرکاری رسم الخط برا ہو گیا۔ اس تکان کا اظہار اور کچھ (کہیں) نہیں تھا۔

لیکن گرینڈ کا برتاؤ ایک دم بہت عجیب سا ہو گیا۔ کئی روز تک وہ دفتر پر ٹھیک وقت سے نہیں پہنچا اور دفتر میں بھی ... تمام دن وہ شہر کی سنسان سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا۔ ایک دن ریو اور تارو فکر مند ... بہت ... کافی دیر بعد گرینڈ کا مکان سے جو بڑھا اور لاغر سا دکھائی دیا۔ لیکن ڈاکٹر ریو کے آتے ہی وہ ایک جانب کو بھاگ نکلا۔ اس واقعہ کے دو روز بعد معلوم ہوا کہ گرینڈ بیمار پڑ گیا ہے۔ ریو اور تارو نے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن گرینڈ کا تھکا ماندہ کمزور جسم موت سے کتنی جدوجہد کر سکتا تھا...... حالت بگڑتی ہی گئی۔ ڈاکٹر ریو نے آخری کوشش ڈاکٹر کاسٹیل کی سیرم استعمال کرنے کی بھی کی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ شکست اور ناکامی کے علاوہ قسمت میں کچھ اور نہیں ہے۔ اسی شب گرینڈ کی حالت کافی خراب ہو گئی۔ موت قریب دکھائی دینے لگا۔ کمرے میں موت کے خوف سے خاموشی طاری ہو گئی۔ گرینڈ نے نحیف آواز میں کہا۔ اس الماری سے میرا ناول نکال لیجئے۔ ریو نے ویسا ہی کیا۔ تقریباً "پچاس صفحات ہوں گے جن" میں صرف ایک ہی جملے کو بار بار لکھا ہے ... گرینڈ کو یقین تھا کہ ... وہ اب کی دنیا میں نہیں رہے گا ... ایک جملہ ... یہ جملہ ابھی پچھلے چند دنوں میں ہی لکھا گیا ہے۔ "میری پیاری جین کتنی بار یاد آتی ہے۔"

گرینڈ نے کہا کہ ان کاغذوں کو مرے ... آگ میں ڈال دیا جائے۔ ریو چپ چاپ ... گرینڈ نے ... اصرار کیا۔ اور ریو نے گرینڈ کی خواہش پوری کر دی۔ گرینڈ دیوار کی جانب منہ کر کے لیٹ گیا۔ کاغذ کے جلنے سے کمرے میں یکایک ایک دہشت ناک تیز روشنی لال پھیل گئی۔

تارو کو مریض کی نگہداشت کرنے کے لیے چھوڑ کر ریو اپنے گھر چلے گئے۔ رات بھر وہ یہی سوچتے رہے کہ موت کی طاقت کے سامنے زندگی کتنی بے معنی ہے۔ صبح جب وہ گرینڈ کے مکان پر پہونچے تو دیکھا اس کی طبیعت بالکل ٹھیک سی تھی جیسے کسی نے جادو کے اثر سے بیماری ختم کر دی ہو۔ اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد گرینڈ رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اسی دوران ریو کا ایک اور مریض ۔۔۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی اچانک ٹھیک ہو گئی۔ صحت مند ہونے کے یہ منظر اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ جس طرح یہ تباہی دفعتاً آ گئی تھی اسی طرح ختم بھی ہو جائے گی۔ موت کے خوف ناک سائے تیزی سے شہر کے اوپر سے ہٹنے لگے اور مرنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وبا اب ختم ہونے ہی والی ہے۔ لیکن اس بات سے لوگوں کو وہ خوشی نہیں ہوئی جو اس موقع پر فطری طور پر ہونا چاہیے تھی۔ وہ اب تک بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔ خوشی کے عارضی پن اور موت کی طاقت کا اندازہ اب لوگوں کو ہو چکا تھا۔ اس لیے ابھی وہ اپنی خوشی اور جوش پر پابندی لگائے ہوئے تھے۔

لوگوں کو اس بات پر بھی بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ سڑکوں پر اب پھر مرے چوہے دکھائی دینے لگے تھے۔ وبا اور تباہی کے پورے عرصے میں کہیں پر ایک بھی چوہے کا نام و نشان تک نہیں ملتا تھا۔

لیکن پلیگ نے جاتے جاتے ایک آخری حملہ کیا۔ اس کا شکاری تھا...... تارو.... یکایک اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر ریو اور ان کی ماں نے بڑی تندہی سے تارو کی دیکھ بھال کی اور تیمارداری کی، لیکن حالت خراب ہی ہوتی چلی گئی۔ تارو نے بڑی مردانگی اور جرأت کے ساتھ موت کا سامنا کیا۔ لیکن نہ اس کی جرأت و ہمت، نہ ریو کی دوستی، دوا اور علاج اس کی زندگی بچا سکے۔

تارو مر گیا۔

تارو کو اپنے اس خاتمہ سے بھی سکون نصیب ہوا یا نہیں یہ تو ڈاکٹر ریو نہیں کہہ سکتے تھے لیکن وہ یہ بات ضرور جانتے تھے کہ اب کے لیے کوئی اطمینان اور سکون ممکن نہیں تھا۔ جیسے پلیگ کے بعد کا امن اس ماں کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے جس کا بیٹا میں کام آچکا ہو۔ یا اس شخص کی طرح جس نے ابھی ابھی اپنے کسی نہایت عزیز دوست کو دفن کیا ہو۔ زندگی میں اب کوئی رنگینی اور مسرت باقی رہ گئی تھی۔ کیا رہ گیا تھا یادوں کے علاوہ...... پلیگ کی تباہی اور اس کی یاد، کسی کے قریب ترین ہو جانا اور اس کی گذشتہ یاد، خوشی حاصل ہوتے ہوتے ہی اس کا ختم ہو جانا، اور اس کے ختم ہو جانے کی یادیں۔ اس سے زیادہ اور.... کچھ نہیں ...!! زندگی عذاب یادوں کے علاوہ اور کچھ بھی ہے ....؟؟؟

انہیں خیالات سے ریو کو جو طاقت ملی اس کے بل بوتہ پر شاید وہ اپنی بیوی کی موت کے صدمے کو بھی برداشت کر گئے جس کی خبر انہیں تارو کی موت کے کچھ ہی دیر بعد ملی تھی۔

---

اور اس طرح پلیگ کی خوفناک تباہی کا خاتمہ ہوا۔ فروری کی ایک چمک دار صبح کو شہر کے پھاٹک دوبارہ کھولے جانے کا جشن بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ توپیں اور آتشبازیاں چھوڑی گئیں۔ شراب کی ندیاں بہائی گئیں۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی گئیں۔ سنسان اسٹیشن پر دوبارہ ریلیں آئیں۔ بندرگاہوں پر پھر سے جہازوں کی آمد شروع ہوئی۔ زندگی کے پرمسرت رقص کا پھر سے نئے جوش و زور سے آغاز کیا گیا۔ جیسے حیات نے موت کو آخرکار شکست دے دی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی ایک مستقل شے ہے اور موت وقتی اور عارضی۔

پرانے دوست، قدیمی عزیز، دل گرفتہ محبوب مجسم عشوہ و انداز محبوبائیں شدید فراق کے بعد پھر سے ملے اور جوش سے پاگل ہو کر اس بات کو ثابت کرنے میں مصروف ہو گئے کہ زندگی نے موت پر فتح حاصل کر لی ہے۔

لیکن جب رامبرٹ نے فرانس سے آئی ہوئی اپنی محبوبہ کو بانہوں میں لپٹا تو اسے ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اور اس احساس کے بعد کوئی بھی بات کوئی بھی تعلق کارآمد نہیں رہ جاتا۔ اور اسی احساس کو مکمل طور پر مٹانے کے لیے نئے سرے سے سعی کرنا ہوگی۔ جس کے لیے وقت درکار ہے۔

اپنی کھڑکی میں کھڑے ڈاکٹر ریو اس جوش و خروش کو، اس جشن کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ اس طرح کی خوشی اور مسرت جو وہ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ ہمیشہ تباہی کے زیر سایہ ہی (ماتحت ہی) رہتی ہے اور رہے گی۔ پلیگ کا موذی اور تباہ کن جراثیم کبھی مرتا نہیں ہے۔ اور نہ ہمیشہ کے لیے غائب ہی ہوتا ہے۔ یہ برسوں گزارہ سکتا ہے۔ زندگی کی مختلف اشیا میں دبکا ہوا، اور نوع انسانی کو پھر سے سبق سکھانے کے لیے، اسے دوبارہ سچائی کی راہ دکھانے کے لیے، وہ کسی ہولناک شکل میں پھر ابھر سکتا ہے۔ اور اپنی پرورش کرنے والوں کو اپنے نمائندوں کو ایک مسرت سے بھرپور جگہ پر بھیج سکتا ہے۔ تاکہ مرنے کے بعد وہ سچائی کو جان سکیں، پہچان سکیں۔

---

## امتیاز علی عرشی

تیرے دیوانے کبھی کیا کام یہاں کرتے رہے — اپنے ویرانے کو ہمدوشِ جہاں کرتے رہے
خوئے تسلیم و رضا سے بہت کام آئی — اس جفا جو کے ہر الزام پہ ہاں کرتے رہے
بسقدر بڑھتے رہے راہِ وفا میں ہم لوگ — ثبت ہر گام پہ اک اپنا نشاں کرتے رہے
جس کو ہم راز سمجھتے رہے نادانی سے — اپنے چہرے سے اسے خود ہی عیاں کرتے رہے
جانتے تھے کہ نہیں عقل کو کچھ ہوش مگر — عمر بھر راہنما اپنا گماں کرتے رہے
تشنگی دل نے گرائے جو گہر آنکھوں سے — جیب و دامن میں ہم ان سب کو نہاں کرتے رہے
لاکھ احباب نے روکا ہمیں عرشی لیکن — جادۂ عشق کو ہم کاہکشاں کرتے رہے

## شہریار

لاکھ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں — ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے
ہر گلی کوچے میں رسوا ہوئے جن کی خاطر — کیا خبر تھی کہ وہی لوگ بدل جائیں گے
ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو — سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے
قافلے نیند کے آئے ہیں انہیں ٹھہراؤ — ورنہ یہ دور بہت دور نکل جائیں گے

## جاوید کمال رامپوری

مطرب خوش نوا کی یاد آئی — نغمۂ جانفزا کی یاد آئی
پھر وہ وقتِ وصال یاد آیا — پھر اسی دلربا کی یاد آئی
پھر اسی بزم کا خیال آیا — پھر دلِ نارسا کی یاد آئی
پھر اسی رہگزر پہ جو بیٹھے — پھر اسی نقشِ پا کی یاد آئی
پھر کوئی زخمِ دل مہک اٹھے — پھر کسی بے وفا کی یاد آئی
آج اک حادثہ ہوا یعنی — دل کو اک آشنا کی یاد آئی

## بشیر بدر

تیور جفاکار کو پہچان نہ پایا — دل حسن کے ایثار کو پہچان نہ پایا
آئینے نے آئینے میں سو بال نکالے — فن کار بھی فن کار کو پہچان نہ پایا
ہاں غور سے پھر دیکھ خداوندِ محبت — تو اپنے گنہگار کو پہچان نہ پایا
میں اپنی تمناؤں کا وہ خالقِ معصوم — جو اپنے ہی شہکار کو پہچان نہ پایا
سمجھا کہ خدا نے بھی کوئی شعر کہا ہے — واللہ میں سرکار کو پہچان نہ پایا
محرابِ حرم جیسی مجھے چاہے سزا دے — میں ابروئے خمدار کو پہچان نہ پایا

# مطبوعات موصولہ

( تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں )

**سیارہ لاہور** چند ماہ سے نعیم صدیقی نے ایک ماہنامہ کا اجرا کیا ہے۔ جس کا نام سیارہ ہے۔ سیارہ صالح ادبی اقدار کا نمائندہ ہے۔ اس رسالے نے اپنے مندرجات سے اور ترتیب و تہذیب میں حسن کی بنیادوں پر خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ الہ عام دلچسپی کا بڑا متنوع مواد پیش کر رہا ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ۔ پڑھنے والوں میں جو پذیرائی اس رسالے کی ہوئی ہے اس ے حوصلہ پا کر اس کے منتظمین نے ڈائجسٹ ایڈیشن بھی نکالنا شروع کیا ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں کاغذ کا معیار اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ تھ ہی ساتھ اندرونی صفحات کو مصور بھی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اب بھی کہیں کہیں تصاویر دی گئی ہیں۔ مگر ان کے خطوط میں کوئی کشش نہیں اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کسی اچھے آرٹسٹ مثلاً ریبزی یا نذیری کی خدمات حاصل نہ کی جائیں گی۔
دونوں ایڈیشنوں کا مجموعی سالانہ چندہ اٹھارہ روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے پیش نظر قابل قبول ہے۔ خریداری کیلئے اس پتہ پر لکھیے منیجر سیارہ اچھرہ لاہور

**دو کے کلاسیکی شعرا:** مرتبہ ایم حبیب خاں۔ میر سے اقبال تک اردو کے اساتذہ شعرا پر تنقیدی مضامین کا ایک انتخاب ہے۔ جس کے پہلے اور دوسرے حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اس انتخاب سے کلاسیکی شعرا کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ یہ امین مختلف مشہور و معروف نقادوں نے لکھے ہیں۔ اور پہلے مختلف رسائل و کتب میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ب ماہر اور ادیب کامل قسم کے طلبا کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ان کی درسی ضروریات کو بہت کچھ پورا کرتی ہے۔ نئی ل کے ذوق کی تعمیر کے لیے کلاسیکی ادب کا زیادہ سے زیادہ تعارف بنیادی کام ہے۔ ایم حبیب خاں نے یہ سلسلہ مرتب کر کے ایک مفید قدم ایا ہے۔ کتاب کی قیمت سوا تین روپے اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو شمشاد بلڈنگ علی گڑھ۔

**یوان حافظ مترجم و محشی** نئی صدی میں ہندوستان جس تیزی سے فارسی سے بیگانہ ہوا ہے وہ حیرت انگیز تو نہیں لیکن افسوسناک ضرور ہے۔ فارسی زبان و ادب کے توسط سے ماضی میں ہندوستان نے زندگی سنوارنے اور نکھارنے کا بہت کچھ سلیقہ پایا ہے۔ اخلاق و سیاست کے بارے میں جو زندگی کے دو اہم پہلو ہیں فارسی کے ادیب رشعرا جن اسرار و رموز سے آشنا کرتے ہیں وہ آلام و مصائب اور پریشانی افکار میں ہمیشہ تسکین اور طمانیت کے پیغام لائے ہیں۔
ان افکار و خیالات کے مبلغین کے کلام و پیام کو زیادہ سے زیادہ سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کرنا زندگی سنوارنے کے مترادف ہوگا۔
خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا حاجی سید سجاد حسین صاحب نے جو مدرسہ فتح پوری دہلی کے صدر مدرس ہیں اور فارسی و عربی ادب بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اپنی توجہ فارسی کے عظیم ادب کے اردو تراجم مع اصل فارسی پیش کرنا شروع کیے ہیں۔ گلستاں اور بوستان عدی کے بعد انہوں نے حال ہی میں دیوان حافظ شائع کیا ہے۔ ترجمہ سادہ سلیس اور پرکشش ہے۔ کتاب کی جلد بہت خوبصورت ہے۔ لن اچھے کاغذ اور اچھی طباعت کے باوجود حواشی اور بین السطور ترجمہ بالکل اسی ڈھنگ سے کتابت کرایا گیا ہے۔ جو پرانی فارسی کتابوں کا انا پیچا ناطرتہ ہے۔ ہم فاضل مترجم سے درخواست کرتے ہیں کہ آئندہ ایڈیشن میں جو یقیناً جلد شائع ہوگا اس کے حسن کتابت کی طرف صوصی توجہ صرف کی جائے۔ یہ کتاب غیر مجلد ۸ روپے میں اور مجلد ۱۰ روپے میں سب رنگ کتاب گھر گلی قاسم جان دہلی سے مل سکتی ہے۔

GD. NO. A—466 42ND YEAR OF PUBLICATIO
GAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P, OCTOBER 196
GISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57